

اسلام کے بنیادی عقائد

پہلا حصہ

مؤلف

خجۃ الاسلام مجید پٹنی موسوی لاری

ترجم

خجۃ الاسلام مولانا روشن علی

- نام کتاب : ————— اسلام کے بنیادی عقائد
مصنف : ————— حمزہ الاسلام سید مجتبیٰ موسوی لاری
ترجمہ : ————— حمزہ الاسلام مولانا مدد حسن علی
خطاطی : ————— سید علی حسین رضوی کشمیری
ناشر : ————— دفتر گسترش فرهنگ اسلامی
تعداد : ————— ۳۰۰۰ (تین ہزار)
ماربچہ : ————— شوال ۱۴۰۸ھ
مجاہد : ————— اول

فہرست

۵	• مرقہ منہم
۷	• بحث معرفت خدا
۹	• خدا کی معرفت
۱۸	• وجود کی گہرائیوں سے خدا کے جستجو کی آواز۔
۳۱	• خدا اور تجرباتی علوم کی منطق۔
۴۱	• وجودِ نادیدہ کا عقیدہ صرف خدا ہی میں منحصر نہیں ہے۔
۴۹	• اصل حقیقت۔
۵۴	• اصالت نیروی حیات۔
۵۸	• فطرت میں خدا کے جلوسے۔
۶۳	• بارہ قوانین وجود۔
۶۵	• دو طرفہ توازن۔
۶۸	• حکمِ طب کا کارنامہ۔
۷۰	• طبیعت کی ظرافت کا ریاں۔
۷۴	• موجود مطلق کا تصور۔
۷۷	• خدا غفلت سے بے نیاز ہے۔

۸۱	• ہر موجود محتاج علت ہے۔
۸۳	• سلسلہ عقل کو تتبع۔
۸۶	• عالم حادث ہے۔
۹۱	• انسان کی بے نیسی اور محدودیت۔
۹۳	• علمی دھوکہ بازی۔
۱۰۰	• بے دینی کے اسباب۔
۱۱۳	• خدا کے صفات اور خصائص۔
۱۲۲	• ایٹمیں خدا کے شرائط۔
۱۲۸	• دعا شکرین کی بہترین علامت ہے۔
۱۳۲	• صفات خدا قابل قیاس نہیں ہیں۔
۱۳۸	• خدا کی یحسانی۔
۱۴۷	• خدا کی غیر محدود قدرت۔
۱۵۶	• علم خدا۔
۱۶۳	• مباحثہ عدل؛
۱۶۳	• نظریات دوبارہ عدل۔
۱۶۳	• عالم پر شر و فساد کی چکرائی کیوں؟
۱۸۰	• معائبِ ظل بیداری و حرکت ہیں۔
۱۸۸	• نابرابری۔
۱۹۷	• مسئلہ جبر و اختیار؛
۱۹۹	• اہل موضوع پر ایک نظر۔
۲۰۱	• جبر کے قائل حضرات۔
۲۱۶	• قائلین اختیار۔
۲۲۳	• درسیاتی بات۔
۲۲۸	• مسئلہ قضا و قدر؛
۲۳۵	• ذہبِ اعدائے
۲۳۶	• قضا و قدر۔
۲۴۷	• قضا و قدر کی ناقص تفسیر۔

عرض مترجم

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين وآلاف النعمت والاکرام علی سید المرسلین وآلہ العصیہ
واللعنة الدائمة علی اعدائهم اجمعین۔

احیاء بعد۔ کتاب اسلامی اصول فقائد اس دور کی بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی
یہ ہے کہ مصوٰفہ کے پڑھے لکھے نوجوان ذہن کو بہت زیادہ پس کرتی ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے قدیم اور مغربی
مفکرین کے فقائد و نظریات پیش کر کے اسلامی اصول کو سمجھا گیا ہے۔ مادہ پرستوں کے سمات سے توجیہ
قرآن و احادیث سے عدل پروردگار کے اثبات پر اتفاذ کرتے ہوئے موجودہ دور کے ایجادات سے بھی اثبات
مطلب کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں صرف توحید، عدل، قضا و قدر، جبر و اختیار سے بحث ایک نو لکھے انداز سے کی گئی ہے
اہمیت کا احساس تو مطالعہ کے بعد ہی ہوگا۔

مجھاس کا اعتراف ہے کہ ترجمہ میں بعض مقامات پر شکل الفاظ کا استدال ہو گیا ہے۔ کچھ توفیر نصیاری
طور پر مگر بعض مقامات پر مجبوراً ایسا ہوا ہے۔ آخر اصطلاحی الفاظ کا ترجمہ کیا جائیگا؟ اور اگر آپ زبردستی کریں گی
تو آپ کا معنی اور بین الفہمیں کی عبارت اس مفہوم کو ہرگز نہ سمجھا پائے گی جو صرف ایک اصطلاحی لفظ سمجھا
دیتی۔ مگر میں پھر بھی معذرت خواہ ہوں کیونکہ اس سے زیادہ آسان زبان میں میرے دائرہ امکان سے شاید باہر
کی بات ہو۔

یہ کتاب عربی، فارسی، انگریزی زبان میں شائع ہو چکی ہے اب یہ اردو زبان میں شائع ہونے
جلد ہی ہے۔

اس کتاب کا ایک دوسرا حصہ بھی ہے۔ جو تقریباً قریب اختتام ہے۔ اس کے بعد اس کو ترجمہ میں وہ

بھی بے مثال ہے۔

جبراً اس کا واسطہ نہیں آتا ہی سہی، مگر جو سوئی لاری و فیلڈ لائی تحسین ہیں کہ ان مشکل مسائل کو انھوں نے آسان کیا، بہت ہی آسان طریقہ سے پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے معنف کی ایک اور کتاب "بھائی محمدن غریب" کا ترجمہ مغربی تمدن کی ایک جھلک کے عنوان سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں۔ آخر میں صرف آٹا عرض کروں گا کہ فعلی، ہونی بیان خیر انسان میں خاص ہے اس سے صرف ملہنا عصمت ہی محفوظ ہے۔ لہذا جو غلطیاں میں ان سے حقیقت کو مطلع کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کا تدارک کیا جاسکے۔

پروردگار بچانے اس ناچیز ترجمہ کو معفرت دینی عسکر کے غنیمت سے تیری بارگاہ میں پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں۔ خداوند غنی محمد و آل محمد میری اس تضرع کو بخشش کو قبول فرما کر میری اور میرے والدین کی معفرت فرما۔

والسلام
روشن علی

بحث مفتی رضا

خدا کی معرفت

اصولی اور فکری بحثوں کے سلسلہ میں انسانی زندگی کے لئے اویان کے مباحث کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور پیشہ پر مباحث محل فکر و نظر رہے ہیں اور ساسی مسئلہ کی طرح انسانیت کی سعادت سے وابستہ رہے ہیں اور یہ مباحث بے فائدہ بھی نہیں ہیں بلکہ وسیع و عمیق پیمانہ پر ان کے عملی و ثقافتی آثار رہے ہیں۔

دینداری کے اسباب و اسل کے سلسلہ میں علماء اور محققین کے وسیع مطالعات ہیں اور ہر شخص نے اپنے خصوصی ذراویہ فن سے تحقیق بھی کی ہے اور ایسے نتائج و احکام بھی حاصل کئے ہیں جو ان کے خصوصی فکر و نظر کے مناسب ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ علوم و صنعتوں کی طرح بشری عقائد بھی درجہ کمال کو پہنچے ہیں۔ قابل تہاریر کے قدیم ترین زمانہ میں بھی عقائد کا وجود تھا جو بشری حقیقت سے تعلق تھے۔ کسی بھی زمانہ میں ایسے بشری منبع کا وجود نہیں تھا جو عقیدہ سے خالی ہو۔

دینی افکار ایک دور سے دوسرے دور میں متغیر ہو کر منتقل ہوتے رہے ہیں۔ جس طرح فکری اور علمی اصول و لغات و وسائل حیات کی طرح مکمل طریقہ سے تبدیل ہو کر انتقال پذیر ہوتے رہے ہیں اسی کے ضمن میں دینی فکر بھی بدلتی رہی ہے اور وہ اپنی پہلی صورت پر باقی نہیں رہ سکی ہے۔

انسانی زندگی کے تصورات اور اس کے علوم و معارف کے نکال کی کیفیت کے بارے میں بحث و تحقیق اور آفاق تاریخی کی گہرائیوں کا مطالعہ ہم کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ قطعی استدلال کی معرفت سے پہلے بھی ان کی کسی نہ کسی عقیدہ کا پابند تھا۔ اس بنا پر یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ بشری علوم و صنائع کا پہلا دور انسانی عقائد و ادیان کے پہلے دور سے زیادہ برتر و کامل تر نہیں تھا بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایمان

و عقیدہ کی بحث میں انسان نے جو کوششیں کی ہیں وہ علوم و صنائع کے سلسلہ میں کی گئی معاشی سے کہیں زیادہ سخت و طویل رہی ہیں۔ کیونکہ اس بلند حقیقت کی معرفت جو عالم هستی کی حقیقت ہے۔ تمام اشیاء کی حقیقت کا انحصار ہے۔ جس کے پہنچنے کے لیے علوم و صنائع متواتر رواں و دو رواں ہیں۔ — سے کہیں زیادہ سخت و طویل تر ہے۔

لوگوں کے لئے ایک زمانہ میں بزرگ ترین حقانی کا بطور کامل شناخت ہو چکا ہے۔ بلکہ معلومات کا پیشرفت کے ساتھ ہی انکار و تردید کی ان کی شناخت و معرفت کے لئے مروجہ زمانہ کے ساتھ ساتھ آگاہی پیدا کرتے ہیں۔

چمکتا ہوا سورج تمام چیزوں میں روشنی تراود واضح تر ہے لیکن۔ اس کے باوجود۔ مدیوں نکلنے کی حقیقت چھوڑ رہا ہے۔ سورج کے حرکات و آثر کی مختلف تفسیر کی جاتی تھیں حالانکہ اس کی اصل ہستی اور فوٹو شعاع کسی کے لئے بھی قابل انکار نہیں تھی۔ لیکن اس کے بعد بھی لوگوں کے افکار اس سلسلہ میں شدید گہری تاریکی میں تھے۔ لہذا معلوم ہوا کہ حقیقت کبریٰ کا درک سوائے حلقی استدلال اور گہرے مطالعہ کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی لئے

سابقہ امتوں میں ضعفِ نظر اور محدود دانش و فکر کی وجہ سے مہذبانہ مخصوص قلاب میں جو خرافات اور دینی افسانے ڈھالے جاتے تھے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دینی اور اس کے مضمویات حقیقت سے ہماری ہیں۔ بلکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی جان و دل میں دین کی جڑیں مضبوطی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ہر وہاں مشہور فلسفی کہتے ہیں: طبیعت انسانی کی بزرگ ترین بلوہ غشی غی دین ہے۔ اور اگر مسلم رجعتِ قہقری کر کے، تیس تاریخ میں دنیا حقیقت کو ہم پر واضح کرنا چاہے تو ہم کو اس سے زیادہ کی توقع نہیں رکھنا چاہئے کہ جو نتیجہ اولین مسابقہ ہمارے سامنے آئے گا وہ ان خرافات و افسانوں کا مجموعہ ہوگا جو باقی ماندہ آثارِ قدیمہ اور طبقاتِ ارض کی گہرائیوں میں ہوگا۔

کیونکہ اس زمانہ کا انسان اگر بہت سے فطرت کے جبرٹ انگیز و خود بصورت نظام کو دیکھتا تھا جو بہت ہی پاک
یعنی اور دقیق ترین حساب کے ساتھ جاری و ساری تھا اور دوسری طرف اس کو کبھی یہ اتفاق نہیں ہوا تھا
کہ وہ اس حیات میں سے کوئی چیز دفعہ پیدا ہو گئی ہو۔ لیکن اس حسن طبیعت کے مطالعہ کے باوجود انسان اللہ
و فکر کی دست گاہ، رشد و مہدی کے اس سرحد تک نہیں پہنچا تھا کہ جہاں پر وہ نظام عالم اور اس طبیعت

اور اس کے مختلف ظواہر کے درمیان ارتباط کامل کی وحدت کا ادراک کر سکتا اور یہ سمجھ لیتا کہ تمام نظام ہستی ایک ہیے
مہذبہ و دانا و توانا کے زیرِ ارادہ و اختیار ہے جو انسان یا دیگر موجودات سے کسی بھی قسم کی شائبہ نہیں رکھتا، اور چونکہ
گوشتاگوشت موجودات کی پیدائش کو وہ منطقی بنیادوں پر سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے اس کا خیال یہ تھا کہ ہر مخلوق
کے لئے ایک مستقل علت ہے۔ لہذا وہ تعدد موجودات کو دیکھ کر تعدد حاسنی کا قائل ہو گیا۔ اور آخر کار
مقدس کشش اور انسانی عالی تہاں و بلند و اصل روحانیت اصل راستے سے منحرف ہو گئی اور عدلئے تحقیق کے بجائے
بحسوت خداؤں کی طرف مائل ہو گئی اور ان کو پوجنے لگی اور احترام کیونے لگی اور نفس انسانی اور اس کے ارد گرد موجود
پر قیاس کر کے بحسوت خداؤں کے لئے صفات معین کر کے اپنے وجدان کو سکون بخشنے کا ذریعہ بنایا۔

اور جب انسان کی رفتار و حرکات و دعائیتوں سے متصف ہو ۱، حیات و ثبوت ۲، نوع انسانی کے نام
افراد میں موصوم و محمول تو یہ بات بالکل منطقی اور فطری ہے کہ انسانی روح کی گہز یوں میں اس کے رنگ و ریشہ کا اعتبار
کر لیا۔

تمام اقدار تاریخی میں حتیٰ قبل از تاریخ میں بھی عقیدہ انسانی کے وجود کو محض رسوم و عادات و تقلید دگر ہو رہا
نہیں کیا جاسکتا جو مستمر صورت میں ہمیشہ سے موجود ہے بلکہ یہ ایک فطری تشنگی اور ضروری احساس اور حقیقت کی گہز
کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے پس یہ تمام مذہبی اعتقادات اپنے گونا گونا گوں اسکاں کے ساتھ ایک پر جوش و سرشار
منبع سے کب فیض کرتے ہیں جو نہ تحلیل ہے نہ تصادفی۔

ابتدا ہی سے انسانی نہاد و طبیعت میں عقیدہ کی قبولیت و استعداد کی صلاحیت، رابطہ اور اس ذاتی
استعداد کی بنیاد پر عقیدہ فطری پذیر ہو رہا ہے اور یہی تشنگی و دہنی جو حقیقت وجود کے ادراک کے لئے انسان کو
فکری تحقیق پر آمادہ کرتا ہے۔ معرفت دینی کی ضرورت پر وکیل قاطع ہے۔ لیکن اس ذاتی استعداد کا لازم
نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ جس عقیدہ کو اس نے مان لیا ہے وہ صد صد صحیح ہے۔ اس کو یوں مان لیا کہ انسان
بدن میں احتیاج غذا موجود ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اسکو جو غذا ملے وہ شریک اور صد صد صحیح ہو اسی طرح
انسانی روح بھی روحانی غذا - ایمان و عقیدہ - کی محتاج ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو غذا اس کو ملے وہ
صد صد صحیح ہو۔ کیونکہ ذاتی غذا پر یہ صحیح و فاسد غذائیں میسر نہیں کر سکتی۔

محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بیشتر دینی عقائد بشری زندگی میں مخلوط رہے ہیں، لیکن مولانا آزاد وہ سبھی عوامل جو پیش کے بنیاد گذاری میں کارفرما تھے اس میں ان کے نظریات مختلف ہیں اور ان محققین کے زیادہ تر فیصلے خرافاتی ادیبان اور ناپختہ افکار کے مطالعہ پر مبنی ہیں اس لئے بہت ہی واضح سی بات ہے کہ آخری تحلیل دین میں ان کے فیصلے ناقص و غیر منطقی ہوں گے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بہت سے ادیان مبعدہ وحشی مرتعہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے نگہباز دہشت میں اپنے ماحول کے زیر اثر رہے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ تمام ادیان بطور کلی مادی و اقتصادی یا طبعی و خشتناک عوامل کے خوف یا جہالت کی پیداوار ہیں۔ بے شک دین کے خلاف جو افکار پیدا ہوئے ہیں یا سکرین خدا کا جو وجود ہے اس کا سبب کچھ مذہبی لوگوں کی فکری انحرافات تباہی و فساد کاری ہے لہذا مذہب کے خصوصیات کو بھی خاکسار نہ بحث لایا جائے اور وقت نظر سے مطالعہ کیا جائے۔

بہت سے تاریخی حوادث میں آپ مذہب کو مجوزائیں پر جام دیکھیں گے اب اگر مذہب کی کوئی بنیاد نہ ہوتی تو عیسائے مادی دائرہ ہی میں محدود رہتا۔ آخر یہ کون سا عامل ہے جس نے مذہبی شخصیتوں کو اپنے دینی مقاصد کے لئے اتنا مضبوط و باڈا بنا دیا؟ کیا مادی مافیہ کی توقع اور خصوصی مقاصد نے معائب و مشکات کی جاکاھ غلیوں کو ان کے لئے خوشگوار بنا دیا تھا؟ جی نہیں مگر نہیں اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ اپنی تمام مادی و دنیاوی اسکانات کو اپنی شخصی خواہشات کو مقاصد دینی کے لئے اس بیدار وحی سے قربان کر دیتے بلکہ انہوں نے تو اس راہ میں جان دیدی ہے۔

اس لئے یہ ناممکن بات ہے کہ محض مادی چیزوں کے لئے انسان دین کی طرف میلان رکھتا ہے بلکہ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ انسان کے باطن میں اصلی مذہبی حس موجود ہے۔ لیونگٹ ڈوٹن کہتا ہے: بیشہ دنیا میں عبادت کا کوئی کسے درج مذہب و میلان، عقیدہ و میلان پرستش و میلان فرشتہ اور کمال مطلق سے نزدیک ہے۔ جو قابل تصور اور قابل وصول نہیں ہے۔ کا وجود تھا اور اس ارادہ کے لئے مبداء الہی تھا جو تمام لوگوں میں برابر موجود ہے۔

مشہور دانشمند دیش قیودانت لکھتا ہے: ایمان فطری چیز ہے۔ یہ ڈائریکٹ احساسات و طبعی اعتبار کا سرمایہ ہے اور حفظ نفس، مگر سستی، امان، اطاعت و انقیاد سے زیادہ قوی ہے۔

اور یہی بات کہ مذہب میں غیر منطقی عقاید کا وجود ہے تو یہ بات مذہب میں مسائل ہی کہنے مخصوص نہیں ہے بلکہ بہت سے علوم و معانی پر شک سے پہلے خرافات سے مخلوط تھے کیونکہ انسان علم طب حقیقی اور فیک کی طرف جادو اور شعبہ بازی ہی سے بہرہ پہنچا ہے اور عقلی کیا کام اس کی رسانی غیر عقلی کے ذریعہ ہوئی ہے۔ بس یہی فرق غیر منطقی مسائل کی ترویج و تحقیق کے بعد مجمع عقائد تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اور یہ تو کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ اگر انسانی نفسی چیز کا انداز میں ایک مرتبہ منطقی کرنی تو پھر کبھی حقیقت تک پہنچ سکتا۔

خدا بنے مگر خدا ہی مسئلہ پر بھروسہ کر کے توجہ لگاتے ہیں کہ خدا تو افکار انسانی کی پیداوار ہے۔ مثلاً برنارڈس (Bernard Russell) اگر نری دانش کا کہنا ہے کہ عوامل طبیعی کے خوف سے مذہب نام کی چیز پیدا ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو وہ کہتا ہے: "میری نظریہ مذہب ہر چیز سے پہلے بنیادی طور پر ترس و خوف کی بنیاد پر استوار ہوا ہے۔ ایک ایسا خوف ہے جس کی بنا پر لوگ شے کے غائب ہونے ہیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ اس سے پہلے کہ چوک چول کا کسی خوف کی وجہ سے انسان میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ شکست میں لڑائی جھگڑے میں اس کا کوئی ہارست پناہ ہونا چاہئے۔ اب یہ خوف مختلف ہوتا ہے۔ موت کا خوف، شکست کا خوف، راز کے غائب ہونے کا خوف الخ

اگرچہ یہ بات محض شاعرانہ تخیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ یہ تو محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اس کے اثبات پر کوئی دلیل قائم نہیں کی گئی ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سیمول کیلنگ کہتا ہے: "مذہب کا منبع سبب میں ایک مسئلہ ہے اور علماء کے نظریات اس مسئلہ میں اتنا اختلاف ہے جس سے منطق سے قریب تر ہیں اور بعض منطق ہیں۔ لیکن جو نظریہ سب سے زیادہ منطقی ہے وہ بھی محل آسکا ہے۔ بس منطق تصور کے اندر ہے۔ اسی لئے علماء اجتماع منبع مذہب کے سلسلہ میں شدید اختلاف نظر رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس

کے جواب میں کہا جاسکتا ہے، اگر ہم فرض کریں کہ عقیدہ خالص میں سب سے اصلی، اہم اور اصلی چیز ایک انجمن، خوف ہے تو کیا اس سے یہ بھی ثابت ہو جائیگا کہ خدا محض ایک وحشی و خیالی چیز ہے اس کا کوئی واقعی وجود نہیں ہے؟ اگر خوف ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے رہائی کے لئے انسان ایک پناہ گاہ تلاش کرتا ہے اور اسی جستجو میں وہ حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے تو کیا ایسے کوئی اعتراض ہے؟ کوئی حرج ہے؟ اگر خوف ہی کبھی چیز تک رسائی کا ذریعہ ہوتا کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ حالت جس کو انسان نے خوف کی وجہ سے حاصل کیا ہے لہذا اسوہم و غیر واقعی ہے؟ بعد کیا یہ بات منطقی ہے کہ ہم کہنے لگیں علم طب کوئی واقعی علم نہیں ہے کیونکہ بیماری و مرگ کے خوف سے انسان ہی پناہ گاہ کو تلاش کیا ہے لہذا یہ وحشی چیز ہے؛ ویسے حقیقت یہی ہے کہ علم طب ایک واقعی چیز ہے چاہے اس تک پہنچنے کا ذریعہ عقلت بیماری و مرگ کا خوف ہو یا کوئی دوسری علت ہو۔

تمام حوادث و واقعات میں ایک دانا تو ناخدا پر ایمان ایک پناہ گاہ اور حقیقی ٹیکہ گاہ ہے اور اپنی ہرگز پرہیز خود ایکے شدہ ہے۔ اس مسئلہ کا اس سے کوئی ربط نہیں ہے کہ رافع اصلی انسان میں خدا پر ایمان لانے کے لئے حوادث کا خوف ہے ان دونوں مسئلوں کو الگ الگ دیکھنا چاہئے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ بشر اپنی ابتدائی زندگی میں فطرت کے مشتاک حادثات — مثلاً طوفان، زلزلے، بیماریوں — سے دوچار ہوتا رہا اور کابوس خوف اس کے تمام زندگی و افکار پر اپنا منہس سایہ ڈالے ہوئے تھا اور اس مرحلہ میں انسان خوف و عاجزی کے باوجود اپنے جمہوریت شافق کے ذریعہ ایک ایسی پناہ گاہ کا جو پاس رہا جس میں ایسے خوفناک حوادث سے پناہ حاصل کر کے جس سے سکون و روح حاصل ہو سکتا ہو کاروان اپنی سعی پیہم اور دائمی جستجو کے نتیجے میں کابوس ذلت و خوف پر غالب آگیا اور قابل رشک کامیابی تک پہنچ گیا۔

قدیم انسانوں کی زندگی میں بحث و فحش کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانی افکار پر خوف غالب تھا مگر اس غلبہ خوف کا موجود ہونا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ خوف و جمہوریت ہی تعبد بالہین کے کلی سبب ہیں کیونکہ ایسا طرز فکر تنگ نظری کا نتیجہ ہے کیونکہ اگر تمام گونا گوں احوال بشر کی تاریخ زندگی پر قاعدہ مطالعہ و تحقیق و ریسرچ کے بعد یہ کلی نتیجہ اخذ کیا جائے تب تو ایک بات ہے لیکن اگر انسانی

تاریخ کے حسین نشیب و فراز کے صرف ایک گوشہ پر تحقیق کر کے یہ نتیجہ نکالنا جائز تو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔
 اودار محدودہ مینے میں تمام مشنوں انسان پر مسلط خوف کو بنیاد بنا کر تمام اودار بشر پر ایک حکم کی لگاؤ
 غیر منطقی بات ہے اور کیا انسان کے انکار و اعصا مات دینی اور تمام نافرمانیوں۔ حتیٰ عصر حاضر میں —
 عبادت خدا کی طرف توجہ کو قطعی حجت کے خوف و ہراس و جنگ بھاری کا نتیجہ قرار دینا جلد بازی نہیں ہے؟
 نیز یہ بھی غلط ہے کہ ہر دین کا بھاری لوگوں میں کمزور ترین نہیں ہوتا ہے! نہیں ایسا نہیں ہے صفات
 تاریخ میں آج بھی موجود ہے کہ جن لوگوں نے دین کا پرچم بلند کیا ہے وہ سب زیادہ قوی اور مضبوط انھیں
 تھے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کیا ایمان جتنا قوی ہوتا جائیگا انسان اتنا ہی کمزور ہوتا جائیگا اور دین پر سب کے زیادہ
 ذلیل و کمزور ہوگا۔

کیا ہزاروں علماء و مفکرین جو دین کے پیرو ہیں وہ زلزلے، سیلابوں، امراض کے خوف کی وجہ
 سے مذہب کے پابند ہوئے ہیں؟ یا یہ لوگ علمی تحقیق و منطقی استدلال و عقلی برہان کی بنا پر پابند مذہب ہوئے
 ہیں؟ کیا ان کی پابندی مذہب کو حوادث طبع کی علتوں سے جہالت و عدم اطلاع پر مبنی کہا جا سکتا ہے؟ بھلا
 صاحبان عقل کیا فیصلہ کریں گے؟

انسان سکون و اطمینان کے لئے مذہب کو نہیں قبول کرتا بلکہ اعتقاد و ایمان بالذات کے بعد مذہب
 کے فوائد میں سے یہ بات ہے کہ اس کو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے۔ اپنی علماء کا عقیدہ ہے، علم
 و معلومات، اسباب و سببات۔ جن کا بہت باریک بینی سے حساب کیا گیا ہے۔ کے مجموعہ کا نام
 عام ہے اور کائنات کا دقیق نظام مبدع علم و قدرت کے وجود پر شاہد و دلیل ہے۔ کسی چوکھٹے میں
 مختلف غیر متبصر و غیر مفہوم نقوش کا ہونا کسی ماہر و فنکار تصور کے وجود پر کبھی دلیل نہیں بنا کرتا۔
 بلکہ ایسی نقاشی جو دقیق حساب پر مبنی ہو اور معانی و ملاح مفہوم پر مشتمل ہو اس کو ایک ماہر فنکار
 تصور کے وجود کی دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

ایک دوسرے لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں جو لوگ مابعد الطبیعات کے عقیدہ کو اقتصاد و معیہ
 اوضاع کی پیدائش بناتے ہیں اور دین و اقتصاد میں ربط پیدا کرنے کیلئے جان توڑ کوشش کرتے ہیں

وہی لوگ کہتے ہیں: مذہب تو ہمیشہ سے استعارہ و استعارہ کا خادم تھا اور کچ بھی ہے۔ اور مگر ان حضرات نے دین کو ایسا دیکھ لیا ہے تاکہ دین کی آڑ میں لوگوں کو ہمیشہ اپنا غلام بنائے رکھیں۔ اور اسی کے سہارے عوام کی ہر بقاوت کو پسپا کر دیں اور ان کی محنتوں کا ثمرہ خواص حاصل کریں اور عقیدہ کا سہارا ایسا کران کی محرومیت پر ان کو فائدہ کر دیں۔ ویسے اس میں بھی شک نہیں ہے کہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح مذہب بھی غلط فائدہ اٹھا گیا اور جب بھی دین کو اس کے اصلی مقصد سے الگ کر کے غلط طریقہ سے استعمال کیا گیا تو فتنے جو تاجروں کا تھیاریا بن گیا اور انہوں نے شعوب و قبائل کو قید ہی بنانا چاہا۔ لیکن اس قسم کے غلط استعمال کو فرصت طلبوں کے لئے دلیل و محبت ذہنا دینا چاہئے تاکہ وہ دین و مذہب کے نام پر ہر چیز پر بے رحم حملہ کریں۔ بہر حال غلامہ مطلب یہ ہے کہ مذہب منحرف شدہ اور استعماری خود ساختہ مذہب کو اصلی دین و مذہب سے الگ رکھنا چاہئے۔

لیکن ہے کہ بہت سے انسانی معاشرہ میں مذہب و ایمان کے ساتھ نامساعد اقتصادی حالات و تناظر وجود ہو چکے ہیں۔ چھڑائی دونوں کے درمیان ہلکا علیت نہیں ہے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ مذہب و ایمان کی ہڈی سے یہ نامساعد اقتصادی حالات اور تاخیر وجود پیدا ہوئے۔ کیونکہ بہت سے ایسے بھی انسانی معاشرے ہیں جہاں ہر سہولت آرام و راحت رفاه و رونق زندگی اور اقتصادی وضع بھی بہت اچھی ہے اور وہ معاشرہ مذہب و ایمان سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور اسی طرح بہت سے انسانی معاشرے بنیا و تمام ہوں اور بہترین اقتصادی کے باوجود مذہب سے روگردان ہیں۔ اسی طرح بہت سے ایسے مقامات ہیں جو فقر و تاخیر میں مبتلا ہیں اور دین کا آفتاب وہاں ڈوبا ہوا ہے اور عین ایسی ہی صورت حال میں بعض ایسے مقامات ہیں جو فقر و تاخیر میں مبتلا ہیں لیکن دین کا آفتاب وہاں دائرہ نصف النہار پر چمک رہا ہے۔ پس یہ بات سمجھنی چاہیے کہ مذہب پرست اقتصادی لحاظ سے اچھے اور کمزور ہیں۔ وہیں تین باتیں ہیں کہ تقارن زمانی علاقہ وقت و معلول کے تشکیک کے ناکافی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک مخصوص وجہ اور بھی ہوتی چاہئے جس سے تہ چلے کہ ایک کا عدم وجود دوسرے کے عدم وجود کو متنبہ ہے اسی قسم کے عدم انسجام و ناہم آہنگی کو ہم ایسے دو معاشرہ دلائل یا قاعدہ ملاحظہ کر سکتے ہیں جو استعمار گردی کے تحت تسلط ہوئی کہ ایک محیط میں دین اصل زندگی سے خارج ہے اور دوسرے محیط میں اصل زندگی داخل ہے حالانکہ دونوں معاشرے مساوی و برابر ہیں۔

میں پھر عرض کرتا ہوں: دین و مذہب کے وابستگی مادی وسائل کے فقدان کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ مذہب سے دوری کا سبب وہ پرستی اور تجلات دنیا کی ولہ اوگی ہے جو لوگ خواہشات کے بندے اور دنیا پرست ہیں وہی لوگ مذہب کے دور اور متغیر ہیں۔

واقعات ہم کو اس نتیجہ تک پہنچاتے ہیں کہ انسان بخلاف اوضاع و احوال میں دین کی طرف متوجہ ہوا ہے لہذا ہم کو ان اسباب عمل کی تلاش کرنی چاہئے جو گرویدگی مذہب کیلئے اصلی و روحی و ذاتی ہوں نہ کہ وضع اقتصادی کے پیکو میں پڑیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم آسانی مذاہب کے تعلق کو تلاش کریں تو اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہیں گے کہ حضرت نبیاء کا ایک سبب اور لوگوں کی مذہب سے گرویدگی کی وجہ عدالت اقتصادی تھی اور دین کے من جملہ فوائد میں سے ایک ہی فائدہ ہے کہ انسان اقتصادی عدالت کو پالتا ہے۔

وجود کی گہرائیوں سے خدا کے جستجو کی آواز

پچھلے دور میں انسانی وجود کے مادہ انسان کے کچھ وسیع ابعاد ہیں جو محدودیت بدن کے ساتھ محدود نہیں ہیں اور ان ابعاد جو عمارت بدن سے خارج ہیں۔ کے گوشوں کی معرفت کے لئے روحانی بنیادوں اور دروازوں کے راستے تلاش و جستجو کرنی چاہئے تاکہ فیزیکل نفس طے کے مادہ خواہر طبیعت و عواطف انسانیت کے وسیع آفاق تک پہنچائی جاسکے۔

انسانی وجود میں ایک مخصوص اور کات کاسلہ ہے جس کی جڑیں ذاتی ہیں اور وہ اور اک غیر فطرت و طبیعت ہے نشوونما پاتا ہے اور اس قسم کے مصلوہ کی پیدائش کیلئے کوئی خارجی عامل موثر نہیں ہے۔ انسان حسی علی حیا اور اس کے ساتھ میں داخل ہونے پہلے اپنے اسی فطری مصلوہات کی بنیاد پر محتاج کا اور اک کر سکتا ہے لیکن علی و نفسی مصلوہات میں داخل ہونے کے بعد اس کے دفاع میں مختلف دلائل و براہین کے اکٹھا ہونے کے بعد بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی ان فطری و طبیعت مصلوہات کو بھول جائے یا تنگ تر و دو میں مبتلا ہو جائے اور یہی وجہ کہ انسان جب تشخیص مفیدہ میں فطرت سے الگ ہو کر کام کرتا ہے تو وہیں سے اختلافات کا آغاز ہوتا ہے۔

مذہب و وابستگی اور خدا پر ایمان پہلے مرحلہ میں فطری اور کات کا نتیجہ ہوتا ہے پھر عقل و فکر کے در سے منزل رشد و تکامل تک پہنچتا ہے۔ انسانی طبیعت میں فطری احساسات کی جڑیں اتنی گہری ہیں اور اس گہرائی کے باوجود اتنی روشنی ہیں کہ اگر انسان اپنی فکر و روح کو ہر قسم کے مذہبی تصورات اور مخالف دین انکار سے دھوڑے اور اپنی ذات و جہان ہستی کی طرف متوجہ ہو تو بخوبی اس بات کو محسوس کرے گا کہ کائنات کا قاعدہ ہمیشہ سے ایک عین ہدف کی طرف رواں دواں ہے اور اپنے ارادہ و خواہش کے بغیر نقطہ زندگی کا آغاز کیا ہے اور پھر اپنے ارادہ کے بغیر ایک نقطہ۔ اگرچہ اس کے لئے وہ نقطہ مجبور ہے

— کیفیت و محرکت ہے اور اس واقعیت کے وجود کو قدرت کے تمام موجودات میں ایک نظم اسلوب اللہ تربت نظم کے ساتھ شامہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک مدشن فکر انسان جب اپنے گرد پیش کے ماحول کو دیکھتا ہے تو اس کو اچھی طرح یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک عظیم قدرت ہے جو اس کو اور تمام عالم کو محیط ہے جب وہ علم و قدرت و ارادہ کو اپنی ایسی ذات میں دیکھتا ہے جو اس عالم گیر کا ایک بہت ہی چھوٹا سا جزو ہے تو یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کائنات کے اندر علم و قدرت و ارادہ کا فرمانہ ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہی موجودہ نظام اور بنی بروقت مابانی حرکت انسان کو اس بات کے ملنے پر مجبور کرتی ہے کہ اس نظام کائنات کا ایک مدبر و حکیم ہے جو اپنے حکم سے اس کے موجودہ نظام کو چلا رہا ہے کیونکہ اس موجودہ نظام کی تعمیر کردہ مدبر و حکیم کے وجود کے علاوہ کسی نہیں جاسکتی جو شخص بھی سنجیدگی کے ساتھ اپنی موقعیت کا اس دنیا میں اور ک کرے گا وہ اس بات کو سمجھ جائیگا کہ اس کائنات میں ایک ایسی معنوی قوت ہے جو اس کو پیدا کرتی ہے، معدوم سے وجود میں لاتی ہے اور پھر اس کی اجازت یا حکمت کے بغیر اس کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

یہ محکمہ فطری ہے کیونکہ کسی بشر نے کسی زمان یا مکان میں یہ نہیں دیکھا کہ صانع کے بغیر کوئی مصنوع ہو جائے یا حامل کے بغیر مصل کا وجود ہو جائے۔ علت و معلول کے باہم ربط کی جستجو ایک ماضی خواہش کا نتیجہ ہے۔ اور قانون علیت کو کسی سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے لہذا جس مذہبی و جستجوئے خاقی بھی انسان نے قابلِ جدائی ہے۔ اختہا یہ ہے کہ ابھی جس بچہ نے دنیا نہیں دیکھی ہے اگر اس کے کان میں کوئی آواز نہ ہو نیچے یا حرکت کا شامہ کرے تو خود فطری طور پر شیخ آواز و منشا و حرکت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

عملی زندگی کی بنیاد اور عملی مابانی بھی ہر معلول کے لئے علت کو لازمی قرار دیتے ہیں بلکہ قانون علیت ایک ایسا معمولی قانون ہے جو ایک مورد پر بھی استثناء بردار نہیں ہے۔ تمام علوم خواہ وہ علم طبقات الارض یا فیزیا یا کیمیا ہو یا علم اجتماع و اقتصاد ہو ان سب میں علیت و معلولیت کا قانون نافذ ہے۔ اور اس سے بڑھتا ہے کہ تمام علوم و دانش عوامل و مصل کے کشف کا ذریعہ ہیں اور دنیا ہی سے تمام بشری و بشریت و ترقیاں علماء کے تلاش مصل کا نتیجہ ہیں۔

اگر اس دنیا کے کسی گوش میں کسی بھی موجود کے اندر خود سازی مطلق و خلافت کا امکان ہوتا تو ہم کو یہ حق ہوتا کہ تمام موجودات میں وجود ذاتی کو قبول کر لیتے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ قانون حلیت نظام عادی کی صورت میں ہمارے لئے واضح و ظاہر ہو کیونکہ علت کی اتنی زیادہ قسمیں ہیں کہ تحقیق و بررسی کرنا صرف ایک ٹاڈ میں تمام مخلوق کی تشخیص نہیں کر سکتے۔ چہ جائیکہ تمام حوادث میں۔ اور یہ مسلم ہے کہ انسانی زندگی کے ماضی و استقبال میں کسی بھی کلمی یا جزئی صورت میں۔ خواہ وہ فرد کی حالت یا معاشرہ کی۔ کسی ایسے نقطہ کا بھی وجود نہیں ہے جو اتفاقاً پیدا ہو گیا ہو۔

جب تمام تجرباتی علوم کا فیصلہ ہے کہ خاص طبیعت میں سے کسی ایک عنصر کا وجود مستقل نہیں ہے۔ اور جب ہمارے تمام تجربات و احساسات و استنباطات بھی ایک ہی تجربہ پر ہونے لگے ہیں کہ طبیعت میں کوئی بھی سرغیر علت و وسیلہ کے واقع نہیں ہوا اور تمام حوادث کچھ مخصوص نظام و قوانین کے تابع ہیں تو پھر کیا یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ کچھ لوگ تمام علمی و فطری و عقلی احکام کو پس پشت ڈال کر خالق کائنات کے وجود کے منکر ہیں :

دوسرے طریقے سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہی غریبہ جوانی جو کامل و متحول ہوئی ہے اور جو محدودیت سے اس قدر باہر آگئی ہے کہ محسوسات کی دیواروں سے گزر کر مجبوبات کو درک کر رہی ہے اور انسانی ضمیر سے پیدا ہونے والے ہر حکم و مسئلہ۔ بشرطیکہ وہ ایک مخصوص ترتیبی و اعتقادی معاشرہ کے سسٹم سے متولد نہ ہوا ہو۔ کا جواب دیتی ہے وہ یہی فطرت ہے۔ اور اعمال و عمویت کے لحاظ سے اس فطرت میں اور دوسری انسانی فطرتوں۔ جیسے حب فات و حب وجود۔ — میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہذا یہی فطرت انسان کو وجود خالق کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن تربیت، ماحول و معاشرہ تمام کی چیزیں فطرت کے تقاضے کو پورا نہیں ہوتے دیکھیں۔ چنانچہ انٹراڈسکالریٹڈ برگ (۱۹۷۸ء)

OSCAR - L جو فز یا لوجی کا بہت بڑا مشہور عالم ہے کہتا ہے : علمی مطالعات میں بعض علماء جو جو خدا کا احساس نہیں کر پاتے اس کی بہت سی وجوہ ہیں ان میں سے ایک علت مستقل یا مابعدی و ماحول یا معاشرتی نظام یا دولت و حکومت کے تفتیشیات ہیں جو انسان کو وجود پروردگار کے انکار

پر آمادہ کرتے ہیں۔

مبداء فطرت سے نمودار ہونے والی چیز نظامِ حسی کی مانند خوبصورت ہے اور جو لوگ اپنی پیدائش کے سیر اصلی میں آزاد رہے ہیں، حادثوں کے زندان میں مقید نہیں رہے ہیں اور نہ ان کی فطرت نے لغات و اصطلاحات کا رنگ پکڑا ہے وہ خمیر کی آواز کو بہت بہتر طریقہ سے سن لیتے ہیں اور اعمال میں نیک و بد اور قصائد میں حق و باطل کی اچھی طرح تمیز کر لیتے ہیں وہی وجہ ہے کہ اس قسم کے افراد میں بدیہی اور فطرت سے انحراف بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی ان سے کہے کہ جہاں رنگ و بو اتفاق سے پیدا ہو گیا ہے۔ تو چاہے وہ اپنی بات کو خرابوں نفسی اصطلاحات کے قالب میں ڈھالے پھر بھی ان کی باتیں ایسے افراد پر اثر انداز نہیں ہوتیں کیونکہ انھوں نے اپنی فطرت کے سہارے تصادف کا کینات کے نظریہ کو رد کر دیا ہے۔

البتہ جو لوگ علمی خود ساختہ فہمی میں گرفتار ہیں وہ ان خوبصورت باتوں سے شک و تردید میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ محدود و غرور انگیز علوم ان رنگ و رنگ شیشوں کی طرح ہیں جو عقل و فطرت کے درپے کے سامنے لگا دیے گئے ہوں۔ اور یہ لوگ دنیا کو اپنے علوم و معارف و فنون کے رنگ میں دیکھتے ہیں اور یہ یقین کرتے ہیں کہ عقل و حواس اور محدود و دیچہ سے جو انھوں نے دیکھا ہے اس میں حقیقت وہی ہے اور اس کے ماوراء کچھ نہیں ہے۔ میری اس تحریک کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان نکال عقل سے باز رہ جائے تاکہ وہ انحراف سے دوچار نہ ہونے پائے بلکہ سیر مقصد صرف اتنا ہے کہ انسان اپنی محدود دانش و فن پر مغرور نہ ہو جائے۔ بہت سے لوگ علم و دانش کو پا پائے عقل کی سیڑھی بنا کر اپنے بالا سطح تک پہنچانے کے بغیر گرفتار نہ ہوجاتے ہیں اور اصطلاحات و مضبوطیات کی چار دیواری میں اپنے کو زندانی بنا کر رکھتے ہیں۔

جب انسان خطرے میں گھر رہتا ہے تو یہی فطرت اس کی مدد کے لئے بڑھتی ہے۔ جب کبھی انسان عقلی مشکلات اور خوفناک سختی میں گھرماتا ہے اور تمام مادی وسائل اس سے منور رہتے ہیں اور زندگی کے کسی امکان تک اسکی رہنمائی ناممکن ہوجاتی ہے اور تنگ کی طرح ویدئے حوادث میں غوطہ کھا رہا ہوتا ہے اسکی اور موت کے درمیان ایک قدم سے زیادہ کا فاصلہ نہیں رہ جاتا تو وہی بالمشی عامل بے اختیار ایک غیر مادی پناہ گاہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور یہی قزاق کی طرف متوجہ کرتا ہے جس کی طاقت تمام طاقتوں سے بلند

وہاں ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ وہ ہر ان وجود خدا طاقور ہے کہ اپنی غیر معمولی طاقت کے ذریعہ اس کو اپنی حالت سے آزاد کرنا سکتا ہے اور اسی دریافت کی وجہ سے وہ اپنے تمام وجود کے ساتھ اس کی بارگاہِ اقدس سے طالبِ مدد ہوتا ہے اور دل کے گوش میں اس کی نجات و رزائی دینے کی طاقت کا اس میں کتب ہے اور مدد یہ ہے کہ وہ عزتِ خدا فی وحاشی و کرس و مادہ پرست مضرت ہوا قدر کے نشہ میں قدرتِ الہی سے بے پرواہ و مستغنی ہوتے ہیں جب نکت و نابودی سے دوچار ہوتے ہیں تو مددِ رسول اور ماحول کی وہ تمام قیلم بھلا دیتے ہیں میں ان کو بتایا گیا تھا کہ خدا ہم و خیال ہے وہ کچھ نہیں ہے اور دل و جان سے مبدد و مجرد و سرشارِ توانائی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور تاریخ کے صفحات میں آج بھی ایسے لوگوں کے واقعات موجود ہیں جنہوں نے سختی و پریشانی کے عالم میں اپنی فطرت کے چہرے پر چرا ہوا نقابِ نوحی پھینکا ہے اور دل و جان سے خدا کے بے ہمتا کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔

چنانچہ ویڈرو "VEDRO" فرانس کا ایک بہت بڑا مادہ پرست فلسفی ہے جو اپنی کتاب "آفاتِ مادہ و مادیات" کے آخر میں چند ایسے دعائیہ فقرے لکھتا ہے جو خدا کے فطرت و خدا و جان کے کس "عمل" ہیں، وہ کہتا ہے:-

"خدا یا! میں نے اپنے بیان کا آغاز اسی طبیعت سے کیا ہے جس کو خدا پرست تیرا شاہکار مانتے ہیں اور میں اپنا بیان تجھ پر ختم کرتا ہوں کہ تیرا نام اہل زمین کے یہاں خدا ہے۔ پروردگار! میں سوچتا ہوں تو ہے اور میرے ضمیر و محالات سے واقف ہے۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میں تیرے حکم کے خلاف اور اپنی فعل کے خلاف کوئی کام کیا ہے تو اس سے اذہم و بیشمار ہوں گا۔ لیکن آئندہ کے لئے آسودہ ہوں کیونکہ جب میں اپنے گناہ کا اقرار کروں گا تو تو بخش دے گا۔ اس دنیا میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا، کیونکہ جو بھی ہو گا وہ یا تیرے حکم سے ہو گا یا قانونِ فطرت کی بنا پر ہو گا۔ لیکن اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا عالم ہے تو تجھ سے پاداش کی امید رکھتا ہوں اگرچہ اس دنیا میں جو کچھ بھی کیا ہے وہ اپنے لئے کیا ہے۔" (۱) خدا و آراء بشری (۲۰۰)

ان باطنی شایع کے علاوہ جو فطرت انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں اور جو واقعات کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں تاکہ وہ مکمل آراہی کے ساتھ فطری اصول کے مطابق، مگر اگر کئی پروپیگنڈوں اور ذہنی اختراعات سے دور ہو کر اپنے لئے ایک راستہ منتخب کرے۔ ایک ہدایت و ارشاد کا عامل خارج از وجود بھی ہونا ضروری ہے جو عقل و فطرت کی تقویت اور رہنمائی کر سکے تاکہ کمرش طبیعتوں اور بے لگام افراط کی اصلاح کر سکے اور عقل و فطرت کو بھی انحراف سے باز رکھے اور خود ساختہ معبودوں کے سامنے سرنگوں ہونے سے روک سکے ایک ایسے خارجی راہی و رہبر کا بھی ہونا ضروری ہے۔

اور یہ خارجی راہی و رہبر نبی و رسول کہلاتا ہے اور ان کو — یعنی انبیاء و رسل — بھیجا ہی اس لئے گیا ہے کہ یہ انسان کو لطیف فطری اور کائنات کی طرف توجہ کریں اور غذا پرستی اور جذبہ متعاصد کی طرف قیادت کریں۔ انبیاء کی ہدایت و ارشاد کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ انسانی ارادہ کے خلاق شعلوں کو خاموش کر دیں یعنی اسکی قوت و انتخاب کی آراہی کو سب کر دیں، نہیں اب ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ حضرت انسان کے ایمانی رجحان کے لئے ایک مدد معاون ہیں اور جس کا مقصد صرف انسان کو قید و بند سے آزاد کرنا اور ان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنے فطرت و سرشت سے استفادہ کر سکے۔

بیسے پہلے انبیاء کی دعوت قبول کرنے والے وہی لوگ تھے جو پاک دل اور روشن ضمیر تھے اور انبیاء کی مخالفت کرنا بے یاتو و دلالت مند اور فرسودہ روایات کے پابند حضرات تھے یا ایسے لوگ جو اپنی عقل، ناقص و ناچیز دانش پر مغرور تھے اور انکی باطنی نخوت و غرور ہمیشہ انسانی استعداد سے استفادہ سے مانع رہی۔

ایک دانشمند کہتا ہے :-

”خانون عرض و طلب معنیات تک میں حاکم ہے کیونکہ اگر دین کی خواہش لوگوں کی فطرت میں موجود نہ ہوتی انبیاء کی تبلیغ بیکار رہتی حالانکہ انبیاء کی تبلیغ بے اثر نہیں رہی بلکہ انکی دعوت پر لبیک کہنے والے حضرات کافی تعداد میں تھے اور یہی بہت بڑی دلیل ہے کہ لوگوں کے باطن اور ذاتی ضمیر میں دین کی طلب موجود تھی۔“

انبیاء کی دعوت ہمیشہ نبی برتر و خدیج تھی نہ کہ انبیاات و جو وہ خدا پرستی، انبیاء پرستی، تبارہ پرستی، سورج پرستی و چاند پرستی اور اور..... وغیرہ سے اسی لئے دیکھا کرتے تھے تاکہ بشر کی فطری وہ وئی پیام خاری نقطہ مساوی — مثلاً بت پرستی و ستارہ پرستی وغیرہ — سے بچ سکے بلکہ ان کی دولت و تہذیب کا مقصد ہر قسم کی کجروی و انحراف سے دور ہو کر خدا سے برتر و برتری کی طرف انسانی ذہن کو متوجہ کرنا تھا، اور ان کے ہدف یہ تھا کہ لوگ کمال لائسنائی کے گرویدہ ہوں اور ایسے کامل ایمان کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ کے ہدف نہائی تک پہنچ جائیں۔

پس یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شرک و بت پرستی اپنی تمام اقسام کے ساتھ خواہ ترقی یافتہ صورت میں ہو — مثلاً ماہ پرستی — یا غیر ترقی یافتہ صورت میں ہو مثلاً بت پرستی — سب فطرت سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ علوم کی ترقی بالخصوص دینی تجربہ — جس کا آج کی دنیا میں ہر جگہ ظہور ہے — نے ایسے ایسے انکشافات کئے ہیں جن کی بنا پر ہم بڑے قیمتی نتائج اپنی موجودہ بحث کے لئے حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک طرف سے تاریخ ادیان نے علمائے جامعہ شناسی و ہستنا شناسی و مردم شناسی کے ذریعے ایسے ہی قدر مدارک اسناد و مہیا کر لئے ہیں جو سابق کی تمام تفاسیر سے الگ تھلک نہیں اور دوسری طرف سے نفس، انور و شناخت کی کاوشوں کے ذریعہ ہمیں کا آغاز ضرور گو کے ذریعہ ہوا اور آؤ گے اور یونیک کی کسی مسئلہ کے سبب انسان کے عمیق رویے میں غلطی عاقبتوں اور غیر عقلی اور پاک و معرفت کے بہار سے پہنچا اور پھر ہم نے عوامل غیر عقلیہ اور مادرائے ارادہ — جیسے دینی احساس — کے لئے عملی تجربات کا دائرہ کھول دیا۔

اور آج بھی ایک نگری بحث جاری ہے جس کے نتیجہ میں مختلف مکتب فکر کے کافی سے زیادہ نمکری اس اسل کے متفقہ ہو چکے ہیں۔ یعنی اس بات کے قائل ہو چکے ہیں کہ دینی احساس بھی روح انسان کے ثابت و فطری و عناصر اولیہ میں سے ایک عنصر ہے۔ اور فطری اوداک بھی مادرائے عقل کے اوداک کی ایک قسم ہے۔

حدود ۱۹۳۰ء سے یونانی فلسفی دوز ثلث ات ثابت کر سکا ہے کہ حس دینی میں عناصر عقلیہ اخلاقیہ کے علاوہ کچھ قطری یا ماورائے عقل عناصر بھی موجود ہیں اور تمام انہی صفات مثلاً قدرت و قدس اکبریت صرف مفہوم قدس کے افہام و فہم کے لئے ہیں کہ مفہوم قدس کی بازگشت کسی عقلی اور ادراک کی طرف نہیں ہے بلکہ مفہوم قدس ایک مستقل مقولہ ہے جو کہ بھی دوسرے مفہوم سے ناشی نہیں ہے اور نہ ہی کسی مفہوم عقلی یا غیر عقلی کے ساتھ اسے ایک شمار کیا جاسکتا ہے۔

اس زمانہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے عالم طبیعت میں ایک بعد رابع کا بنام زبان انکشاف کیا ہے جو دیگر ابعاد کی طرح جسم میں آغیز ہے اور اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ دنیا کے اندر کوئی ایسا جسم موجود نہیں ہے جو اس زبان سے خالی ہو جو حرکت و تحول سے پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح اس زمانہ کے علماء نے ایک بعد رابع کے وجود کی تحقیق کی ہے جو انسانی روح میں احساس دینی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ باقی متون احساس و روح ذیل ہیں :-

① **حسن جستجو و معرفت** : اور یہ باطنی نشئی وہی حس ہے جس نے اول روز سے فکر و بشر کو مسائل مجہولہ اور نشاندہ جہان ہستی اور اس کے گونا گوں مظاہر کی تحقیق و جستجو پر آمادہ کیا اور اسی تحقیق کے نتیجہ میں علوم و صنائع کا وجود ہوا ہے۔ اور تمام وہ نخبیاں و زخیں جس کو محققین و محققین علوم اور سرطوبت سے پردہ اٹھانے والے علماء برداشت کرتے ہیں اس کا سرچشمہ یہی احساس ہے۔

② **حسن نیکی** : جو ان کے بلند روحانی صفات و فضائل کا مرجع ہے۔ ہر انسان جو اپنے وجدان کے گھڑائیوں میں ایک ایسی کشش محسوس کرتا ہے جو اس کو عدل و نور دوستی اور خداکاری کی طرف کھینچتی ہے وہ کشش پاکیزہ اخلاق کی طرف توجہ اور کثافت و غلاظت سے نفرت کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔

③ **حسن زیبائی** : نور و ہند و قوتیات کے ظہور و بھلتی کا سبب یہی ہے اور اجتماعی حوادث کے ظہور میں اس کا گہرا اثر ہے۔

⑦ حسّ دینی : اسی احساس کی وجہ سے ہر شخص فطرتاً اور رائے طبیعت کی طرف ایک نشتر منبٹا دکتا ہے اور یہی منہایم ملائکہ کے استدلال کا نام ہے۔ احساس مذہبی کے کثرت کے ساتھ ہی روحانی ابتلا و ملائکہ کا حصار ٹوٹ گیا اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ ان کے اندر تمام مذہبی تعلّلات ذاتی طور سے موجود ہیں بلکہ ان کا وجود اس وقت بھی تھا جب انسان جنگلوں اور پہاڑوں پر زندگی بسر کرتا تھا۔

مبدع وجود کی معرفت حاصل کرنے کے لئے متعدد طریقے ہیں۔ غیر عقلی (فطری) اور عقلی حاجات کا جواب گو خود خدا کا منہوم ہے۔ اس طرح سے کہ نظم و آیات و علامات کے ذریعہ عقل وجود پروردگار کا نقیب منکھم کرتی ہے اور فطرت غشی و فطری نیاز مند یوں کے راستے سے خدا سے ارتباط پیدا کرتی ہے اور وہ ارتباط اتنا قوی ہوتا ہے کہ آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے لیکن بھارت کے ذریعہ نہیں بلکہ بصیرت کے ذریعہ۔ اگر دل کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کی جائے تو اس میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے۔

آج کا علم اگرچہ استدلال کرنے کے لئے تجربات کا سہارا لیتا ہے لیکن پھر بھی خدا کی توحید جو بحث و استدلال کا براہ راست نتیجہ ہے۔ خواہ استدلال عقلی و فلسفی ہو یا تجربات و حسّ کا نتیجہ ہو۔ وہ بہر حال استدلالی توحید ہے۔

ڈیکارٹ (DESCART) اور سنٹ تھامس ڈاکن (ST. THOMAS AQUINAS) جیسے علماء عقل و برہان اور فکر علمی کے بھر و کر سے خدا کی معرفت کے واضح نتیجہ تک پہنچے ہیں اور یہاں فرانسیسی جیسے عرفان شہود باطنی اور فطرت کے ہمارے اس نتیجہ تک پہنچے ہیں۔ یا سکال فرانسیسی کہتا ہے : خدا پر ایمان لانے کے لئے انسانی دل کے پاس ایسے دلائل ہیں جہاں تک عقل کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ انسان کا طرز فکر کچھ اس طرح ہے : ”زیبا ترین و عقیق ترین احساس جو انسان کو حاصل ہوتا ہے وہ ”من عرفانی“ ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو تمام واقعی علوم کے بیچ ہمارے دلوں میں کاشت کرتا ہے اور جو شخص اس احساس کا شعور نہ رکھتا ہو اور نتیجہ و بہت نہ ہو سکتا ہو وہ مثل میت کے ہے۔“

فیلم کرنی عالم ٹوٹن آدور دینی احساس کو انسان کے اندر آنا گہرا خیال کرتا ہے کہ اسی حق دینی کو انسان کا تمام حیوانات سے فصل میں قرار دیتا ہے اور کہتا ہے :-
 ”انسان وہ جو ان ہے جو میںا قیتر تھا کا معتقد ہو“

میں جستجو معرفت، میں نیکی جس زیبا ئی اپنی تمام اصالت و استقلال اور تاثیر جو اخلاق و ہنر اور عظم کی پیدائش میں رکھتی ہیں، ان سب کے باوجود میں دینی ان تینوں میں مستحق، میں نیکی جس زیبا ئی کی تحریک و نصایت کے لئے زمین ہمارا کرتی ہے اور آواز دہ کرتی ہے اور ان نینوں کی حمد و معاون ہوتی ہے عالم طبیعت کے کشف اسرار کے سلسلہ میں میں دینی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

مردموس کی نظریں دنیا نقشہ دقیق و حساب شدہ اور قوانین کی بنیاد پر پیدا کی گئی ہے اور خدا مدبر حکیم پر یہ انسان کے زیر سایہ انسان کی جس جستجو حرکت کرتی ہے تاکہ ملت معلول کے سلسلہ پر پیدا کی گئی دنیا میں طبیعت کے آثار و قوانین کے انکشاف کی راہ میں تلاش و کوشش کرے۔
 دین و دولت کہتا ہے :-

”ہر برٹ اسپنسر کا نظریہ ہے کہ کاہن حضرات ہی پہلے علماء ہیں جس طرح کہ وہ پہلے ادبا و بھی ہیں نیکی رعد گا ہوں کا مشاہدہ کر کے علم کا آغاز کرنے و سلسلہ ہی لوگ ہیں جس کا مقصد دینی جشنوں کے اوقات کا وقت نظر کے ساتھ تعین کرنا تھا اور اس قسم کے معلومات و اطلاعات کو عباد میں محفوظ رکھا جاتا تھا اور یہ دینی و دینہ سند بد نسل منتقل ہوتا رہتا تھا۔“

اب اس کے صفات عالیہ اور اس کی رشتہ عدالت اور تعدیل عزائم اور درخت اخلاق و فضیلت کے ثمر اور بنائے میں دینی کا جو اہم ہے وہ ناقابل انکار ہے۔ جو لوگ بھی دنیا کے راستہ پر چلتے ہیں وہ عزائم کے کنٹرول اور بند صفات سے آراستگی کو اہم ترین دینی فریضہ خیال کرتے ہیں۔

دور تاریخ کے اندر جس زیبا ئی کی پرورش میں دینی تفکر کا بہت بڑا حصہ ہے۔

لہذا انور نقارہ لہذا فیروزک حسین شاہ ص ۱۱۱ تاریخ و دین و دولت ج ۱ ص ۱۱۱

مدد یعنی جامعہ الطبیعیات

کیونکہ قدیم انسان نے اپنے بزرگترین فنی ثمار کو صرف اپنے خداؤں کے عظیم کئے ایجاد کئے تھے جیسے عیسے غریب عبادت خانے، مصر کے عظیم ہرام، میکسو کے خوبصورت مجسمے، مشرق وسطیٰ کے خوبصورت اندھیرے عقول فنی تعمیر، ساری چیزیں اس دینی ہی کے آثار ہیں۔

ہر نیا فنیات کا عقیدہ ہے۔ بلوغ اور جوش احساس دینی کے درمیان ایک علاقہ ہے اور زندگی کے اسی حصے میں دینی مسائل کی طرف ان افراد کی بھی مخصوص توجہ ہوجاتی ہے جو اس وقت تک مسائل دینی کی طرف بے توجہ نہ تھے۔

اسٹائن (STAINLEY) کا نظریہ ہے کہ یہ مذہبی احساسات مولد سال کی عمر میں پیدا ہوتے ہیں اور اس موضوع کو جوان کی شخصیت کی وسعتوں میں سے ایک سمت حساب کیا جاسکتا ہے۔ بچہ احساسات جوان کو جو مختلف قوتوں کے تحت تاثیر ہے "اس بات کے مجاز بناتے ہیں کہ وہ اپنے وجود کی حقیقت غائی کو ذات پروردگار عالم میں تلاش کرے۔"

یہ بات عموماً غلط رہے کہ فطرت انسانی کی آواز اسی وقت بجلی ہوتی ہے جب اس کے مقابل کوئی مانع نہ ہو لیکن اگر مخالف تبلیغ موجود ہو تو وہ فطرت اور فکر صحیح کے فعالیت میں کمی کر دیتی ہے اگرچہ اس قسم کے مانع انسان کے طبعی رجحانات کو جیسے ختم نہیں کر پاتے اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ مانع کو توڑ دیا جائے تو فطرت اصلی پھر سے اپنا کام شروع کر دیتی ہے اور خلاق درونی کی تلاش کے ساتھ اپنی تجلی کا آغاز کر دیتی ہے۔

تمام دنیا کے لوگ جانتے ہیں روس کے اندر کمونزم کو آئے ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدت گزر گئی لیکن اس کے باوجود روس میں بہت بڑے طبقے میں دینی احساس اب بھی موجود ہے اور زائد اران حکومت کی طرف سے اس طولانی مدت میں دین و مذہب کے مسائل کے لئے اتنی کم تر توانائیوں کو صرف کر دینے کے باوجود لاکھوں انسانوں کے دل کی گہرائیوں سے دینی احساس کو خالی نہیں کیا جاسکا۔

یہ جوتہ مثلاً: سلسلہ چہ میدنم؟

اور اسی بنا پر ہم کہتے ہیں: دنیا کے اندر مسلسل مادی افکار و عقیدہ خدا کے فطری ہونے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور یہ ناممکن ہے کہ کسی خاص مذہب کی راہ فطرت سے دوری اور جدائی کو دیگر مذہب تک اور بعد الطبیعات کے قائل مدارس سے خواہ آج کے ہول یا پچھلے کے کے بقابل خدا شناسی کے فطری ہونے کو ناقض نہیں قرار دیا جاسکے کیونکہ ہر عام میں تخصیص پائی جاتی ہے اور ہر شے میں استثناء ہو سکتا ہے۔ تاریخی نقطہ نظر سے مذہب مادی و فلسفی کی بنیاد قرآن ششم و ہفتم قبل مسیح میں پڑتی ہے اور اس عہد میں مذہب مادی کی حمایت کر نواے حضرات حسب ترتیب ذیل ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

① ٹالیس (TALES) - یہ یونان کا فلسفی ہے ۶۲۲ ق م میں پیدا ہوا اور ۵۴۶ یا ۵۶۶ ق م میں مر گیا۔

② ہراکلیٹس (HERACLITUS) - یہ ۵۳۵ ق م میں پیدا ہوا اور ۴۷۵ ق م میں فوت ہوا۔

③ ڈیموکریٹس (DEMOCRITUS) اس کا زمانہ ۵۴۰ ق م ہے۔

④ اپیکور (EPICHORE) اس کا زمانہ ۳۴۶ ق م ہے۔ لیکن ان سب کا مادی ہونا یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ مثلاً بعض علماء جیسے باگوان اپنی کتاب تاریخ الفلاسفہ میں ٹالیس کے لئے تحسین کرتے ہیں: ٹالیس کا عقیدہ تھا کہ مادی تغیرات، روحانی عوامل کے تحت تاثیر ہو کر رہتے ہیں اور ڈیموکریٹ کیلئے لکھا ہے: ڈیموکریٹ مادی نہیں تھا وہ وجود ارواح کا قائل تھا البتہ اٹھارہویں صدی میں مادی مذہب کی ترقی شروع ہوئی اور سائنس دانوں میں اس کے طرفدار پیدا ہونے لگے اگرچہ ان میں سے بھی بعض کے متعلق مختلف نظریے ہیں مثلاً جان جاگ روسو کے بارے میں بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ مادی مذہب کا قائل تھا اور دوسرے لوگ کہتے ہیں وہ خدا پرست تھا اور ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی اس لئے کہا گیا ہو کہ چونکہ اس نے اپنی زندگی میں گرجاؤں اور ان کے چوپ حضرت کی بڑی شدت سے مخالفت کی تھی۔

ڈاکٹر محمد فرید و عبدی اپنی مشہور کتاب انسائیکلو پیڈیا میں (مردوں) کے لئے تحریر کرتے ہیں کہ مردہ وجود کے بارے میں دوسوئے کہا ہے، فطری قوتوں کے انھوں جو حوادث پیدا ہوئے ہیں اور بعض کی تاثیر جو بعض میں ہوتی ہے اس کے بارے میں میں جتنی بھی غور و فکر کرتا ہوں قاعدہ الانتقال میں تجربہ الیٰ اخری سے میرے نزدیک یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ سبب اقل صاحب ارادہ و ادراک اور صاحب شعور ہے۔ اسی سلسلے میں عقیدہ رکھتا ہوں کہ ارادہ خدا ہی نے وجود کو حرکت دیا اور مردوں کو زندہ کیا؛ لیکن تم کو یہ پوچھے کا حق ہے کہ پھر وہ خدا آخر کب آئے ہے؟ تو میں جواب دوں گا کہ جن مسائل کو اس مسئلے متحرک بنایا اور جن مسئلوں کو نور بخش ان سب میں خدا موجود ہے اور خدا نہ صرف یہ کہ مجھ میں ہے بلکہ چرنے والی گوشت و استخوان پر بند ہے، زمین پر پڑے پتھر، درختوں کے وہ پتے جن سے ہوا اٹھکھٹکاتا کرتی ہے انہیں بھی خدا ہے بلکہ خدا ہر جگہ ہے۔ لہذا وہ نظریات کتنے بعید از عقل ہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ نظام بدیع ایک ایسی اندھی حرکت کا نتیجہ ہے جو اتفاقاً مادہ میں پیدا ہو گئی۔ ان لوگوں کا جو جی چاہے کہیں کیسے میری نظر میں جو مستحکم نظام موجودات میں ہے اس کا مطالعہ کروں اور اس میں جو حکمت و دلالت لگائی ہے اس کا ادراک نہ کروں تو یہ محال ہے۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو یہ کہہ سکیں کہ مردہ مادہ زندہ موجودات کو پیدا کر سکتا ہے اور اندھی ضرورت قائل کائنات پیدا کر سکتی ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس خود ہی عقل نہ ہو وہ ایسی چیز پیدا کر سکے جو صاحب عقل ہو؟

خدا اور تجرباتی علوم کی منطق

یہ مسلم ہے کہ اوسلحہ اجتماعی اور تربیتی و تہذیبی و تاریخی عوامل اور انسان کے فطری مشاغل اپنے عاطفی اور روحانی عوامل اور فطری خواہشات میں بہتے تاثر نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ یہ گونا گوں مشاغل انسانی خواہشات میں ایجاد و جبر و ضرورت نہیں کرتے مگر پھر بھی اس کے لئے ایک سازگار نظام پیدا کر دیتے ہیں جو عمل انسانی میں ایک نقش ہم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بلکہ کبھی انسان کی آزادی اور اختیار و انتخاب کے سامنے مانع بن کر خود دنیا کی کرتے ہیں۔

انسان کی روحانی قوتیں جس کسی مخصوص موضوع پر زیادہ کام کرتی ہیں اسی مخصوص موضوع میں وہ زیادہ مہارت اور طاقت حاصل کرتی ہیں اور اس کے علاوہ دیگر مسائل اپنی مہارت کھو بیٹھتے ہیں اور اسی مخصوص موضوع کے علاوہ تمام مسائل غیر اصلی و فخری ہو کر رہ جاتے ہیں اور پھر اس کے سامنے قیضہ اسی نظر کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھئے کہ سب گمراہ کن طریقہ یہ ہے کہ فکر انسانی کو صرف تجزائی علوم اور سائنس تک محدود کر دیا گیا اور خدا کی معرفت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اور چونکہ تجرباتی علوم کے متخص علمائے اپنی ساری فکری قوتوں کو محسوسات تک محدود کر رکھا ہے لہذا غیر محسوسات ان کی نگاہ میں بیگانہ سے ہیں۔ اور غیر محسوسات سے یہ بیگانگی اور دوری اور تجرباتی علوم پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے کا نتیجہ ہوا کہ سسٹم کون حیات میں ان کے نظریات کی بنیاد اور بنی تجویز اور صرف تجربہ ہی ہو گیا۔ اور ان کی نظریں معرفت اور تامل قبول صحیح تصانی کا معیار صرف تجربہ ہے اور وہ تمام مسائل کا حل اسی تجویز سے کرنا چاہتے ہیں۔ جن علوم کا وظیفہ حوادث و واقعات کے درمیان رابطہ کا بیان ہے۔ ان کا سارا مقصد یہ ہے کہ خود واقعات کے درمیان رابطہ کو برقرار رکھیں کہ خدا اور واقعات کے درمیان کشاکش رابطہ کریں اور انسان جب تجرباتی علوم کا مطالعہ کرتا ہے تو خدا کی طرف ذرہ بھر متوجہ نہیں ہوتا

اور ظاہر ہے محسوسات کے بیان سے مادائے طبیعت تعلق کو نہیں پا جا سکتا اور نہ ہی تجرہ کو تجربہ گاہوں اور لیبارٹریوں میں ہے پس یہ دیکھا جا سکتا ہے تجرہ گاہوں میں تجرہ کر کے علوم وجود خدا کے سلسلہ میں فیصلہ نہیں کر سکتے اور نہ کہنا بھی غلط ہے کہ اگر خدا کا وجود کوئی چیز ہو تو تجرہ گاہوں اور محاسبات ریاضی سے اس کو دیکھا جا سکتا تھا۔

کوئی بھی تجرہ اپنے تجربہ میں یہ یقین نہیں دلا سکتا کہ موجود غیر مادی کا وجود ہے یا نہیں ہے؟ کیونکہ تجرہ سے صرف ایسی چیز کو ثابت کیا جا سکتا ہے جس کی تجرہ سے نفی کی جا سکتی ہو، علم اور مشاہدہ فزیک اور کیمیا اور بعد الطبیعات، معرفت کے دو طریقے ہیں اور ان میں سے ہر ایک شے بالاسم کام والا ساتھ ہے۔ مشاہدہ فزیک کا اثبات تجرہ سے نہیں کیا جا سکتا لہذا تجرہ سے اس کی نفی بھی نہیں کی جا سکتی اور لاکھوں علمی تجرہ سے ثابت کئے سے عاجز ہیں، ہر چیز مادی ہے۔ تجرہ گاہوں کے تمام ذرائع — اپنے پیچیدہ و مکمل یافتہ ہونے کے باوجود — عناصر غیر معترف کی دیئے تارک و واسطہ تک نہیں پہنچ سکے اور ذات لائسنائی کے دلوں میں غمی تمام واقعات تک رسائی نہیں حاصل کر سکے بلکہ سچی بات تو یہ ہے ابھی تک مادہ کی حقیقت سے آگاہی حاصل نہیں کر سکے تو حاق مادہ کو کیا پہچانیے گے؟

یہ یقین کرتا ہوں کہ آفرینش انسان کے نظام دقیق پر مکمل آگاہی کے لئے تجرہ یقیناً بہت مفید ہے بلکہ اسلوب تجرہ کو نظام حقیقت کے مطالعہ کے راستہ سے ایمان پروردگار کے لئے ایک واضح اور جدید اساس قرار دینا ممکن ہے۔ کیونکہ تجرباتی مسائل کے اختلاف کا نظام خود ایک ایسا مکمل اور دقیق نظام ہے جو حاق توانا و عظیم کے وجود کی حکایت کرتا ہے مگر چونکہ اسرار عالم اور مسائل طبیعت کی تحقیق میں علمائے طبیعت کا مقصد کبھی معرفت حاق تک پہنچنا نہیں تھا۔ اس لئے وہ وجود خدا کے قائل نہیں ہوئے۔ ان محققین کے علوم کا مرکز صرف اسرار وجود کے کشف کرنے تک محدود رہا ہے اور یہ لوگ اپنے علم کے ایک محدود دائرہ سے باہر نہ بغیر اذطر اور طبیعت کے ظلمت علاقہ کے راستہ سے معرفت کے مرحلہ تانیہ تک پہنچے بغیر تواضع اور تجرہ سے جن چیزوں تک رسائی ہوئی ہے اسکو جمع کرتے ہیں اور پھر عقل و فکر کے نفاذ سے اسکی تفسیر کرتے ہیں اور چونکہ ان میں ایک طرف حس اور تجربہ سے حاصل شدہ فیصلہ کو ملح کرتے ہیں اور دوسری طرف عقل و فکر سے تجرہ کا نتیجہ اس کے متعدد اسی تک یعنی معرفت الہی تک نہیں پہنچ پاتے۔

یاد رکھیں علوم مختلفہ اور ان کے باہمی ارتباط و ملاقات کے تجوید کو دیکھ کر خدا کے عظیم کے وجود کا اعتراف کئے بغیر صحیح تفسیر کی ہی نہیں جاسکتی۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ اپنے قواعد و تحقیقات کو خدا سے الگ مستقل سمجھتے ہیں اور اسی کو اپنے تمام امور کا محور بناتے ہیں لہذا دیگر مسائل سے بالکل بیگانہ و اجنبی ہو جاتے ہیں۔

اب چونکہ ان کی عملی زندگی ان علوم سے اتنی مرتبط ہو گئی ہے کہ ان میں جدائی ناممکن ہے۔ سائنس کے ایجادات نے ان کے تمام حیات وادی کے اطراف و جوانب کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور ان ان انکشافات کے جو کچھ میں آنا لگتا ہے کہ وسائل زندگی میں وسائل فطرت و طبیعت کا تلاش کر لینا بہت ہی مشکل ہو چکا ہے۔ اس لئے فطری طور پر افراد انسانی کا ان علوم پر وقفا و ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ موجود خاکی و غیریات کے بارے میں لوگ شک و تردید میں مبتلا ہو گئے ہیں اور جب متعلق علمی اپنے تمام افکار کو اپنے قالب میں ڈھال کر پیش کرتا ہے تو لوگوں کے افکار بھی مسند کون دہیات میں اسی طرز کے چھوٹتے ہیں اور انتہا یہ ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہو جاتا ہے کہ کئی بھی امر و واقعہ کو اسی معرفت علمی کے ترانوہ پر توڑے بغیر قبول ہی نہیں کرتے۔ مختصر یہ ہے جو چیز دائرہ احساس و تجویز سے خارج ہو اس کے ثابت کرنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں، بالحد الطبیعات کا بہت بڑا ماہر پول کارنس ابرو لند (PAUL CLARENCE A.)

نکتہ ہے :-

”میں اپنے ابتدائی دور تعلیم میں علمی اسباب کا اتنا شہتہ تھا کہ مجھے یقین تھا ایک ذہن ایک دن ہر چیز کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی اور ایک ذہن ایک دن فطرت کے اسرار سرستہ فاش ہو کر رہیں گے۔ لیکن میری تعلیم و میرا مطالعہ جتنا مشاغل و حصار ہوا اور انٹیمسے بیکر بیکر ان تک اور میکرو بات سے میکرو ان تک میں نے ہر چیز کا جب مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ابھی تو بہت سی چیزیں چھوٹی رہ گئی ہیں۔ علم میں اتنی صلاحیت تو ہے کہ وہ انجم کے جزئیات کی یا فطرت کے موجودات کی تشریح کر کے لیکن وہ روح و عقل انسانی کی تعریف کرنے سے عاجز ہے۔ علماء اس بات کو جانتے ہیں کہ اشیاء کی کثرت و کیفیت کا مطالعہ کریں اور بیان کریں

لیکن جوہر اشیا کی علت اور خواص اشیا کی علت ان کے بس سے باہر ہے۔ علوم با عقل بشری یہ نہیں بتا سکتے کہ اجمہر بہکشان، روح پر چیزی کہاں سے آئی ہیں؟ علوم صرف ابتدائے آفرینش علم کے سلسلہ میں اپنے مفروضات بیان کر سکتے ہیں کہ یہ سارے، یا اجمہر، یا بہکشان مادہ اولی کے حصے بنائے گئے ہیں جسے پیدا ہوئے ہیں کیونکہ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ "اویہ" اور اس کے پھٹ جانے کی طاقت کہاں سے آئی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے صاحب عقل، خالق کے وجود کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔"

یہ تجربہ کار عالم جو خدا شناسوں کے افکار سے انجمنی ہے اس زندگی میں تمام ان چیزوں کو قبول کرتا ہے جو خلقِ علمی کے مطابق ملتا اور جو چیزی اسلوبِ علمی کے مطابق نہ ہوں ان کا منکر ہے۔ اسلوبِ علمی سے ملو یہ ہے کہ وہ صرف تجربہ پر مبرور کتاب ہے اور اسی کو دلیل بناتا ہے ہر استدلال کی صحت کا دار مدار اس کے نزدیک صرف مطابق تجربہ ہوتا ہے۔

ایسا تجربہ کار عالم کہ جسکی مذہبی فکر کی بنیاد امور و غفلت ہو، خصوصاً وہ دینی و فرائضی مسائل و احکام جو امر و نہی کی صورت میں موجود ہیں اور اس کے پاس بظاہر اپنے علمی مباحث میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں ہے جو اسکی تفسیر کر کے یعنی جس سے وہ عالم ان احکام و مسائل کو سمجھ سکے، حالانکہ وہ علمی زبان اور فارمولوں کے عادی ہونے کے سبب علمی اسلوب کا پابند ہے لیکن اس کے سامنے ساوہ او سبے تکلف تمام مذہبی احکام و مسائل یقیناً یہ طرز فکر غلط ہے۔ یہی علوم؛ کیا ان کے فارمولے پیچیدہ اور دقیق نہیں ہیں؟ اور کیا ان کے سیکھنے والے کے لئے ان دقیق و مشکل مسائل میں غور و فکر کرنا ضروری نہیں ہے؟ یقیناً یہ فارمولے بہت مشکل و دقیق ہیں لیکن اس فن کے علماء جب اسکو علمی زندگی میں پیش کرتے ہیں تو ان مشکل قواعد سے انکار کر اور علمی اصطلاحوں سے لگ کر کے اس کو آسان طریقے سے پیش کرتے ہیں ورنہ یہ علماء اپنے علمی و صنعتی مراکز میں اور کتب خانوں میں محصور و ہر بات سے۔

چنانچہ تمام لوگ محضوں، ائمہ یوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ہی سعادت دیگر تمام علمی وسائل کی بھی کسے

اپنے تمام پیچیدہ لکھ دھنوں کے باوجود ماہرین کی معمولی سی ٹریننگ کے بعد تمام لوگ اس سے فائدہ اٹھانے لگتے ہیں۔ اور جو لوگ ان علمی دوسائی کو خریدتے ہیں ماہرین ان کو فنی اور ٹیکنیکی معلومات نہیں بتاتے بلکہ صرف ایجاب و کریموں کی تمام زمتوں اور پریشانیوں کے بدلے چند ٹیبلتے کھتے ہیں جس سے خریدار اس کو اپنے استعمال میں لانے کا طریقہ سیکھ لے۔

بنابراین اگر ہم ان مذہبی دستوروں کو جو علمی فارمولوں کی زبان میں نہیں ہیں بلکہ سادہ و عمومی ہیں؟ غیر صحیح و باطنی ذہنی اور تصورات کے قالب میں فرض کر کے ان کی اہمیت و ارزش سے انکار کر دیں اور اپنی زندگی میں ان کے حقیقی آثار سے غافل رہیں تو یہ بات انصاف سے اور منطق علم سے بہت بعید ہے۔

یاد رکھئے علمی احکام اسی وقت مفید ہوتے ہیں جب عمومی زبان میں پیش کئے جائیں اور فرد و اجتماع کی زندگی میں سب ہی کے لئے قابل لمس ہوں۔ اس کے علاوہ اگر دینی احکام ہمارے دائرہ اختیار میں ہوں تو پھر کسی نبی یا دین کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بلکہ ہم خود ہی ان کو وضع کر لیا کریں گے۔

اصولاً انسان اپنے مقصد و رات کے سامنے غیر مقصد و رات سے چشم پوشی کر لیتا ہے اسی طرح علم طبعیت اور اس کے طالب علوم تجربیہ میں اپنی معلومات پر مغرور ہو گئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ انھوں نے عالم حقائق کو مسخر کر لیا ہے۔ حالانکہ کسی زمانہ میں کسی کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ دعویٰ کر سکے کہ اس نے تمام اسرار عالم کا احاطہ کر لیا ہے اور عالم طبعیت کے چہرے سے تمام عجائبات اٹھا دیے ہیں۔

واقعیات کو زیادہ وسیع النظری کے ساتھ دیکھنا چاہئے اور اوقیانوس چھولات کے مقابل میں اپنے علم کو ایک ناچیز قطرہ سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ ایک علمی انکشاف کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ابھی تو ہمارے سامنے مجہولات کا ایک ٹھاٹھیں مارنا ہوا سمندر ہے۔ ہزاروں سال پہلے ہی ہوئی تاریخ میں انسان نے اپنی نہ ٹھکنے والی تمام قوتوں اور امکانات کو بروئے کار لا کر کائنات کی بیکراں وسعتوں میں مٹی بھی زیادہ سے زیادہ معرفت حاصل کی ہے وہ کائنات کے اسرار کثیر ہیں سے صرف چند رموز و اشارے ہی ہیں اور اسی سرزمین حقیقت میں انسان نے صرف چند مختصر قدم اٹھائے ہیں اور ابھی تو مجہولات کے پہاڑ ہیں جنھوں نے عقل انسانی کو گھیرے میں لئے ہیں۔

پر و فیسر مدد دیتے ہیں۔^۱

”تمام وہ اکثافات جو فکر بشری کے لئے ناممکن تصور اور خارق عادت تھے وہ دماغ میں ان لوہی کے دعت کی وجہ سے ایک ایسی مدت میں جو دو سو سال سے زیادہ نہیں ہے حاصل ہوتے ہیں اور اجسام و موجودات کی عمروں کے حساب سے یہ دو سو سال کی مدت ایک لحظہ کے برابر بھی نہ ہوگی۔ لہذا کسی انسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اختراعات بشریہ کی اس قلیل مدت میں دعویٰ کر سکے کہ وہ اسرار فطرت تک پہنچ گیا ہے یا ان کو استخراج کر لیا ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اکثافات بشری — جو دن بدن زیادہ ہوتا جا رہے ہیں — پر حکم لگانے کے لئے ہم کو اس سے زیادہ بسر کرنا چاہئے کہ کم از کم ٹیکنالوجی کی عمر ایک ہزار سال گزر جائے جب تک کوئی مکمل لگایا جاسکتا ہے۔ دیے یہ ہزار سال بھی کائنات کے لحاظ سے ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہے۔“

انسٹائن کی گفتگو ہمارے مقصد کی موید ہے جی ہمارے علمی بے بسا فنی جہان ہستی کے بے انتہا

اسرار کے مقابل میں نہ ہونے کے برابر ہے چنانچہ وہ کہتا ہے۔^۲

کائنات کی جو تصویر علم کے لحاظ سے بنائی گئی ہے۔ وہ ایک نامعلوم تصویر ہے کیونکہ دستگاہ اور اک بشر کے ضعف کی وجہ سے حلاقیقت تک رسائی ناممکن ہے۔ اور دنیائے فزیک کی ناقص تصویر پر انکشاف کرنا کوئی ایسا امر نہیں ہے جو جہاں سے مربوط ہو بلکہ زیادہ تر ہم سے وابستہ ہے۔“

اس لئے مبدائی علمی شناسائی علوم حسی اور منطقہ فعالیت اور اس کے نغز و سکے بارے میں زیادہ

حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے اور حقیقت تک پہنچنے کے لئے ہر قسم کے سوابق ذہنی اور موانع سے دور ہو کر صحیح فکر کے ساتھ تجزیہ و تحلیل کیا جائے۔

۱۔ و ہزار دانشمند و مجتہد خدائے بزرگ ص ۲۴

۲۔ انسٹائن کے علمی مقامات ص ۲۴

بے شک معلوم تجربہ ظاہر کے علاوہ کوئی خبر نہیں دے سکتے اور ان معلوم کے تحقیقات کا دائرہ محدود ہے۔
 میں صرف مادہ اور مادیات تک محدود ہے۔ اور چونکہ تجرباتی معلوم کا مقصد جہانِ خارج کی تحقیق ہے کہ ہم
 مطمئن ہو سکیں کہ فیصلہ ملی درست ہے یا نادرست؟ اس کو جہانِ خارج سے تطبیق دیکر مقامِ امتحان میں پیش
 کرتے ہیں۔ اگر جہانِ خارج نے عمل اس کی تائید کی تو قبول کرتے ہیں ورنہ قبول نہیں کرتے۔ لہذا اب معلوم
 تجربہ کے موضوع کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال کرنا چاہیے کیا حقائقِ مادہ رائے طبیعت بطریقِ حسن و
 آہائش قابلِ تجربہ ہیں؟ اور کونسی تجرباتی تحقیق کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ ایمان و عقیدہ میں مداخلت
 کرے؟

دانشِ مادی ایک ایسا چراغِ ضروری ہے جو اپنی شعاعوں سے بعض مبہولات کو روشنی کر دے لیکن
 ایسا چراغ ہرگز نہیں ہے جو ہر قسم کی تاریکی کو دور کرنے میں مفید ہو۔ کیونکہ ہر قسم کو پہچانا اس کے مجموعہ پر
 محیط ہونے سے تعلق رکھتا ہے اور اس معرفت سے تعلق رکھتا ہے جو تمام اجزائے شناخت کو اس کے
 طرف میں قرار دے سکے اور بیش کی ایک تجربہ جو سکے لیکن معلوم جسمی کے تنگ و محدود حصے کے اندر معرفت
 بشری کو قید ہی بنا دینا اس کو بیش کی ایک نہیں پہونچا سکتا۔ بلکہ یہ ایک نمودائے تجربی میں توقف ہے اور
 باطنِ ہستی کے جریاناتِ عین سے بے خبری ہے۔

خدا پر ایمان رکھنا یا نہ رکھنا معلوم تجربہ کے موضوع میں داخل نہیں ہے کیونکہ جب ان معلوم کو موضوع
 بحثِ مادہ ہے تو اگر غیر مادی ہوگا تو یہ معلوم ثابتاً یا نفیاً اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتے کیونکہ
 دین کے نزدیک خدا تو مسمیٰ ہی ہے اور نہ حواسِ ظاہر سے اس کا ادراک ہو سکتا ہے اور نہ زبانِ امکان
 اس کا احاطہ کر سکتا ہے بلکہ وہ ایک ایسا موجود ہے جس کا وجود احوال و اوضاع سے مترتب نہیں ہے وہ
 ان اوضاع و احوال کا عالم ہے اور ان سے مستغنی ہے وہ کمال کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہے اور انسانی شعور
 کے حیطہ امکان سے باہر ہے اس کی حقیقت و کذبات کا ادراک نہ کر سکتا ہماری قوت و طاقت کی تقصیر کی
 بنا پر ہے اور ہمارے امکان و استعداد سے ماوراء ہے۔

اسی دلیل سے ہم اگر تمام تجرباتی معلوم کی تابوں کا مطالعہ کریں تو کوئی معمولی سامود بھی نہیں لگا

جس میں خدا سے متعلق تجربوں کا ذکر کیا گیا ہو۔ باندھ اسے سلسلہ میں کوئی حکم لگایا گیا ہو۔ بلکہ اگر ہم وسیعہ کثرت و احمیات صرف حواس کو مان لیں جب ہم اپنے محسوسات سے غارت کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگاتے کیونکہ یہ خود غیر تجربی دعویٰ ہے اور کسی میں تجربی کی طرف مستند نہیں ہے۔

فرض کیجئے قانون تو محدود اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل نہ بھی پیش کر سکیں تب بھی اس خدا کے عدم وجود کا حکم لگنا جو مادہ محسوسات، ایک غیر علمی مختار ہے بلکہ محض خیال و وہم ہے اور اس طرح کا لکنا بے بنیاد بات ہے جو علم و فلسفہ کے شان کے خلاف ہے بلکہ منطقی تجربہ کے بھی منافی ہے۔ جارج پولیستر (GEORGE POLISTER) اپنی کتاب - اصول مقدماتی فلسفہ - میں کہتا ہے:

ایک ایسی چیز کا تصور جو زمان و مکان سے مستثنیٰ ہو اور تغیر و تحول سے مستثنیٰ ہونا ممکن ہے۔ ان کلمات میں ایک ایسی فکر کا وجود ہے جس کے بارے میں نہیں معلوم کیا جاتا ہے؟ اور کس چیز کی تلاش ہے؟ اگر اسے معلوم ہو کہ کس چیز کی تلاش ہے تو اس کو یہ معلوم کرنا چاہئے کہ کس طرح تلاش کیا جائے کیونکہ پولیستر کا مرکز تحقیق صرف طبیعت اور محسوسات ہی لہذا جو چیز اس کے علمی میدان سے دور ہے اور تجربہ حسی کے لحاظ سے اس کا وجود قابل ثبات نہ ہو وہ اس کو محال ہی سمجھے گا اور اس کے عقیدہ کو اسلوب فکری علمی کے منافی سمجھے گا۔ حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جب معلوم ہے کہ عالم مادہ - اپنے تمام اسرار و رموز کے ساتھ صرف اسی کرہ میں محدود نہیں ہے جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اور خصوصاً جب کہ اسی کرہ کے مہولات بشریہ بے شمار ہیں جو عالم طبعی کا مرکز نظر ہے تو پھر علمائے طبیعت کو اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ مادہ رائے طبیعت ہمارے وسائل علمی سے خارج ہے لہذا ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے صرف سکوت اختیار کرتے ہیں نہ یہ کہ اس کا انکار کرتے لگیں کیونکہ ان کے لئے یہ کیونکر جائز ہے کہ تمام نظام ہستی کے وسعت کے ماننے کے مدعی ہوں جبکہ ان کا علم کائنات کے مقابل میں صفر ہے۔

بھلا کون سی دلیل ہے جس کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ وجود صرف مساوی مادہ ہے؟ اور کائنات وجود کا انحصار صرف مادیات میں محدود ہے؟ اور مادہ رائے طبیعت کا منکر کون سا عالم

ہے جس نے آج تک اپنے انکار کی بنیاد کو قطعی اساس یا منطقی دلیل پر رکھی ہو، اور کوئی ایسی دلیل یا برهان اس بات پر قائم ہے کہ حدودِ حسی و تجربہ سے جو چیز خارج ہے وہ عدمِ محض ہے؟ علم اگرچہ بطور قطع و صریح ان تمام جمہولات کا محض اس لئے منکر نہیں ہے کہ ان تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ اس انتظار میں ہے کہ شاید کسی دن اس کا انکشاف ہو جائے اس کے باوجود وہی حضرات اللہ کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کرتے حد یہ ہے کہ بطور تک و تردید بھی اس مسئلہ میں بحث کے بغیر حیلہ بازی اور بر خود غلط انداز سے بطور قطع و صریح خالق کائنات کا انکار کر دیتے ہیں۔

یہ لوگ مخصوص چیزوں کے لئے کچھ تقیاس و معیار قرار دیتے ہیں اور اسی تقیاس کو دوسری چیز کے بارے میں قبول نہیں کرتے مثلاً معیارِ سطح کو مخصوص فی حجم کی معرفت میں استعمال کئے کو ناجائز کہتے ہیں۔ لیکن یہی حضرت جب عالمِ معنی میں پہنچتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ خدا، روح اور وحی کو اسی مادی تقیاس و سؤل سے سمجھا جائے اور جب ان امور کو ان تعالیٰ سے نہیں سمجھ پاتے اور عاجز ہو جاتے ہیں تو فوراً انکار کر بیٹھتے ہیں۔

اگر منطقی تجربہ میں محصور انسان عالم وجود کے صرف انھیں چیزوں کے وجود کا قائل ہے جو تجاربِ محسوسہ سے ثابت ہیں اور ان کے علاوہ تمام چیزوں کا منکر ہے تو اس کو جان لینا چاہئے کہ یہ ایک ایسا راستہ اس نے انتخاب کیا ہے جو تجرباتی علوم کے آزمائش و تحقیقات کا حاصل نہیں ہے بلکہ اس قسم کی روشن نگری عینانِ نگری کی ایک قسم اور عار و طبیعت و فطرت سے خروج ہے۔ اور علماءِ الہی کے نزدیک جس خدا کو یہ علماء طبیعت اپنے علمی وسائل اور طبعی اسباب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ خدا ہی نہیں ہے۔ اور مادی علوم اس میں علمِ قصد تک پہنچنے سے عاجز ہیں۔

فیزکالوجی کا مشہور عالم ڈاکٹر آروی کہتا ہے:-

منطقی وجود خدا کو تو ثابت کر سکتی ہے مگر نفی وجود خدا سے عاجز ہے۔ ہو سکتا ہے

بعض لوگ وجود خدا کے منکر ہوں میا کہ ماضی میں بھی رہے ہیں لیکن ان میں سے کوئی

بھی اپنے دعوئی پر معقول دلیل نہیں پیش کر سکا۔ اگر کسی کے پاس کسی چیز کے وجود

کے انکار پر دلیل عقلی ہو یا کسی چیز کے وجود کے مشکوک ہونے پر دلیل عقلی ہو تو وہ انکار کر سکتا ہے لیکن میں نے ابھی تک اپنے مطالعہ میں کسی کو نہیں دیکھا جو انکار وجود خدا پر معقول دلیل رکھتا ہو۔ اس کے برخلاف وجود خدا پر بے شمار اور معقول اولہ دیئے گئے ہیں۔

موجودنا دیدہ کا عقیدہ صرف خدا ہی میں منحصر نہیں ہے!

جس خدا نے واحد دیکھنا کی طرف انبیاء و رسولوں نے ہم کو دعوت دی ہے کہ اس کی معرفت حاصل کریں اور عبادت کریں۔ اس کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نامحسوس مطلق ہے۔ انہی وادہی ہے ہر جگہ موجود ہے اور کہیں نہیں ہے۔ عالم طبیعت کے تمام محسوسات میں اس کے مظاہر تہ جسم ہو کر موجود ہیں۔ عالم وجود کے ہر نقطہ میں اس کا اسادہ ظاہر و قہلی ہے اور اس قوت اور ذات عالم کے لئے تمام خواہر طبیعت آئینہ ہیں وہ صرف غیر مرئی ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے محسوس اس کے اور اک سے عاجز ہیں کیونکہ جو چیز بھی ہمارے ذہن میں آئے گی وہ محدودیت کے چوکھٹے کے اندر ہی ہوگی مگر خدا مطلق و غیر محدود ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ایسا موجود میں کوئی نہی خواہی درکن کر سکیں ہمیں دلالت کی نہی درنگت روپ نہ ہو جو ہر شہادت و تجوات میں تازہ ہوا۔ ان کا تصور جاسئے بہت دشوار ہے اور ان مذہب کی چیز کو محسوس نہیں کرنا تو فوراً اس کا انکار کر دیجئے۔ جو لوگ وجود خدا کے مسئلہ کو اپنے محدود فکری چوکھٹے میں اور ادنیٰ رنگ نظری میں حل کرنا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں: نادیہ موجود کا عقیدہ کیونکر ممکن ہے! مگر وہ اس حقیقت سے یا تو فاضل ہیں یا پھر اس سے تعلق کرتے ہیں کہ، انسان اپنے طبعی خواہی سے یہ جانتے ہوئے کہ یہ خواہی محدود میں — صرف اس دیت دنیا کے ظاہر کا تو اور اک کر سکتا ہے لیکن وجود کے تمام اعلو کی معرفت پر قادر نہیں ہے اور نہ یہ اپنے حسی آلات کے سپاہیہ ظاہر کے اور ر ایک قدم آگے بڑھ سکتا ہے، جس طرح خود علوم تجربہ میں اتنی صلاحیت تو ہے کہ افکار انسانی کو محدود طبیعت تک پہنچا دے لیکن ماورائے طبیعت تک نہیں پہنچا سکتا۔

اگر انسان محسوس و حسی و معاہدہ کی ذیلیو کی چیز کے اور اک پر قادر نہیں ہے تو جب تک اس کے ہستیا اور شعلا پر دلینا نہ ہوئے صرف اس بنا پر اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہمارے مادی کسوٹی پر چوری نہیں اترتی۔ لیکن ہم کو کثرت فون ضمیمہ کا آثار ف ان مجر و ظاہر کے کرتے ہیں جن کی تفسیر وہی قانون نہیں کرتا ہے۔

اور حقائقِ علمی کا ثبات اس میں مستقیم کے بغیر ناممکن ہو تو بہت سے علمی حقائق کا ثبوت اور ان کا علمی ہونا بھی خارج ہو جائیگا۔ کیونکہ ان میں کے بھی بہت سے حقائق جس وقت تجربہ کے اندر نہیں آتے۔

کوئی بھی غلط فہمی و غلط فہم کی زندگی میں واقعاتِ مادی کا انکار اس بنیاد پر نہیں کر سکتا کہ وہ دکھائی نہیں دیتے اور محسوس نہیں ہوتے اور نہ ہر اس مادی چیز کا انکار کر دیتا ہے جو اس کے احساس کے دائرہ میں نہ آئے تو پھر اس غیر مادی چیز کا انکار کیونکر جائز ہے؟ جو مادے اور اک ہے۔

علمی تجربات کے اندر بھی یہ بات مسلم ہے کہ اگر معلولِ خاص کی علت ہم کو نہ ملے تو ہم فوراً قانونِ طبیعت کو باطل نہیں کہہ دیتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو اس کی علت نہیں معلوم ہو سکی؛ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا قانونِ علمی تجربات کی بنا پر مستقل ہے صرف تجربہ میں نہ آنے کی وجہ سے غلط نہیں کی جاسکتی۔

اچھا کیا جن چیزوں کو ہم قبول کرتے ہیں اور ان کے وجود پر عقیدہ رکھتے ہیں سب ہی کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ کیا اسی مادی دنیا میں ہم ہر چیز کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں صرف خدا ہی نہ دیکھتے ہیں؟ آہ! اور نہ محسوس ہوتا ہے؟ جی نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے تمام مادی علماء کا اتفاق ہے کہ ہمارے بہت سے ایسے معلومات ان حقائق و قضایا میں داخل ہیں جو نہ محسوس ہوتے ہیں اور نہ اس سے پہلے ہم مانوس تھے۔ کائنات کے اندر بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو نا دیدہ ہیں۔ خصوصاً اس عطرِ سر میں تو کاروانِ علم نے ایسے بہت سے حقائق کا انکشاف کیا ہے اور سب سے بڑا مسئلہ جو اس زمانہ میں علماءِ مادی نے حل کیا ہے وہ تبدلِ طاقت و طاقت کا مسئلہ ہے۔

اسی دنیا کے بھی موجودات اور اہم جو قوانینِ رویت ہیں جس وقت یہ جا لیا کہ اپنی طاقت کو باقی رکھیں تو اپنی پہلی صورت کو بدل کر طاقت کی طرف بدل جائیں۔ لیکن کیا یہ طاقت جس کی بنیاد پر بہت سے مادی انفعالات کا دار و مدار ہے یہ قابلِ رویت ہے؟ یا قابلِ لمس ہے؟

ہم اتنا تو جانتے ہیں کہ یہ طاقت ایک ایسا ضعیف ہے جو دارائے قدرت سے لیکن اس کی ماہیت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا راز ہے جو ابھی تک مخفی ہے۔ انسان کے بعض علمی نتائج استدلال و بران کے مرسن تھے ہیں ان کا مشاہدہ نہیں ہوتا ہے۔ بہت ہی چھوٹے چھوٹے ذرات کی معرفت ان استنباطات کی وجہ سے

ہوتی ہے جن کا در مدار شاہدہ و تجربہ پر ہے۔ ایٹم کے فیزیکی ذروں کے اتفاق کی حقیقت کا سمجھنا صرف دلیل ہی پر موقوف ہے۔ اگرے آثار ظاہر نہ ہوتے تو انسان ایچی واقعات و حواشی کے اندر کوئی حالات سے ہمیشہ جاہل ہی رہتا۔

یہی بجلی جو آج ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے اور جس کے بغیر انسانی تمدن دم توڑ دے گی کئی فیصدی سائنس تجربہ گاہ کے اندر اس کو دیکھا ہے یا ایسکرائٹنگ کپڑائی آلات کے استعمال کرنا اور اسے اسکو چھو کر دیکھا ہے کہ یہ نرم ہے یا سخت؟ یا اس کی آواز نکالتا ہے یا اس کے مغز کو چمکا ہے؟ بلکہ بجلی کے تاریں و دھڑکی ہوتی بجلی کو کبھی نے نہیں دیکھا بلکہ صرف آلات و تجربات سے پہنچا جاتا ہے کہ اس تاریں میں بجلی ہے یا نہیں ہے؟۔ لیکن نہ دیکھنے کے باوجود بجلی کا کوئی منکر نہیں ہے۔

جدید فیزکس کا کہنا ہے، جن چیزوں کو ہم محسوس کرتے ہیں وہ سخت و جامد ہیں آنکھوں سے انہیں کوئی حرکت نہیں دکھائی دیتی۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں کو ہم دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں وہ ایسے ذرات کا مجموعہ ہے جو نہ سخت ہیں نہ جامد نہ ثابت ہیں بلکہ یہ ساری چیزیں تو ہیں و تغیر و حرکت میں ہیں، اور ہماری آنکھوں سے اور ہمارے حس سے جو یہ ثابت و غیر متحرک دکھائی دیتی ہیں، انہوں میں کسی قسم کی ثابت و پائیداری ہے اور نہ سکون و آرام ہے۔ بلکہ ان کے ارد گرد سیر و حرکت و دورانی کا احاطہ کئے ہوئے ہیں جن کو ہم براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔

جو ہوا ہمارے وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہے کافی وزن فی اونس ہے اور بہن ہمیشہ اس کے نیچے دبا رہتا ہے۔ تقریباً ہر انسان سولہ ہزار کلو گرام ہوا کو برداشت کرتا ہے اور اگر کبھی بدن کے اندر دباؤ کی وجہ سے اس وزن میں کمی آجائے تو ہم کو تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ اب یہ ہوا ایک ثابت شدہ علمی حقیقت ہے جس کو گیلیلو (GALILEO) اور پاسکال (PASCAL) سے پہلے کوئی جانتا ہی نہیں تھا اور اس کے باوجود ہمارے حواس اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ پس ہوا بھی ایسا موجود ہے جو دکھائی دیتی ہے۔

۱۰۔ ہم زین العابدینؑ نے صیغہ سجادہ میں اس کی تشریح فرمائی ہے: اے خدا تو پاک و منزہ ہے تو سافو کی

بلکہ جسی تجربات اور عقلی استنباط کی بنیاد پر علماء جن صفات کی نسبت مواصل طبیعت کی طرف دیتے ہیں وہ بھی براہ راست ہمارے لئے قابلِ ردک نہیں ہے شفا ریڈیو کی موجیں ہر جگہ ہیں اور کسی جگہ نہیں ہیں بلکہ ایک قوتِ مابذیہ سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ بغیر اس کے کہ اس مادہ سے کچھ کم چو یا اس پر کچھ زیادہ ہو۔
تمامی تحقیقات کا مقصد مادہ کے محسوس جزئی آثار کا مطالعہ کر کے حواسِ غیبیہ اور فرائضِ عامہ تک پہنچنا عام جالوجی میں کروڑوں سال پہلے طبقاتِ زمین کے تشکیلات کے بارے میں خبر دی جاتی ہے اور پتہ یقین کے ساتھ طبعی حور سے سطحِ زمین میں پیدا ہونے والے ذائب و فرائضِ طبقاتِ زمین کی حد بندی، آثارِ تعدیہ کو بہتوں میں وسیع اور پچھلے ہونے کے اوقیانوس، شورہ زار زمین کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ ان اکتشاف کروڑوں میں سے ایک شخص بھی زمین پر چوتھے والے ان حادثات و واقعات کا نہ دیکھنے والا ہے اور نہ ہی اس کا عینی گواہ ہے۔

ہمارے ذہن میں آنے والے مفاحم مثلاً عدالت، خوبصورتی، محبت، عدالت، نصی، ملک کی کوئی شخصیت عین صورت نہیں ہے اور نہ یہ دکھائی دینے والی چیزیں ہیں اور نہ ان کا کوئی فیز یا وی اثر ہے اس کے باوجود ان کو امور واقعہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ ایک سیکڑک کی ہیت، لاسکی، ہواج، ہم کو ان میں جانتا۔ اسی طرح ایکسٹرنل ذیوٹر میں ان کے آثار و نتائج سے پہچانا جاتا ہے۔ دیکھئے یہ چیزیں بھی نہیں آتیں۔ تو پھر خدا کو آثار سے پہچاننے میں کیا پریشانی ہے؟

اچھا، زندگی کا تو وجود ہے اور ہم اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے؛ لیکن بھلا کس وسیلہ و ذریعہ سے حیات کی اندازہ گیری کی جاسکتی ہے؟ فکر و خیال کی سرعت رفتار کس پریمان سے ناپا جاسکتا ہے؟
ہدایت سرستان کی گونڈ (SITANLY CONSOAN) لکھتا ہے: "میں نے اپنے من گروہ سے کہا

وہ وزن کو جانتا ہے۔ لے خدا تو پاک و منزہ ہے جو زمینوں کے وزن کو جانتا ہے۔ لے خدا تو پاک و منزہ ہے تو اقب و اقباب کے وزن کو جانتا ہے۔ لے خدا تو پاک و منزہ ہے ملک و نور کے وزن کو جانتا ہے۔ لے خدا تو پاک و منزہ ہے تو سایہ اور چہرے کے وزن کو جانتا ہے۔ چھٹے مجاہد دعا ۵۵۔

کیا وہی قوانین کو عقلی تفکیک پر تطبیق کرنے کا طریقہ نکھو۔ مجھے اس کا طول سنہیر میں، اس کا ذوق کیونکر
میں، اس کا رنگ اس کی شکل، دباؤ، اندرونی کشش، فاعلیت، بہت حرکت و سرعت کو مجھ سے بیان
کرو۔ لیکن وہ اندیشہ و فکر کو کسی فیزیا وئی تعبیر یا ریاضی معادلہ سے بیان نہیں کر سکے۔ ہاں اگر کوئی نیا
لغت لکھا جائے جس میں فیزیا وئی طوائف وزن کے مخصوص معنی تحریر کئے جائیں تو اود بات ہے۔

علم معرفت ایک آزمودہ علم ضرور ہے لیکن وہ بھی معرض اشتباہ و گمراہی میں ہے۔ زندگی میں اپنے
مخصوص محدود کے علاوہ داسیں کوئی قانونیت ہے اور نہ صحت۔ تو ضعیف و بیسگوئی کے ہمارے وہ ممکن
طہر سے معلومات کتنی کے حصار میں محصور ہے۔ اور اسکی ابتداء و انتہاء احتمالی ہے تصنیف نہیں ہے۔
اور اس کے نتائج بھی خصوصاً ارتباطات بین النظمیہ مختلفہ عصری ہیں اور ظن و تخمین کی قسطی سے مبرا نہیں ہیں۔
واقعی اور غیر یقینی ہیں بسا اوقات جدید معلومات کی وجہ سے تعبیر پیر بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ علمی استنتاج
کی کوئی حد نہیں ہے۔ ایک عالم کہتا ہے: زمانہ حاضر تک کے اقیانیت چمن و چنان میں۔ خواہر طبیعت کے لحاظ
سے ہمارے شخصی اور کات محض نسبی اور محدود ہیں۔ اس دنیا سے عجیب و پر علائم میں کوئی ایسی واقعیت
نہیں ہے جو یقین کرشی شرط کے وجود فاعلیت خدا کی نفی کر سکے یا اس کے عدم کو ثابت کر سکے۔

اس بنا پر یہ بات نہایت ہی واضح ہے کہ غیر مرئی اور غیر مسموع کا انکار کرنے منطق اور عقلی اصول کے
بمخلاف ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ منکرین خدا کیوں اس قاعدہ کو جو تمام مسائل علیہ میں معمول رہے صرف
خدا کے بارے میں اس کا انکار کرتے ہیں؟

در اصل یہ بات ہمیشہ طوعاً و خاطر کتنی چاہے کہ ہم البتہ امدادہ کے چوکھٹے میں محصور و محبوس ہیں
اس لئے موجود مطلق کا تصور عادی توجہ کے ساتھ کر ہی نہیں سکتے۔ مثلاً ایک دیہاتی سے اگر یہ کہا جائے
کہ دنیا کے اندر ایک ایسا شہر بھی ہے جو بہت وسیع اور لاکھوں آدمی کی رہائش پر مشتمل ہے اور
اس کا نام لندن ہے تو اس کے ذہن میں ایک ایسا گاؤں آئیگا جو اس کے گاؤں سے دس بیس گنا بڑا ہو

لیکن اس کی حالتیں، وہاں کے لباس، معاشرت، روابط کے بارے میں ایسی کا تصویر بھی ہوگا کہ وہاں کے لوگ بھی ہمارے چنگاؤں کی طرح ہوں گے۔

لندن سے ناواقف افراد کے سامنے بھی یہ کہہ جا سکتا ہے کہ لندن ایک آبادی ہے لیکن اس طرح کی نہیں جیسا کہ تم سوچ رہے ہو اور نہ وہاں کی وضع تمہاری یہاں کے وضع کی طرح کی ہے۔ اسی طرح ہم پروردگار تعالیٰ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ موجود ہے نہ مذہب ہے قادر ہے، عظیم ہے لیکن ان موجودات اور ان قدرتوں کی طرح نہیں ہے۔ اس طرح ہم کسی حد تک دائرہ محدودیت سے خارج ہو سکتے ہیں اور یہ بات تو مادہ پرست بھی جانتے ہیں کہ مادہ اولیٰ کی حقیقت و ذات کا تصور ناممکن ہے۔

گرچہ ہماری نظر میں یہ محسوسات ہماری واقعہ اور دقیق ترین معلومات میں شامل ہیں لیکن علمی اور فلسفی مسائل میں تب ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا بلکہ تعصب کی عینک اتار کر ان کی حقیقت و ہدایت اور کشف و کشف کے سلسلہ میں وہ انسان کی کتنی مدد کر سکتی ہیں اس بات کی تحقیق ضروری ہے ورنہ یہ محسوسات ہم کو گمراہی و ضلالت سے دوچار کر دیں گے کیونکہ حسی ادراکات خواہر محسوسات کی مخصوص و معین کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ حسی ادراکات کا تعلق نہ تو ہم خواہر محسوسات سے ہوتا ہے اور نہ ہی اشیائے غیر محسوس سے ان کا تعلق ہوتا ہے یہ صرف محدود دائرہ کے اندر ہی درک شدہ و پروردگار ہیں۔

اب آپ اپنی آنکھوں کو بے چمکے کہ واقعات کے درک میں رہے مضبوط ذریعے مگر بہت سے مقامات پر حقیقت کے دیکھنے میں غلطی کرتی ہے۔ یہ انوار کا مشاہدہ صرف ہی وقت کر سکتی ہے کرب حوالہ موج ۶ فی صد میکرون سے کم اور ۸ فی صد میکرون سے زیادہ نہ ہو اس لئے ماورائے بنفشی اور ماورائے قرمز کے نور کا دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ اور ملٹی کتبوں میں موسیقی کی فلیٹوں کے لئے ایک مخصوص نغمہ قائم کیا گیا ہے۔ ہم جن رنگوں کو اس دنیا میں دیکھتے ہیں یہ درحقیقت رنگ ہی نہیں ہیں بلکہ امواج مختلفہ کے حوالیٰ ارتعاشات کا نام ہے۔ پس جس چیز کو ہم اپنے حواس سے محسوس کرتے ہیں وہ محدود قدرت میں محدود ہوتا ہے۔ مثلاً یہی حیوان گائے، بکری بعض واقعات کو مختلف رنگوں میں دیکھتی ہیں۔

اگرچہ ابھی تک اندوئے تحصیل علمی یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ انسان کے حسن بنیائی میں مختلف رنگوں کے اوراک کی کیا کیفیت ہے؛ اور اس سلسلہ میں جو تحقیقات اب تک دنیا کے سامنے آئی ہیں یا جو نظریات ظاہر ہوئے ہیں دفعیہ بات شے لگے نہیں بڑھ سکے۔ رنگوں کی رویت کا مسئلہ بھی اسی طرح مبہم و پیچیدہ ہے۔

توت لامرہ کا فریب اگر دیکھنا ہو تو تین برتنوں میں پانی پھر دیکھئے ایک میں بہت گرم پانی ہو ایک میں بہت سرد پانی ہو اور ایک میں گنگنا پانی ہو اس کے بعد ایک ہاتھ کو گرم پانی میں ڈالئے اور دوسرے کو سرد میں پھر دونوں کو ایک ساتھ کھال کر لگئے پانی میں ڈال دیکھئے تو آپ کو عجیب و غریب احساس ہوگا۔ ایک ہاتھ میں ضرورت سے زیادہ سردی اور دوسرے میں ضرورت سے زیادہ گرمی کا احساس ہوگا۔ حالانکہ پانی ایک ہے اور درجہ حرارت بھی شخص و معین ہے یہ لامرہ کا فریب محاکر نہیں؛ کیکن عقل و منطق سمجھتی ہے یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں پانی گرم بھی ہو اور سرد بھی ہو اور اس میں دو متضاد صفیئیں پائی جائیں۔ یہ درحقیقت قوت لامرہ کی خطا ہے کہ جو پیچے دلے پانی میں ہاتھ ڈالنے کی وجہ سے اپنے کسٹروں سے خارج ہو گئی ہے اور فعلیہ حسن حقیقت کے برخلاف ہے جس کی غلطی پر عقل و ذہن متوجہ کرتے ہیں۔

یہی حالت میں عقل کی رہبری اور تعینان فکر کے بغیر صرف حسن پر کیونکر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؛ اور حسن کی غلطیوں سے بچانے کے لئے اوراک عقل کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؛ لہذا ماننا پڑے گا کہ یہ عقل کا حکم ہے جو اصلاح حواس کی ذمہ داری ہے اور جو حواس سے بلند و بالا ہے۔

پس اس سے ثابت ہوا کہ عموماً واقعہ بنی اندیش نہیں رکھتے۔ صرف اندیش عملی نہیں ہے۔ اور جو لوگ اپنے مطالعات میں صرف حواس پر تکیہ کرتے ہیں وہ مسائل ہستی اور معانی آفرینش کے عمل پر کبھی بھی موقوف نہ ہوں گے۔

حواس کے واقعہ غائی کی قدرت کے سلسلہ میں جو کچھ ہم کو معلوم ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ممکنات حسن و تجربہ میں بھی نہما حواس انسان کو علم فیہی تک پہنچانے پر قادر نہیں ہیں پھر بھلا ان مسائل میں جو حواس کی پہونچ سے ماوراء ہیں اسیں حواس کی رہبری کر سکتے ہیں؟

مدرسہ ماورائے طبیعت کے پیرو اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس طرح علوم حسیہ میں تحقیق

موقوف کا طریقہ تجربہ ہے، اسی طرح مسائل، بعد الطبیعات میں انکشاف حقیقت کا ذریعہ وسیلہ عقل ہے۔

مشہور محقق - کیمیل علامہ یون - اپنی کتاب "اسرار الموت" میں تحریر کرتا ہے:

انسان جملہ ذمائی کی دوا کی میں زندگی بسر کر رہا ہے اسے

یہ نہیں معلوم کہ انسان کی پرستش فی ترکیب متعلق تک ہیری نہیں کر سکتی۔ اور یہ حواس چمکا کر انسان کو ہر چیز میں دھوکہ دیتے ہیں تمہا وہ چیز حواس کو متعلق تک پہنچا سکتی ہے وہ صرف عقل و فکر و وقت علمی ہی ہے۔

آج انسان کی عقل و دانش کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ ایسے ذرات و طاقت کا وجود ہے جس کو ہم دیکھ نہیں سکتے اور نہ ان کا کسی حس سے اور نہ کہ یہ جاسکتا ہے۔ پس اس بنا پر بہت ممکن ہے کہ بہت سی چیزیں اور ایسے زندہ موجودات پائے جاتے ہوں جو ہمارے حواس کے دائرہ اختیار سے خارج ہوں۔

لہذا جب یہ بات ذیل قطعی سے ثابت ہو گئی کہ حواس ظاہری میں تمام موجودات کے شناخت کی طاقت نہیں ہے بلکہ یہ حواس کبھی تو ہم کو خرب دیتے ہیں اور خلاف واقعہ کی نشاندہی کرتے ہیں تو ہم کو یہ کبھی تصور نہ کرنا چاہئے کہ تمام موجودات صرف ان میں موجود ہیں جن کا ہم حواس کرتے ہیں اور جس کا ہم حواس نہ کر سکیں وہ موجود ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف کا عقیدہ رکھنا چاہئے۔

جس طرح پہلے لوگ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہر جسم میں کروڑوں میکروبزات موجود ہیں اور مرندہ جسم میں ان کی جولاں لگاوا ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ جو چیز واقعات کی طرف ہمارا رہبری کر سکتی ہے وہ صرف اور صرف عقل و فکر ہے۔

اصل علیّت

اصل حیرت ایک عمومی قانون ہے۔ انسان کے تمام مادی علمی یا عادی کی بنیاد ہے۔ کوئی بھی حادثہ خواہ طبعی ہو یا اجتماعی علماء اس کی علت تلاش کرنے میں زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں کیونکہ علماء و دانشمند حضرات کبھی بھی تیسیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ خود بخود علت و معلول کے بغیر کوئی چیز پیدا ہو جائے۔ عالمی چارے پر علماء اور دانشمند حضرات کی تحقیقات نے ان کو یہ صلاحیت عطا کر دی ہے کہ طبیعت کے طاقتور نظام کو بہتر طریقہ سے پہچان سکیں، اور علوم و مضامین میں جتنی جتنی ترقی ہوتی گئی وہ قانون علت و معلول کے پابند سے پابند چلتے گئے۔ یہ علاقہ علیّت و معلولیت اور یہ کہ کوئی بھی حادثہ ممکن عام میں اس وقت تک قدم نہیں رکھتا جب تک کہ اس کے لئے کوئی علت نہ ہو یہ قوی ترین عقلی دلیل اور فکر کش کی واضح صورت ہے اور یہ ایک ایسا فطری و طبعی امر ہے کہ ہمارے ذہن میں اپنے فصل و انفعال کو آؤمیک طریقہ سے انجام دیتا ہے۔

یہ مرتد انسان بھی حوادث و ظواهر کی علت کا متلاشی رہتا تھا کیسی چونکہ علمی و مادی سے محروم تھا اس لئے ان حوادث کی نسبت ناپاک روحوں یا پاکیزہ ارواح کی طرف ویدیا کرتا تھا اور خود اپنے فلسفہ نے انسان کی سرشت و باطن سے منہدم علیّت کا استنباط کیا ہے اور ان مفادیم کو فلسفہ کے قارئین کا دھالا ہے۔

ماویہی کے برخلاف ہم — جو مادہ کی چار دیواری میں محصور ہیں — نے اپنا زندگی میں کمی چیز کو اتفاقاً پیدا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ طول تاریخ میں کمی کے سامنے ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ بغیر علت کوئی چیز خود بخود اتفاقی طور سے عالم وجود میں آجائے۔ اگر کبھی ایسا ہوا ہوتا تو ماویہی کے

نظر کے لئے دلیل بن سکتا تھا کہ کائنات دفعتاً اتفاق طور سے پیدا ہو گئی۔

وقت و حساب و تقابلہ اس نامل کے قدرت و ارادہ و فکر کا نتیجہ ہے جو اپنے عمل کو کسی مخصوص مقصد کے بنیاد پر سمجھاتا ہے۔ اور جو چیز عامل غیر عامل کے ہاتھوں موجود ہوتی ہے اس میں ہر گوشہ سے ہر صرح و مرجع و مافوقیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اب آپ سوچئے بھلا یہ کون سا تصادف ہے جس کے نتیجے میں خلوص ہستی سے اب تک ایسا عجیب و غریب، دقیق و متعقبات نظام موجود ہے؟ کیا اتنا ممکن نظام صدقہ و بقعہ ہوگا؟ مجھے بتائیے کس مادی یا انسانی علم میں یہ بات دیکھی گئی ہے یا کسی نے دعویٰ کیا ہے کہ بغیر علت مسبب کوئی چھوٹی چیز بھی خود بخود موجود ہو گئی ہے؟ سلسلہ علت و معلول کا لالی نہایت باقی رہنا اور علت اولیٰ کا نہ پہچانا انکار علت کا مجوز ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ اس کا مجوز ہو سکتا ہے کہ بیکرچی کے پہلے زمین کو آخری زمین قرار دیدیا جائے۔ اگر یہ کائنات حقیقی حکمت، ارادہ عالمہ اور تدبیر منہدی کا نتیجہ نہ ہوتی اور ایک متعقبات نظام کے تحت نہ چل رہی ہوتی تو ابتدائے آفرینش ہی سے ہر سطح نابودی و ویرانی کے خطوط میں ہوتی۔ کیونکہ اگر کوئی واقعہ اتفاقاً کی بنیاد پر ناگہانی طور سے زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں رونما ہوتا تو خاتمہ عالم کہیں اس اتفاق کا وجود ہی سامعہ ہوتا۔ کیونکہ نظام میں یا توازن عناصر میں نقص اس داخل اور توازن علم میں معمولی سا زہر جرم سماوی کے ٹکرانے کیلئے کافی ہے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں عالم کا فنا ہو جانا بہ ہی ہے۔

اور اگر پیدائش عالم پر بنائے تصادف سے تو پھر یہ مادی حضرات وجود کائنات کی تفسیر ایک محکم نظام و مکمل تدبیر پر — جس میں کسی اتفاق کو دخل نہ ہو — کیوں مبنی مانتے ہیں؟ اگر پوری کائنات تصادف و اتفاق کا نتیجہ ہے تو وہ کونسی چیز ہے جو تصادف کی بنیاد پر موجود نہیں ہوتی؟ اگر کوئی موجود تصادف کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے وجود میں آیا ہے تو اس کے میزات و خصوصیات کی ہیں تاکہ ہم تحقیق کریں اور دیکھیں کہ کیا وہ اس دنیا میں مختلف ظواہر صنوم پر منطبق ہوتا ہے کہ نہیں؟ حالانکہ نظام ہستی میں کوئی ایسی چیز نہیں ملے گی جس کا وجود اتفاق پر مبنی ہو۔ بلکہ کائنات آفرینش کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو فکر و تدبیر و وقت کا نتیجہ نہ ہو اور آثار کے یہی خصوصیات ہماری رہبری و موثر کی خصوصیات کی طرف کرتے ہیں۔

اگر نظام تو اذن کا خالق اتفاق و صدقہ ہوتا تو جتنی بھی چیزیں ہندسہ و دقیق حساب پر مبنی ہیں سب کے سب غیر منسجم اور ناہم انگ ہوتیں کیونکہ ہندسہ و دقیق حساب اتفاق و صدقہ کے صلب ہیں اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں صدقہ و اتفاق کو نظام عالم کی اساس قرار دینا کسی منطقی برہان اور علمی دلیل نہیں ثابت کیا جاسکتا۔ اور نظام وجود کے لئے بطور آخری حل کے قبول کیا جاسکتا ہے۔

اگر لفظ صدقہ کا استعمال بعض مسائل میں ہوتا بھی ہے تو وقتی اور عدم معرفت کی بنا پر ہوتا ہے آگاہی و علم کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ اور جب تک حوادث پر حکم قانون — یعنی علت و معلول — کا انکشاف ہو جائے اس لفظ سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ لیکن جب مستحکم علمی تحقیقات کے تجویز میں پیچیدہ حوادث کی علت و حقیقت متکلف ہو جاتی ہے تو اس لفظ کو طاق نسیان میں رکھ دیا جاتا ہے اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ تصادف کی تعبیر ایک آخری علمی فیصلہ نہیں ہے۔ شناخت علمی اور نظام جہاں کے کشف و موند کے بعد اس لفظ کے لئے کوئی مجال باقی نہیں رہتی۔

یورپی نہایت علمی کی ایک برجستہ شخصیت فرانسیس بیکن (FRANCIS BACON) کہتے ہیں: میرے بڑے یہ تو ممکن ہے کہ تمام انسانوں پر ایمان لاؤں لیکن یہ ہرگز نہیں مان سکتا کہ اس کائنات کی بنیاد بدیون علم و شعور رکھی گئی ہے۔ ایک علمی فلسفہ تو ذہن بشر کو اس حد تک طرف سے جاسکتا ہے لیکن فلسفہ دقیق انسان کو ہمیشہ دین کی طرف سے جاتا رہے گا۔ کیونکہ اگر کسی نے نزدیک علت کو دیکھا اور گہرائی میں نہیں گیا تو ممکن ہے کہ وہ خدا کا قائل نہ ہو۔ لیکن اگر تمام سلسلہ علل و معلولات کو نظر میں رکھے گا تو بہر حال شیت ازلی اور خدا لئے واحد پر ایمان لائے گا۔

یہاں پر مشہور ریاضی دان نیوٹن - NEWTON اور انگریزی مشہور منجم کی ایک دوست سے گفتگو کو نقل کرنا بہت مناسب ہے۔ نیوٹن (NEWTON) نے ایک ماہر میکینک اور خوش ذوق آدمی سے نظام شمسی کا ایک جھوٹا سانچہ (ماڈل) بنانے کو کہا اس ماڈل میں ایک ستاروں کا مرکز اور متعدد ستارے بنائے گئے تھے لیکن یہ ستارے چھوٹے چھوٹے گیند کی طرح کے تھے تو ذیلی کے تاروں سے ایک دوسرے سے مربوط تھے اور ایک چھوٹے سے سینڈل کے ذریعہ

ان تمام ستاروں کو اپنے اپنے مدار میں حرکت کرنے پر آمادہ کر دیا جاتا تھا اور یہ سارے ستارے اسی مرکز کے ارد گرد گھومنے لگتے تھے۔

ایک نئی نیوٹن (NEWTON) اپنی میز کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور اس کا وہ مکینک دوست بھی پاس ہی بیٹھا تھا جس نے یہ نظام کسی بنایا تھا اتنے میں نیوٹن (NEWTON) کا ایک دوست جو علاقے ماہر بین میں سے تھا ناگہانی طور پر گیا اور جس وقت اس کی نظر اس مصنوعی نظام کسی پر پڑی اس کی خوبصورتی و اس جکار کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا اور جب اس چوٹے سے ہینڈل کو حرکت دیکر تمام سیاروں کو مرکز کے گرد متحرک دکھایا گیا تب تو وہ اپنے تعجب کو چھپا نہ سکا اور بول اٹھا بھائی اس خوبصورت چیز کو کس نے بنایا ہے؟ نیوٹن نے کہا کسی نے نہیں بنایا یہ تو اتفاقی طور سے وجود میں آگیا۔ عالم ہادی نے کہا میرے دوست تم نے میرے سوال کو نہیں سمجھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارے سامنے رکھا ہوا نظام کسی کو کس ماہر مکینک نے بنایا ہے؟ نیوٹن "NEWTON" نے کہا برادر میں نے آپ کا سوال حرف بحرف سمجھ لیا ہے۔ اس کو کسی مکینک نے نہیں بنایا بلکہ اس کے قدرت اور مواد اولیہ اتفاقاً جمع ہو گئے۔ اور اس صورت میں بن گئے۔ دانشمند ہادی نے ایک ایسی نظر سے دیکھا جس میں حیرت و طبعی کی باتیں تھیں اور بولا، میرے دوست نیوٹن: تمہارا خیال ہے کہ میں جو خوف ہوں؟ کہ اس جیسی نادر و نایاب چیز کے بنانے والے کو مادہ کی طرف نسبت دوں؟ اسی وقت نیوٹن نے اپنا مطالعہ روک کر کتاب بند کی اور میز کے کنارے لکل کر اپنے دوست کے پاس آکر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا میرے دوست: یہ چیز جو تم دیکھ رہے ہو اور اس کے بنانے والے کے بارے میں پوچھ رہے ہو مومنے ایک چوٹے سے مائیک کے علاوہ کچھ بھی نہیں اس کو ایک مخصوص سسٹم کے ذریعہ بنایا گیا ہے تم اس کے لئے تیار نہیں ہو کہ یہ خود بخود بن گیا ہے اور یہ نہیں تسلیم کرتے کہ اس کا بنا نیولا دانا و آگاہ نہیں تھا۔ بس پورا نظام کسی اپنی تمام عظمت و

دو محبت اور عبادت کی باوجود بغیر کسی بنائے دے کے خود بخود بن گیا ہے اور مادہ کی کار فرمائی ہے اور اس کی
آخرین نفس اتفاقی ہے ! دانشمند مادی نوٹوں کے معقول دلیل کے سامنے لاجواب ہو گیا اور اس پر
ایک گہری خاموشی چھا گئی اور اسی کے ذریعہ وہ ماہر فنکار جو مادی عقائد رکھتا تھا اور حقیقت سے
کنارہ کش تھا وہ بھی لاجواب ہو گیا ۔

اصالت نیروی حیات

آج کا علم یہ پسند کر چکا ہے کہ زندگی زندگی کو پیدا کرتی ہے۔ زندگی کی زندگی ہمیشہ تو اللہ و ناس کے ذریعہ ہوتی و متحرک ہے۔ آج تک کوئی ایسا خلیہ نہیں ہو سکا جو بے جان چیز سے پیدا ہوا ہو۔ جدیدہ کے دیگر محوڑے کے محوڑے تک اگر ان کا پیدا کرنا اللہ دارائے حیات نہیں ہے تو پہلے وہ جہاں بھی ہو کسی دوسرے کا خلق نہیں ہو سکتا۔

آج کا علم کہتا ہے: اس کرہ زمین پر ایک طولانی زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ فوقی العادت گرمی کی وجہ سے اس پر زندگی کے آثار تھے نہ مہرے کا وجود تھا اور نہ نہریں اور چشمے تھے بلکہ اس کی فضا پگھلی ہوئی دھنوں اور تیشوں سے ہر تھی اور پھر جب پشت زمین سرد ہو گئی تب بھی لاکھوں سال تک اس پر ملوہ غیر آبی کے علاوہ کسی جاندار کا وجود نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ سطح زمین پر پھرنے والے نفیرت کے درمیان کسی زندگی کا وجود نہیں تھا تو پھر اس دسے زمین پر زندگی کیوں مکر آئی؟

محققین کا خیال ہے کہ زمین کی پیدائش کے تین ارب سال سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد حیات کا وجود ہوا ہے لیکن اس نے اپنے آفرینش میں کتنے سالوں کو دکھایا ہے اور کیا کیفیت تھی یہ کچھ معلوم نہیں ہے؟ سیکڑوں سال گزر گئے جب سے علماء و محققین و از حیات کو کشف کرنے کے لئے اپنے تجربہ گاہوں کی چار دیواری میں دن رات سعی و کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس معجزے کے حل میں ناکام ہیں۔

جرمنی کا مشہور محقق و دانشمند بروڈر ہولڈ لکھتا ہے: ۱۹۹۵ء - ۱۹۹۶ء - اپنی کتاب "العلوم البعیدہ" میں تحریر کرتا ہے: زندگی: کتنا سحر آفرین کلمہ ہے! کیا وجود عدم سے پیدا ہوا ہے؟ کیا مواد آبی مواد غیر آبی سے وجود میں آ سکتے ہیں؟ یا یہاں پر کسی قادر مطلق پیدا کرنے والے کا: "خ" کا رفر ہے؟

کبھی یہ بات بھی چاسکتی ہے ممکن ہے دوسرے اجرام فلکی سے ہمارے سیارہ میں زندگی آگئی ہو ؟
کیونکہ زندہ میکروبات نباتی جو کسی فلکی کسے میں گردش کرتے کرتے بہت اونچے اٹھ گئے ہوں اور
فضا کے نتیجے میں سورج کی شعاعوں نے ان کو کسی ایسے فضا کے افلاک میں پھینک دیا ہو جو اس کرہ
کی سطح تک پہنچ نہ گئے ہوں اور وہاں نشوونما پاکر تکامل کی صورت اختیار کر گئے ہوں !

ان مفروضات کے باوجود اس معرکے حل میں سرسوزن پیش رفت نہیں کی ہے۔ کیونکہ اس
صورت میں بھی ظہور زندگی کی کیفیت خواہ کوئی ایسا سیارہ ہو جو ہمارے نظام شمسی کے تابع ہے
یا شعریہ میانی کے تابع ہے — ہمارے لئے بھول ہے اور غیر واضح ہے۔

جس طرح فز، جرجی، ویفرہ کے اکٹھا کر دینے سے گھڑی نہیں چلا کرتی اسی طرح جب تک مرکب
حیات اور زندہ ہوجانے کی صدا مفقود ہوگی زندگی ناممکن ہے۔

اتنی بات سب ہی جانتے ہیں کہ مادہ دارائے زندگی نہیں ہے اور کوئی بھی مادی عنصر نہا زندگی
کی خاصیت نہیں رکھتا اس لئے یہ فرض کرنا کہ مادے کے ذرات کے تشکیل کے نتیجے میں زندگی آجاتی
ہے ناممکن ہے۔ کیونکہ پھر ہمارے سامنے یہ سوال منہ کھولے کھڑے ہے کہ زندہ مادہ تھاس و تونید
کے علاوہ کئی اور صورت سے مرکب اور تکثیر پذیر کیوں نہیں ہوتا ؟ زندہ اجسام میں برابر یکساں و ی
فعل و انفعال کا سلسلہ باقی ہے۔ اس کے باوجود رقی حیات کا اس میں کوئی وجود نہیں ہے۔ اب یہی
یہ بات کہ مادہ ترکیب کی طرف تہا میں رکھتا ہے اور اس کے دورہ ہلے تھوڑے و تکامل میں زندگی آجاتی
کھاتی ہے تو یہ زندہ حوادث کے مظاہر کی توصیف ہے جس کو ہم خود بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ کیفیت
وجود حیات اور اس کے سبب کی معرفت کا بیان نہیں ہے۔

ذاتی طور پر اجزائے مادہ میں کوئی اختلاف تو تھا نہیں پھر آخر بعض اجزاء تو دوسرے سے مرکب
ہوئے اور بعض اجزاء دوسروں کے ساتھ مرکب نہیں ہوئے، بعض اجزائے مادہ دارائے حیات
ہوئے اور بعض دیگر محروم رہے آخر اس کی کیا وجہ ہے ؟ یہ تفاوت کہاں سے پیدا ہوا اور مجبوریات
میں اس اختلاف کی علت کیا ہے ؟

دو ہند مختلف عناصر سے مل کر جو چیز حاصل ہوتی ہے اس میں یہ بات ہوتی ہے کہ ایک عنصر کے اندر غایت ہوتی ہے وہ دوسرے کو بخش دیتا ہے لیکن جو مادہ غایت ہے وہ کیونکر دوسرے کو بخش سکتا ہے؟ البتہ عام مرکب ہونے کے بعد ان میں ایک خاصہ عمومی پیدا ہو جاتا ہے جو ہر حال فرداً فرداً خاصہ مرکب کے خواص سے خارج نہیں ہوتا۔ لیکن حیات کے جو منفرد خصوصیات میں ان میں اور مادہ کے خصوصیات میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ کیونکہ حیات کے لئے جو تجلیات ہیں وہ مادہ کے لئے ہرگز نہیں ہیں اور بہت سی حیات مادہ پر حاکم ہے اگرچہ صورت و شکل میں وہ مادہ کے تابع ہے لیکن پر تو حیات جو لای مادہ پر چمکتا ہے اس کی حرکت و جنبش و ارادہ اور آواز کار لوڑک معرفت متعلیٰ ہوتی ہے۔ لہذا زندگی کی تفسیر عقلی کیا وی کے رد میں سے کرنا غیر متعقل ہے۔ ایک فلسفی کہتا ہے: کارخانوں کی طرح زندگی کا مادہ بے روح سسٹم کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا سسٹم ہے جس میں قدرت تکرار اور اپنے قوت جمید ہے اور اگر تعبیر درست مانی جائے تو اپنے اوپر تعویق و برتری بھی رکھتی ہے اور اس کے اندر ایک فطری و طبعی ادوی و مرشد ہے جو اندر سے اس کی ہدایت کرتا رہتا ہے۔

آخری کوں سامعین ہے جو مادہ کو مختلف انواع میں نظم پروگرام کے ماتحت بناتا رہتا ہے جو جسم اندر پانی جگہ بنا لیتا ہے۔ مادہ ضویہ کے اندر آباد و اجداد کی خصوصیات کو بلا استثناء اور بغیر کسی عقلی و خطا کے بنیوں کے اندر منتقل کر دیتا ہے۔ ہم خود دیکھتے ہیں کہ زندہ خلا کے ترکیب میں بھی خصوصیات ہوتی ہیں مثلاً کیوں کو چربا کرنا، حلق شدہ کو پھرنے سے بنا دینا، استعداد السوداع اور حفظ النویۃ وغیرہ۔ انسانی بدن میں جس وقت عمل کرنا چاہتے ہیں ہر سول اسی وقت بہت ہی شائد طریقے عمل کرتے ہیں تقسیم کار اور اپنے وظیفہ پر عمل حیرت انگیز ہے۔ بدن کے بنانے کے لئے مقدار ضرورت تقسیم ہو جاتا ہے اور ہر خلیہ اپنی جگہ پر دماغ، دیر، ہیکل، دل، اگر وہ میں پہنچ جاتا ہے۔ پس ایک جسمانی عمارت میں نظم و انتظام کے بعد طیارہ کے حیاتی وظائف میں کسی قسم کا قصور نہیں ہوتا غیر مفید اور فاضل مادہ کو ختم کر دیتا ہے۔ اور مکمل خود سے حجم تناسب کی حفاظت کرتا ہے۔

اس حیرت انگیز تقسیم بندی کا — جو اجسام موجودات میں اجزاء و لوازم و تناسب کی موجود ہے —

کی نسبت ناگاہک و میکائیلی مواصل کی طرف دنیا بہت ہی ناقص ہے۔ سر سے اور بھلا کوئی مانساں جو حریت فکر کا
 ایک ہوگا اس نطق کو قبول کرے گا۔

اسی لئے ہم کہتے ہیں: حیات و زندگی ایک لڑنا اور ہے جو اس مادہ سے — جو پاندام ہونے کی استعداد
 رکھتا ہے۔ باہر ترقی سے بچتا ہے اور اس کو بخش و حرکت پر آمادہ کرتا ہے۔ اور یہ اس اندک یم و حکم و قادر
 و خیر کا اردہ ہے جو زندگی کو اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ بے جان مادہ پر فضا کرتا ہے۔ اور
 حقیقت میں وہاں کہ انسان مادہ متحرک و سیر کے درمیان حیات کے رشتہ ثابت کو دیکھتا ہے اور خدا کو
 ملائقت کے جوہر میں مستر شاہدہ کرتا ہے۔

فطرت میں خدا کے جلوے

خداوند عالم کی معرفت کے لئے دنیا، مادی طبیعت، بعنوان مصنوع بہترین و روشن ترین اور عمومی دلیل ہے۔ اور یہی مادہ تحولات خدا کے یکجا اندازہ کے کاشف ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی مادی و روحانی شاعریوں میں سے یہ بھی ہیں جو موجودات کو مدد و زندگی بخشتا ہے اور تمام موجودات اپنے وجود و ترقی میں اس سے کسب فیض کرتے ہیں۔

خدا کی معرفت کے لئے دو طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ ایک عقلی اور دوسرا فلسفی جس کے ذریعہ اس حقیقت مطلق تک رسائی ممکن ہو سکتی ہے اور عقیدہ میں مبسوطی آ سکتی ہے اور شناخت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

پرتیبیج طریقہ استدلال تو صرف دانشمندوں کے لئے لذت آفرین ہو سکتا ہے۔ لیکن کتاب قریش کے سرور اور دنیا کے گوناگون موجودات کا مطالعہ خود گواہ ہیں کہ اس کی خلقت میں عقل عالی کی طبیعت کا کتب موجودات کا مطالعہ بھی اس خدا سے جو عاقی و حکم ہے اور پورا نظام کائنات اپنی تمام غفلت و وسوسہ کے ساتھ جس کے مظاہر قدرت کا معمولی سا جز ہے پر ایمان لانے کے لئے اگرچہ دلیل و برہان کی محتاج ہے مگر یہ برہان اتنا سادہ و بسیط ہے کہ جس میں فلسفی دلائل کی گتھیاں نہیں ہیں اور ایک طرح سے یہ دستہ تمام لوگوں کے لئے کھلا ہے۔ جس سے ہر مفکر، عالم، عامی استفادہ کر سکتا ہے۔

پھر شخص اپنی استعداد کے مطابق تمام مظاہر قدرت میں آثار ترکیب و توازن و تدبیر کا مطالعہ کر سکتا ہے اور اس کو ہر ذریعہ میں وجود مبدیہ پر محکم و قوی دلیل مل سکتی ہے۔

اگر ایک سادہ آدمی بھی کسی حیوان کے بدن پر غور کرے تو اس کے اعضاء اور ہڈیوں کی

خصوصی ترکیب اور نظام ہی مجال کو دیکھ کر یقین کریں گے کہ یہ دقیق نظام یہ محاسبات و تقادیر کا تحقیق کسی عظیم قدرت کاملہ و علم کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا اور ایک عالم فیزکس یا کیمیا کے ساتھ چپ و چکر و معدہ اور وصول غذا کے نظام کو دیکھتا ہے تو اس کو علم و قدرت لامتناہی کے آثار بخوبی دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ سادہ آدمی اور عالم فیزکس یا کیمیا کے غور و فکر کا طریقہ ایک نہیں ہو گا ایک کا دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ علمائے علم کی جو چوٹیاں سر کی ہیں اور فطرت کے راز ہائے سر بستہ کے کھولنے کے لئے جو اقدام کئے ہیں اور نظام کائنات کے حیرت انگیز و تعجب خیز معرفت کیلئے جو قدم اٹھائے ہیں ان کا تقابل عام آدمی سے نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ دونوں عالم و شخص سادہ — کے مطالعہ کا نتیجہ ایک ہی ہے۔

عام طبیعت کے لامتناہی اسرار کا مطالعہ کرنے والے تجرباتی علوم سے ہر شخص کے مستفید ہونے کے باوجود ان علوم میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ عباد رب خلقت اور فطرت پر ماکم مخصوص نظام کی معرفت انسان کو حقائق کائنات کی معرفت کے ساتھ اس کے صفات کمال جیسے علم و قدرت و ثناء کا کثرت نمائی بھی عطا کرتی ہے۔

یہ دقیق نظام — جو مختلف امور کے درمیان مناسب و معقول رابطہ کے برقرار رکھنا ہے۔ حیوانات، نباتات، زمینوں، آسمانوں، اکروں، پہاڑوں، سمندروں، ایتھوں کے اندر اسکی وسیع حکمت پر دلالت کرتا ہے خواہ از روئے ابداع و ایجاد دیکھا جائے یا اسکی مصنوعات میں چھوٹی سے سیکر بڑی تک چیزوں میں جو علم و قدرت و دلالت کی گئی ہے، اسی کو ملحوظ کیا جائے۔ بنیادی طور پر علمی بنیاد سے مادہ کی خود سازی محال ہے۔ اور مدد کسی نظریہ کہ ”جہان مادی ہمیشہ تحول اور برزخ کا طوفان میں رہا کرتا ہے۔“ بھی علمی میزان اور فطری واقعات کے مخالف ہے۔ بلکہ محاذات کے اندر ہونیوالے تمام تحولات یا تو خارجی قوت کے زیر اثر ہوتے ہیں یا اجسام مختلفہ میں داخلی تبادلہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور نباتات کے اندر ہونے والے تحولات اور ان میں نور و توسیع بارش، شعاع فمسن، اور زمینی تغذیہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اسی طرح عالم حیوانات میں بھی یہی صورت ہے اس میں حکمت ارادہ کا اعجاز بھی ہے۔
ان موارد مذکورہ میں اشیاء موجودات کا انضمام و ہم کاری جو غار جی کے ساتھ واضح و
روشن ہے۔ اور ان چیزوں کے باطن میں جو اثر و خواص و دیوت کئے گئے ہیں اور جو قوانین و ضوابط
ان کے لئے لازم قرار دیے گئے ہیں محال نہیں ہے کہ کوئی موجود اس پر لازم کئے گئے قانون کی مخالفت
کر سکے۔

انسان اپنے حواس کے ذریعہ جن واقعات کا ادراک کرتا ہے اس کے مختلف خصوصیات
ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ موجودات عالم تغیر و تحول و غیر ثابت ہیں۔ ایک مادی موجود
اپنے تمام دودھ ہستی میں یا تو بستر شدہ دکھل پر برقرار ہے اور یا پھر فرمودگی و انحطاط کی طرف
مائل ہے مختصر یہ کہ کائنات ہستی میں کوئی بھی موجود مادی ثابت و برقرار اور ایک حالت پر نہیں ہے۔
محدودیت بھی موجود محسوس کے خلاف ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لیکر
بزرگ ترین گہشت فوں تک ہر چیز زمان و مکان کی محتاج ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ بعض چیزیں بزرگ
مکان یا طولانی زمان پر مشتمل ہیں۔ اور بعض چیزیں مختصر مکان مختصر زمان پر مشتمل ہیں۔ اس کے
علاوہ ہر مادی موجود اصل ہستی کے لحاظ سے اور کمالات کے لحاظ سے نسبی ہے۔ قدرت و عظمت
و ذریعہائی و دانائی بلکہ چیزوں کی ہر صفت دوسری چیزوں کے اعتبار سے نسبی ہے۔

اسی طرح موجود محسوس کی خصوصیت تعلق و اشتراک بھی ہے۔ ہم جس وجود کو بھی فرمیں کریں
وہ کچھ دیگر امور سے مشروط و متعلق ہوگا۔ اس لئے وہ ان شروط کا محتاج کہلائے گا۔ اس دنیا کے
اندہ کوئی ایسی مادی چیز نہیں ہے جو بالذات ہو اور غیر سے مستقی ہو۔ لہذا فقر و احتیاج تمام
مادی موجودات کو محیط ہے۔

حواس کے برخلاف انسانی عقل و فکر جو حجاب و لاکھ عبور کر کے ہستی کے اعماق میں نفوذ رکھتی
ہے وہ کسی بھی ہستی کو امور نسبی و محدود و تغیر و محتاج میں منحصر ماننے پر تیار نہیں ہے۔ بلکہ فکر
انسانی ایک ایسے وجود کی ضرورت کو محسوس کرتی ہے جو دائمی حقیقت اور غنی مطلق ہو اور وہ

حقیقت ایسی ہو جو تمام نذول اور کج ناول میں حاضر موجود اور تمام موجودات اسی کی طرف مستند ہوں۔ کیونکہ پورے کائنات کا تمام بنیاد خود موجود نہیں ہو سکتا۔

پس معلوم ہوا کہ عالم ایک ایسی حقیقت مستعد کا محتاج ہے جو تہ قید بردار ہونے لگی پر مطلق ہواؤ لگی غیر مشروط ہو بلکہ تمام امور مشروط و محدود و نسبی کی حفاظت کنندہ ہو اور ہر چیز اسی حقیقت کی محتاج ہو کہ اسی کے درون کو ہستی ہے پر کرے۔ علامہ یہ کہ ہر موجود میں اسی کی حیات و دائمی و قدرت و بے انتہا حکمت کی نشانی موجود ہو۔ اور انہیں موجودات کو دیکھ کر اس حقیقت کے بارے میں یقینی معلومات حاصل کر سکیں اور ہر ذہن جو یا ہے حقیقت ٹھنی اس طریقے سے وجود خالق پر دین قائم کر سکتا ہے۔

مادہ اور قوانین وجود

مادہ اور قوانین وجود کے درمیان لازمی تقابلی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مادہ مستغنی ہو گیا ہے بلکہ مادہ سے مختلف قسم کا پیدا ہونا اور ان کے درمیان شدید ارتباط و تعلق ہے کہ مادہ خود اپنے وجود میں چند سنی قوانین کا پابند ہے جو ان کو ملکہ نظم و نسق میں بروقتی میں۔ کیونکہ وجود و واسطی خاصہ برتوف ہے ایک مادہ اور دوسرے نظم و ضبط اور ان دونوں میں مستحکم قسم کا ارتباط ہے اور وہ اور نظام کے مستحکم ارتباط کی وجہ سے جہاں تمام کا وجود ہے۔

جو لوگ مادہ کو بے نیاز مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ مادہ خود اپنا خالق ہے اور اپنے لئے اس نظام کو پیدا کر رہا ہے وہ لوگ بھدیہ کیونکر قبول کر سکتے ہیں کہ ہیئت و زمین و آکسیجن اور ایسٹرون اور برہمن نے خود ہی اپنے کو پیدا کیا ہے اور پھر ہی چیزیں دیگر موجودات کے وجود کا سرچشمہ بنی ہیں اور پھر انھیں چیزوں نے کچھ ایسے قوانین بنائے ہیں جو خود ان چیزوں پر اور تمام عالم مادی پر حاکم ہیں۔

مادہ پرست حضرات کا خیال ہے کہ اشیاء پرست موجودات ہالیکہ کی پیدائش کا سرچشمہ ہیں مگر وہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ مادہ جب اپنے اوج کمال کی حالت میں اپنے کو ایجاد کرنے سے یا قوانین حاکم کی نافرمانی کرنے سے عاجز ہوتا ہے تو اپنے حلیف پستی کی صورت میں اپنے ایجاد کرنے یا نظام وجودی کے مجاہد پر کیونکر قادر ہو سکتا ہے؟ لہذا یہ کیسے ناممکن ہے کہ پست مادہ موجودات ہالیکہ کا خالق ہے یا یہ کہ اس کو زندگی بخشنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟

جدید سسٹم میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ ہر مقصد نہ مادہ خاصہ مرکب سسٹم یا معین پر وگرام کی بنیاد پر خارج سے نظم شدہ سسٹم سے مرکب نظام میں یہ امکان ہے کہ ان کا نخون نکالی ہو سکیں

ہر سادہ سسٹم، مرکب جو خارجی اعداد و ارتباط کا محتاج ہو اور جو خود اپنی سائنڈگی پر قائم نہ ہو وہ تمام موجودات کا خالق کیونکر ہو سکتا ہے؟ جبکہ تمام سسٹموں کا مجموعہ بھی جب تک ارادہ، توانائی و شعور کا دارا نہ ہو وہ نہ قدرت کا بجا و نہ کہہ سکتا ہے اور نہ ہی کامل و متحرک دستگاہ کا ادارہ کر سکتا ہے؟

قانون — حساب الاحتمالات — میں یہ بات مسلم ہے کہ مجموعی حرکت جو غیر منظم ہو وہ صرف تفرق و بزرگندگی پیدا کرتی ہے اور ہلاکت سے قریب تر کر دیتی ہے۔

قانون احتمالات اس خیال کی شدت سے مخالفت کرتا ہے کہ دنیا کی پیدائش اتفاقی طور سے ہو گئی ہے بلکہ نہ صرف مخالفت کرتا ہے بلکہ اس کو نامعقول و ناممکن بھی سمجھتا ہے اس کے برخلاف قانون احتمالات ریاضی دنیا کے لئے ایک صحیح قیادت اور دقیق پروگرام کی ضرورت کو لازمی بتاتا ہے۔

قانون احتمالات سے پیدائش عالم اتفاقی ہے "کے ماننے والوں کے منہ پر بھر پور طنز طعنا مارا ہے۔ اگر بعض جینیوں کی خلقت کو اتفاقی مان لیں — تو اگرچہ یہ بات بہت بعید ہے — مگر ناممکن نہیں ہے لیکن ایک ایسے عالم کے بارے میں جو نہایت ہی متوازن و منظم اور باریک بینی پر مبنی ہے۔ اس کا وجود اتفاقی مان لینا ناممکن ہے۔ اور نظام وجود میں جزئی اور سادہ قسم کے تغیرات کا ہونا عالم کے اتفاقی وجود پر ہرگز دین نہیں ہے۔

اگر فطرت خود بخود حالت ترکیب و تشکیل میں تھی تو اب اس بات بغیر میں کوئی الجھا کر بیٹھا نہیں ہوتا۔ اور اب یقیناً آئینہ شک قسم کے تحولات کیوں نہیں رونما ہوتے؟

آج بھی دنیا میں حیرت انگیز واقعات جو ہوتے ہیں وہ خود اس حقیقت کی راہ نمائی کرتے ہیں کہ اس حیرت انگیز تحولات کے پیچھے کوئی عام و رانا طاقت موجود ہے جو کائنات کے انداز بننا اور عجیب خیز نظام کو برپا کرنے کا دلاتی ہے اور عام آفرینش میں شگفتگی پیدا کرتی ہے۔ اور کس طرح و تنظیم کا نقشہ ہستی پر ترسیم کرتی ہے۔

فطرت کے کرداروں ظاہر میں یہ حماحتگی اور ارتباط اور زندگی سے ان کے رابطہ کی صرف ایک ہی توجیہ ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ اس وسیع کائنات کے لئے ایک خالق فرض کریں کہ جس نے اس

کہہ خاکی میں پانی غیر محدود ہے انہا قدرت کے ذریعہ مختلف عناصر کو زندہ رکھا اور ہر ایک کے لئے ایک زمین پر و گرم کریم کریم کیا اور یہی توجہ فطرت کے تمام طواہر میں ارتقا و توازن سے مطابقت رکھتی ہے اور اگر اس توجہ کو قبول نہ کریں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم یہ احتمال دیں کہ انوار خواہر یہ یوں یہ ارتباط و انسجام اتفاقی طور سے بغیر کسی مقصد کے قائم ہے؟ اور یہ کیونکر مانا جاسکتا ہے کہ وہ مادہ کرہ و ذرات صفات و اوصاف میں اس خدا کے مساوی ہے جو عالم و فانا مدبر و قادر مطلق ہے؟

اگر یہ کائنات — جس میں عجیب العقول عجائب ہیں اور عقل بشر اس کے حیرت انگیز اذخار کے درک سے عاجز ہے — موجود نہ ہوتی اور دنیا صرف ایک موجود میں منحصر ہوتی جو صاحب خلیتہ واحدہ ہوتا تب بھی اس موجود حقیر کے اتفاقی وجود اور نظم و ضبط کا احتمال، احتمالات کے حساب کی بنیاد پر شمار اور ان گوی کے محاسبات کے مطابق — ایک ایسی ریاضی رقم تک پہنچتا ہے جس کے استیعاب پر خود فکر انسانی قادر نہ ہو سکتی۔

(BASHMIL) / "بشمیل" کہتا ہے — اے مادہ پرستو تم لوگ زمین و سورت کی حرکات و ادوار اور پورے نظام شمسی کے قائل ہو اور یہ بھی اعتراف کرتے ہو کہ علم ریاضی ایک مضبوط اور قطار دار نہیں ہے اس کے باوجود ان حرکات اور متحرکات کثیرہ و فیصلہ و دقیقہ و محکمہ و نظم کے پیچھے کسی مدبر طاقت کے قائل نہیں ہو تو تم کو یہ کہنا چاہئے کہ اس نظام شمسی خود اپنے کو پیدا کیا ہے اور اپنے لئے ایسا مجیدہ نظام بنایا ہے جس نظام کے مطابق وہ حرکت کرتا ہے اور گھومتا ہے اور پھر اپنے لئے ایک ایسا معین و دقیق و مستور بنایا ہے کہ جس کی بنا پر وہ کسی دوسرے سے نمکڑے کے اور یا پھر اپنی اس سرسام و سرعیت میں ایک ایسا مانع بنا دیا ہے کہ جس کی بنا پر وہ کبھی کسی سیارہ سے ٹکرائے نہ سکے — میں شخصی طور پر کسی باہوش آدمی کے لئے یہ نہیں موقوف سنا کہ وہ ایسا عقیدہ رکھتا ہوگا؟ یہ تو کوئی دیوانہ ہی عقیدہ رکھ سکتا ہے۔

دو طرفہ توازن

تمام اجزائے وجود اور موجودات ہستی اپنی داخلی ترکیب میں اور ایک دوسرے سے روابط میں ایک مضبوط نظام کے تابع ہیں۔ ان کی ترکیب اور باہمی رابطہ کچھ اسی قسم کا ہے کہ ہر ایک سر کو اس کے مقصد اور پیش نظر فطریہ میں مدد دیتا ہے۔ اور ہر موجود اپنے اس رابطہ کے ذریعہ جو دیگر موجودات سے رکھتا ہے اپنے ہدف و مقصد کی طرف خود سیر کر سکتا ہے۔

علم مادی کا سب سے بڑا کارنامہ اس دنیا کے ظواہر و کیفیت کی شناخت ہے۔ لیکن مخلوقات کی مابیت و حقیقت کی شناخت علوم مادی کے دسٹر میں سے باہر ہے۔

مثلاً ایک دانشمند تھکی زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکتا ہے کہ فضا میں کروڑوں کرات موجود ہیں بعض ثابت ہیں یعنی متحرک ہیں اور بتا سکتا ہے کہ قوت جاذبہ سیاروں کو آپس میں گرا جانے سے روکے ہوئے ہے اور ان کے توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور آلات کے ذریعہ سیاروں کا زمین سے فاصلہ زمین کی سرعت رفتار اور سیاروں کا حجم بتا سکتا ہے لیکن ان تمام تجربوں کا نتیجہ صرف سطح فرضی کے ظواہر کی تفسیر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ قوت جاذبہ کی حقیقت اور مرکزی طاقت کی مابیت اور ان کی پیدائش کی کیفیت بتانے سے یہ علوم مادی عاجز ہیں۔

مادی علمائے ستارہ اور مشین کی تفسیر تو کرتے ہیں لیکن ان کا محرک کون ہے؟ اس کی تفسیر نہیں جانتے۔ اسی لئے مادی علوم ان کروڑوں حقائق سے ناواقف ہیں جو طبیعت اور نفس انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ یہی انسان جو فطرت کے باطن تک پہنچ گیا ہے، ایک ذرہ حیاتی کے پیچیدہ اسرار و غوامض کے مقابلہ میں عاجز ہے۔ مختصر یہ کہ علوم مادی کے ماہرین ان اسرار کے کشف و تفسیر سے ورماندہ رہ گئے ہیں۔

آفتوش ہستی کے عجائبات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دوطرفہ تواریسی دو چیزوں میں بھی پایا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے ہم نانہ بھی نہیں ہیں۔ اور یہ مماثلگی ایک ایسی کیفیت ہے کہ جس کا تصور ابھی سے ایک آنے والے کے لئے کر دیا گیا ہے۔

اسی مماثلگی کا بہترین نمونہ مادر و فرزند میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ ماں سے خواہ وہ کسی انسان کی ہو یا کسی دوسرے جاندار کی ہو۔ کے حاملہ ہوتے ہی دودھ کے ہر منوات اپنا عمل شروع کر دیتی ہیں اور بچہ جننا جتنا رحم مادر میں بڑھتا جاتا ہے یہ بار مول بھی رو بہ افزائش ہوتے رہتے ہیں۔ اور جب وضع حمل کا نانہ آجاتا ہے تو مولود کی غذا دودھ کی صورت میں۔ جو بچہ کے تمام جسمانی اعضاء کے مناسب ہوتا ہے۔ تیار ہو جاتی ہے۔ اور پہلے سے تیار شدہ غذا بچہ کے ضعف و خمر کے لئے بہت ہی مناسب ہوتی ہے۔ اور ایک پوشیدہ و مناسب خزانہ۔ پستان میں محفوظ رہتی ہے۔ اور یہ خزانہ بچہ کی پیدائش سے سالہا سال پہلے ماں کے جسم میں ودیعت کر دیا جاتا ہے اور غذا کو آسان بنانے کے لئے پستان کے نوک میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہو جاتے ہیں جو بچہ کے دہن کے لئے نہایت موزوں ہوتے ہیں کیونکہ بچہ میں ابھی اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ کھارگی دودھ اس کے گلے میں اندر دیا جائے۔ بلکہ اس سوراخوں کے ذریعہ اپنی غذا چوس چوس کر مکمل کرتا ہے۔ بچہ جننا جتنا بڑھتا جاتا ہے اسی حساب سے شیر مادر میں تغیرات پیدا ہوتے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اطباء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نومولود بچہ کے لئے اس صورت کا دودھ قطعاً نقصان دہ ہے جس کے یہاں ولادت کو ایک مدت گزر چکی ہو۔

یہاں پر قدرہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک مستقبل میں آنے والے موجود کے لئے بہت پہلے سے ایک دوسرے سوچیں اس کی ضرورت کا لحاظ رکھا گیا ہے کیا یہ عمل ایک پیش بینی اور دقت و تدبیر پر مبنی نہیں ہے؟ اور یہ مستقبل بینی اور عجیب و غریب حکمت ایک قادر و توانا عالم مدد کے بغیر ممکن ہے؟ اور کیا یہ قدرت بے پایان کی وسیل نہیں ہے؟

تمام مشینی اور صنعتی وحدتوں میں جو محاسبہ اور وقت ہم دیکھتے ہیں یہ ان افکار و اعمال کا نتیجہ ہے جو اس کی تنظیم و ترکیب میں استعمال کئے گئے ہیں اور انہیں یعنی مشاہدات کے بموجب ہم

ایک کمی فلسفی نتیجہ آک پہنچ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی حساب و موازنہ کی بنیاد پر کوئی نظام ترکیبی پایا جائے وہاں ہم کو ضرور خود گرد کرنا چاہئے کہ اس کے پیچھے کوئی عقل و فکر و ارادہ یقیناً کار فرما ہے۔

جو مخصوص باریکی جسم صفتی وحدتوں میں دیکھتے ہیں۔ موجودات جمیوت اور ان کی ترکیب الٰہی میں اس سے کہیں زیادہ دقیق تر اور سگفت انگیز تر دیکھتے ہیں۔ بلکہ جوتہ سیرت مند و برتر جمیوت میں دیکھتے ہیں اس کا عشر عشید بھی اتنا اہم و نہایت اور بشری افکار میں نہیں پایا جاتا۔

لہذا جب ہم — بغیر کسی شک و تردید کے — اپنے صنعتی نظام کو افکار و ارادے کے نتیجے کہتے ہیں تو کیا نہ سہ و محاسبات دقیقہ کے جھروکوں سے طبیعت میں عقل و ارادہ اور لامتناہی علم نہیں دیکھ سکتے؟

علم طب کا کارنامہ

آج کے دور میں علم طب اپنے نرزا کے اس دور میں داخل ہو چکا ہے جہاں ایک انسان کے پہلوئے اس کا گروہ نکال کر دوسرے انسان کے پہلوئیں۔ جس کا گروہ خراب ہوگا اور قریب مرگ ہو۔ لگاؤ آجاتا ہے۔ طب کی ترقی کسی ایک طبیب کا کام نہیں ہے بلکہ ہزاروں سال کے علماء کے تجربات کی میراث ہے۔

پس حقیقت یہ کامیاب آپریشن سبھوں کے تجربات کا نقطہ آخر ہے پہلے کے حکماء نے اس عمدہ فراخ کئے اور اب نتیجہ ظاہر ہوا یعنی ہنگامہ کے چند ہزار سالہ افکار و خیالات کو اکٹھا کرنے کے بعد گروہوں کا کامیاب آپریشن ہو سکا ہے۔

کیا یہ کام ہم دانش کے بغیر انجام پاسکتا تھا؟ بدیہی طور پر جواب منفی طور پر ہے گا۔ مفکرین اور انسانی طاقتور و دماغ نے جب چند ہزار سال تلاش و جستجو کیا تب گروہوں کا نقل و انتقال ممکن ہوا۔ یہاں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ایک کار کا ٹائمر کھول کر اسکی جگہ دوسرا ٹائمر لگا دیں تو ٹائمرز کا بدلنا زیادہ اہم کام ہے یا ٹائمرز کا بنانا دونوں کاموں میں کس کام کے لئے زیادہ علم و دانش کی ضرورت ہے؟ ظاہر ہے ٹائمرز کا زیادہ مہارت چاہئے۔

اسی طرح دنیا کے طب میں گروہوں کا بدل دینا چاہئے کتنا ہی اہم معاملہ ہو لیکن گروہوں کا خلق کرنا اس سے کہیں زیادہ اہم ہے جیسے ٹائمر بدلنے سے زیادہ ٹائمر بنانا مشکل ہے۔

آپ تجاہلے وہ کون سا عقیدہ ہے جو یہ فیصلہ کرے گا کہ ایک گروہ کا بدلنا ہزار سال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے لیکن خود گروہ کا بنانا کوئی اہم کام نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک فطری بات ہے جس کے پاسرہچون والی عقل بھی ہوگی وہ بھی گروہ خلق کر سکتا ہے کیا کوئی صاحب عقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے؟

کی طبیعت کی خلقت کے لئے ایک عقل مدبر کا وجود فرض کر لینا ایسے مادہ کو خالق فرض کر لینے سے بہتر و قریب تر نہیں ہے کہ جو مادہ عقل و شعور ہی نہ رکھتا ہو اور نہ اس میں ابدی و اختراع کی صلاحیت ہو؟
یقیناً خالق کی حکمت پر ایمان و عقیدہ عقل و منطق سے کہیں زیادہ قریب ہے نسبت اس کے مادہ غیر مدبر کہ وغیرہ اور جو تدریس کے قابل نہیں ہے اس کو خالق مانا جائے کیونکہ تمامہ خصائص و اوصاف عقلہ جو اس دنیا کے ذائقہ کے لئے ثابت ہیں ان کو مادہ کے لئے کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے خدا خالق عالم تدبیر و ارادہ والا ہے اور مادہ میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں:

آئنسٹائن (۱۸۷۹ء تا ۱۹۵۵ء) اپنی کتاب — جو دنیا میں دیکھ رہا ہوں — میں تحریر کرتے ہیں: ایک عالم مصلح عالم وجود کے لئے قانون غیرت کا عقیدہ رکھتا ہے لیکن اس دانشمند کا مذہب کیا ہے؟ اس کا مذہب ایک عجیب شصف آور ہے جو کائنات کے عجیب و غریب نظام کی وجہ سے ہے۔ یہ نظام کہ جس کے بعض اسرار کا پردہ کبھی کبھی اٹھ جاتا ہے اس کی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسمیٰ اور منظم بشری افکار اس دقیق و دقیق نظام کے مقابل میں مثل مچھوٹ تھوڑے سے ہیں۔

طبیعت کی طرفت کاریاں

ذرا ایک طیریا کے پھر کو اپنے پیش نظر رکھئے یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام آلاتِ تجربہ آپ کے پاس ہوں! نہیں ہیں صرف عادی و معمولی نگاہ ڈال کر دیکھئے تو یہ چلے گا کہ اس تصویر کی چیزیں کتنا پیچیدہ اور دقیق نظام کا فرما ہے! اس سبب وہ سب موجود کے اندر باہر تمام ضروری آلات و وسائل موجود ہیں مثلاً نظامِ ہضم، گردشِ خنہ، سہلہ، اعصاب، دستگاہِ نفسی، یہ ساری کی ساری چیزیں اس میں موجود ہیں۔ اس کے اندر ایک باقاعدہ آراستہ تجربہ گاہ موجود ہے جو بڑی دقت و سرعت کے ساتھ اپنے ضروری مواد کو اکٹھا و مہیا کر رہی ہے۔ آپ کی بڑی بڑی تجربہ گاہیں کس قدر ہیں؟ اور ان کے بننے میں انسانی، مگر، یا اقتصادی، طاقتیں کتنی صرف ہوئی ہیں؟

اپنی تجربہ گاہ کا اس پھر کے تجربہ گاہ سے مقابلہ کیئے تو پہلے چلے گا کہ آپ کی تجربہ گاہ میں وہ دقت و سرعت و طرفت برگز نہیں ہے جو پھر کے تجربہ گاہ میں ہے۔ کتنے غور و فکر اور تجربوں کے بعد ایک پھر کے کاٹنے کا علاج تلاش کیا گیا ہے یہ سب لوگ جانتے ہیں۔

اگر آپ کوئی کام انجام دینا چاہیں تو اس کے لئے ہر طرح کی مکر و دقت نظر ضروری ہوتی ہے تو پھر جب آپ اس عالمِ مصنوع میں اس دقت و مہارت کے ساتھ اس نظامِ حکیم کو ملاحظہ فرماتے ہیں تو کیا یا بے عقلی محنتِ لایعنیہ بالغذکی سہہ نہیں ہے؟

اگر ہم اس کائنات کو جس میں ہر ایک مینی، ہندسہ، اور منظم حرکت ہے — ایک مادہ جا ہلکا مخلوق یا مین تو کیسے ہی علمی معرفت کی دیں ہے؟ بلکہ ہم قصین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیزیں ایک مکمل نظم و ضبط کا پتہ دیتی ہیں نہ کہ ان سے بے مقصدیت ہر جہ و مرجع صے نظم کا ثبوت ملتا ہے۔

اگر طبیعت میں کبھی ضعف، نفاذ دکھائی دے تو یہ کتاب خلق الہی میں نقص کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کی

وہ ہمارے افکار و ادراک کی مقصدِ اصلی تک نارسائی ہے اور عالمِ اسرار و رموز کے سمجھنے سے ہماری عقلوں کی کوتاہی ہے۔

اگر ہم ایک عظیم دستگاہ میں ایک چھوٹے سے بیچ کے مقصد کو نہ سمجھ سکیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم انجینئر کو نادان و جاہل کہنے لگیں بلکہ دراصل یہ جاہل کوتاہی ہے کہ ہم اس بیچ کے مقصد کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیا تصادف و اتفاق فریضہٴ علم کو پورا کر سکتے ہیں؟ اور علم بھی ایسا کہ جہاں ذہن برابر جہالت و شک کا شائبہ بھی نہ ہو! اگر قیوں مادہ پرست و کائنات جس میں ایجاد و اختراع کی ہر موجود میں بھرمار ہے اس کا خالق ایسا مادہ ہے جس میں علم و ارادہ کا کوئی دخل ہی نہیں ہے تو پھر انسان اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت تخیلِ عظیم میں کیوں لگا آئے؟ اسکو تو چاہئے کہ طبیعت و فطرت کے ساتھ رہ کر مزید جہالت میں اضافہ کرے۔ جو حقیقت اس قدر غریب اور بے انتہا منظم اعمال و انفعالات کی ہدایت و رہبری کرے اس کے ارادہ و ہدف کا انکار ناممکن ہے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ گمان کر لیا جائے کہ مسلسل ان افعال و انفعالات کا تحقق الہی ارادہ کے بغیر ہے۔

سالہا سال کے تھکا دینے والے علمائے گیمائے پروگرام اور لاکھوں تجربات کے بعد یہ حضرت اس قابل ہوئے کہ بہت تھوڑے سے آئی و آزمائشی مواد کو بہت ہی سادہ و ابتدائی طریقے سے اس طرح پرکھ دے سکیں کہ میں میں حیاتِ کامی کا تھوڑا سا بھی اثر نہیں ہے۔

اتنی سی علمی کمیابی کی بڑی اہمیت دی گئی اور مجالسِ علیم میں اس کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مگر کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ موجود بہت ہی نامعلوم اور بالکل ہی ابتدائی تجرباتی وعد میں اتفاق سے ہو گیا ہے اس میں کسی وقت و زمانہ و توجہ کو دخل نہیں ہے۔ لیکن یہی مادہ پرست علمائے تمام موجوداتِ اندھے مادہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں یہ کتنی عجیب بات ہے واقعہ یہ ہے ایسا طریقہ فکر منطقی و افکار و عقلِ انسانی پر مبنی علم ہے اور حقیقت سے دشمنی ہے۔

ذرا چھاپہ خانہ میں دیکھئے کہ کتاب کے ایک صفحہ پر حروفِ چینی کونے میں کتنی زحمت اور وقت سے کام لیتے ہیں لیکن اس کے بعد بھی جب دوبارہ تجدید نظر کرتے ہیں تو بعض غلطیاں مل جاتی ہیں جو معمولی سی غفلت کی وجہ سے

ہوگی تھیں اب اگر حروف حینی کرنا یا مختلف حروف کو یک ترتیب وار لگانے کے بجائے کسی چیز میں
سارے حروف اکٹھا کر کے صفحہ پر ایک مرتبہ الٹ دے تو کیا حروف و کلمات و معانی کے لحاظ سے پورا صفحہ
بغیر کسی غلطی کے مرتب و منظم ہو کر ہمارے سامنے آسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ناممکن ہے۔

اس سے بھی زیادہ کمزور بات اسی شخص کی ہے جو یہ کہے: ایک نوئی سے پچھلا ہوا ناظر تیار
سو کو گرا اور اس سے خود بخود حروف بن گئے اور پھر ایک اندھی چلی جس سے ایک معدنی صفحہ پر یہ حروف
ترتیب وار خود بخود جم گئے اور اس طرح ایک ہزار صفحوں کی کتاب جو دقیق علمی مباحث اور شیریں وجد اب
مبارت پر مشتمل تھی بغیر کسی نقص و کمی کے وجود میں آگئی۔ کیا کوئی بھی صاحب شعور اس نظریہ کو قبول
کر سکتا ہے؟

یاد رہے کہ ہم فطرت کے ان حروف سے بنی ہوئی مختلف و متنوع تصاویر کے بارے میں
کہہ سکتے ہیں؛ اور آسمانی کرات اور طبعی موجودات اور تمام متحرک سیاروں کے بارے میں یہ مادہ پرست
کیہ کہتے ہیں؟

تھور فورد RUTHERFORD ایک مشہور عالم کہتا ہے: کاربن، آکسیجن، آزت اور ہیدروجن کے
ذرات کا دقیقہ پرور یعنی وسعت کے لئے جمع ہونا ناقابل تصور ہے۔ اسکی مثال ایسی ہی ہے کہ تہ نش
کے پتوں کو فضا میں اڑا دیں اور پھر کہیں کہ یہ مینہ پر خود بخود ترتیب کے ساتھ آکر جمع ہو گئے یہ تعصا
محال ہے۔ اور اگر یہ عمل بشریت کے چوٹ، تاریخ میں دوسرے تریا یک کھنڈ کے لئے بھی دہرایا
جاتا ہے تو طبیعت میں غلطی ہوئی ہوگی۔

کیا حروف تکوین — اتم اور ایٹم کے ٹکڑوں و بندہ اجزاء — کی امیرت چھاپنا نہ کے
حروف کے گم تر ہے؟ کیا یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے کہ یہ منظم و پر منف حروف اور یہ دقیق بندہ — اور
تو بے فطرت گریہ یہ انتخاب تصویر یا مادہ بادی کی پیدا کردہ ہیں؟ اور اس کا کائنات میں ایک منظم

نے ان کی چھاپنا ہی ہے تو پھر کون سی دلیل ہوئی ہو گی کہ ان کی کھپائی اور خارج ہونے والی ہوا کو آزت کہتے ہیں۔
تو اس نتیجہ پر پہنچاں ہم

حالت اور مجزاء نظام کے خالق کا وجود نہیں ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! بلکہ یہ تمام موجودات ایک قدرت کا مدد کی مخلوق ہیں جس کو ہم خدا کہتے ہیں!

مادہ کے باطن میں جو قوت و دیوت کی گئی ہے اگر یہ اس عقل کل کا اثر نہیں ہے جو اس کائنات کا کما کما ہے تو ہر کوئی چیز ہے جو وہ کو اتنا منقبض اور منبسط رکھے ہوئے ہے؟

اگر وہ طاقت ایک ہی عقل عامل اور قادرِ ارادہ آگاہ نہ ہے تو یہ مردہ بنے نفی میں کیوں نہیں داخل ہو جاتا؟ اور ان مواد کی تشکیل و ترکیب کو تصادم و نابودی کی طرف کیوں نہیں لے جاتا۔

یقیناً ایمان بالہذا ان تمام وجودات کے لئے معنی عطا کرتا ہے اور تمام عالم کے لئے مفہوم و معنوی بخشتا ہے۔ صاحبِ عقل اور فکرِ عیش رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اس کائنات میں ایک عظیم قدرت معلق ہے جو ان موجودات پر ناکم ہے اور اس نظام کو افراد و تفریق سے بچاتے ہوئے ہے۔

موجود مطلق کا تصور

پچھلے زمانہ میں ہر شخص بذات خود اپنے مرکوب کی ہدایت کرتا تھا اور اپنے کنٹرول میں رکھتا تھا اور انسان اوپر مختلفہ میں اس بات کا عادی ہو چکا تھا کہ اپنی زراعت، زمین، ادارہ کی خود دیکھ بھال کیے۔ لیکن آج زمانہ بدل گیا ہے آج کا انسان چاند تک پہنچ گیا ہے۔ آٹومیک انرجی مشینیں، ایئر ٹیلیٹ کے اڑنے والے ہوائی جہاز اس کے دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ ہر منٹ جاتا ہے کہ ایسے آلات بنائے جاسکتے ہیں جو حوادث کا خود بخود مقابلہ کر سکیں اور اس کا بنانے والا اور چلانے والا چاہے سامنے نہ بھی ہو۔

جب یہ صورت حال ہے تو پھر ہم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم خالق کائنات کا صرف اس لئے انکار کر دیں کہ وہ ہم کو دکھائی نہیں دیتا۔ یہ تو ہمارے افکار و افہام کی کمی ہے اس سے وجود خدا تو متاثر نہیں ہوتا؟

اگرچہ ایک بہت ہی ناقص تشبیہ ہے مگر افہام مقصد کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ مصنوعی چاند بنانے والا یا راکٹ بنانے والا زمینی اسٹیشنوں سے ان کو فضا میں چلاتا ہے اور خود زمین سے کنٹرول کرتا ہے۔ دیکھنے والے راکٹ و چاند کو دیکھتے ہیں، کنٹرول کر نیوال دکھائی نہیں دیتا دینا تشبیہ، اسی طرح خدا نظام کائنات کو چلاتا ہے۔ مگر ہم دیکھ نہیں سکتے: ہم جن خواہش آیت برآت کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ چیزیں خالق عالم اور صانع انسان کی عظمت کے آثار ہیں تو کیا اس مشاہدہ کے باوجود ہمارے لئے ممکن ہے کہ اس کائنات کے مدبر کا انکار کر دیں کہ جو صاحب قدرت اور ارادہ مطلق ہے اور جو اس کائنات کے تمام حرکات کا منظم کر نیوالا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ ایسے موجود کا پہچانا جس کا سرعہ حس اور اقیسم شعور میں کوئی

نور و مثال نہ ہو اور بشری تعبیرات اس کے وصف دقیق کو بیان کرنے سے عاجز ہوں۔ ہمارے ناممکن ہے کہ چونکہ ہمارے امکانات محدود ہیں اور چراغ عقل اس راستہ کو روشن کرنے سے بھوتہ ہے اسکی روشنی مادہ کے محدودیات کے دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آتی ہے۔

ہمارے ارتباطات صرف ظاہر حیات تک محدود ہیں جو صورتِ خارجہ ذہنوں میں قلم ہوتی ہے وہ اس کائنات کی کوئی نہ کوئی عین ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم کسی طرح بھی اس کی معرفت حاصل ہی نہیں کر سکتے۔ جو معرفت ہمارے لئے لازم ہے اس میں اور چارے درمیان کوئی مانع موجود نہیں ہے۔

یہ شک پسند افراد جو اس فکرِ سیم سے "خوفِ فطرتِ سیم سے پیدا ہوتی ہے" اعراض کرتے ہیں اور جو آثارِ طبیعت کے خواگر ہو چکے ہیں وہ ہر وقت خداوندِ عالم کی طرف سے اظہارِ معجزہ کا انشاء کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ معجزہ کے ذریعہ خدا پر ایمان لائیں اور اس کے وجود کے قائل ہو جائیں۔ مگر یہ لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ خدا کی طرف سے جتنے بھی آثار ظاہر ہوتے ہیں وہ تھوڑی ہی مدت کے بعد عادی ہو جاتے ہیں اور فطری بن جاتے ہیں جنکی طرف کوئی توجہ بھی نہیں دی جاتی۔ تمام ظاہر — اگرچہ وہ نظامِ طبیعت کے اجزاء ہیں — ابتدائیں خوارق و معجزات معلوم ہوتے ہیں لیکن جتنا جتنا دور گزرتا جاتا ہے وہ عادی اور طبعی ہوتے جاتے ہیں۔

لیکن وہ وجود جو غیر محسوس اور غیر مرئی ہو اور جو صفاتِ جلال و جمالِ قداس و عظمت سے ملو ہو وہ ہمیشہ محسوس کو تحتِ تاثیر قرار دیتا ہے اور اپنی طرف ہر اتمامِ توجہ کو جذب کر لیتا ہے اور انسان کو ایسا بنا دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسکی طرف توجہ رہے اور ہر چیز کی امید اس سے وابستہ کیجے البتہ لمحات و داور کی روح کا تسلسلہ غیر منطقی بنیاد پر انسان کو محدودیت کی ذنجیروں میں گرفتار کر دیتا ہے۔ ورنہ اس نظامِ کائنات میں ہر موجودان لوگوں کو قانع کر سکتا ہے جو اپنی حقوں کو لمحات اور مکاہرہ سے خالی رکھیں۔

ELMER W. MAURER ڈاکٹر رائمز ڈیپو میورا جو بہت ہی مشہور اور محکم کیا کے ہر

تھے، کچھ ہیں، وہیں ایک عالم کھیا ہونے کے نڈے اس بات کا عقیدہ رکھتا ہوں کہ خدا کائنات کی ہر شے نگرانی اور حفاظت کرتا رہتا ہے اور قوانین فطرت کے دائمی ہونیکا سبب ہی الہی نگرانی ہے۔ میں جس وقت اپنی تجربہ گاہ میں قدم رکھتا ہوں۔ بلیک کسی شک کے نزدیک اس بات کا عقیدہ رکھتا ہوں کہ جو قوانین کل تک ثابت تھے وہ آج بھی ثابت ہیں۔ اور کل و برسوں بلکہ قیامت تک ثابت رہیں گے ورنہ تجربہ گاہ کے اندر میری زندگی حیرت و شک فطری و اضطراب کی زندگی ہو جائے۔ اور ہم کسی بھی نتیجہ تک نہ پہنچ سکیں۔ مثلاً اگر میں اپنے تجربہ گاہ میں ایک برتن کے اندر پانی بھر کر آگ پر رکھ دوں تو جب اس میں جوش آجائے تو مجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی حرارت سو درجہ سنٹی گریڈ پر پہنچ گئی ہے اور مجھے کسی حرارت ناپنے والے آلہ کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جب فضا کا دباؤ ۷۶۰ سنٹی میٹر جیوے پہنچ جائے تو آب خالص سو درجہ سنٹی گریڈ میں ہو چکے کہ جوش کھانے لگتا ہے اور اگر دباؤ ۷۶۰ سنٹی میٹر جیوے سے کم ہو تو پانی کے جوش میں آنے اور بخار بن جانے کے لئے کم حرارت کی ضرورت ہوگی اور جوش کھ جانے کے لئے درجہ حرارت صد درجہ سے کم ہوگا اور اگر فضا کا دباؤ ۷۶۰ سنٹی میٹر سے زیادہ ہوگا تو درجہ حرارت بھی سو سے زیادہ ہوگا۔

اور میں جب بھی جانتا ہوں اس تجربہ کی تکرار کرتا ہوں اور عملائے کیا جب بھی دباؤ اور حرارت کے رابطہ کو اپنے روزانہ کے کاموں میں اپنی ذہانت اور ہوش سے استعمال کریں گے تو ان کی حیرت میں اضافہ ہی ہوگا۔

یہی سورت تمام قوانین صیغت کی ہے اور صحیح منطق فیصد کرتی ہے کہ یہاں پر کوئی ایسا مبرا ضرور موجود ہے جس نے ان قوانین کو ایسی دیکھا ہے اور وہی خدا ہے۔ اس صیغت کی صفت اور اس کے ثابت و مستمر نظام کا صحیح جواب صرف خدا کے وجود کا عقیدہ ہے۔

لہ جیوے ایک مخصوص مائع ہے جو میزان حرارت میں استعمال ہوتا ہے ہولکے دباؤ کے لحاظ سے اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے اس کو پارہ بھی کہتے ہیں۔ ثبات وجود خدا ص ۲۶۹

خدا علت سے بے نیاز ہے

خدا علت سے بے نیاز ہے اس مسئلہ میں بیروانِ مکتبِ ہادی مخصوصِ حساسیت کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: جب ہم نے یہ مان لیا کہ کائنات میں واجب الوجود صرف اللہ ہے اور دیگر تمام موجودات اپنے وجود میں اس کی مدد چاہتے ہیں تو خود خدا علت سے کیوں بے نیاز ہے یعنی اس کے وجود کی علت کیا ہے؟

برٹرانڈ رسل (BERTRAND RUSSEL) نے لندن میں ایک غیر مذہبی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا: میں اپنی عمر کی اٹھارھویں منزل میں استوارت میں (STAVART MILL) کی خود نوشتِ موافق حیات پڑھ رہا تھا تو اس میں میل کے ایک جملہ نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی اور وہ جملہ یہ تھا کہ میرے پاس میرے سوال ”مجھے کس نے پیدا کیا ہے؟“ کا جواب نہیں دیا کیونکہ میں نے فرما دوسرا سوال کر دیا تھا کہ پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟ یہ کہتے ہوئے رسل نے کہا: اسی سادہ سے جملہ میں آج بھی میں ٹھکر کرتا ہوں اور میرا خیال ہے اس جملہ نے بیانِ اولین علت و دلیل میں مضطرب کام لیا ہے کیونکہ جس طرح ہر چیز کے لئے علت و دلیل ضروری ہے پس وجودِ خدا کے لئے بھی علت ہونی چاہئے اور اگر کوئی چیز علت و دلیل کے بغیر وجود میں آ سکتی ہے تو وہ چیز خدا بھی ہو سکتی ہے اور دنیا بھی اور اس طرح یہ بحث فاقہ الاعقباء ہو سکتی ہے۔

افسوس یہ ہے کہ بہت سے خدا شناس مغربی فلسفی اس امکان کو حل نہیں کر سکے۔
ہربرٹ اسپنسر (HERBERT SPENCER) انگریزی فلسفی اس مسئلہ میں کہتا ہے: ممکن یہ ہے

کہ عقل بشر ایک حرف تو ہر چیز کی علت تلاش کرتی ہے اور دوسری طرف دور و قسطن کو محال مانتی ہے اور علت ہے علت کو بھی نہیں مانتی اور نہ سمجھتی ہے جیسا کہ پادری جب کچھ کو تعلیم دیتا ہے اور کہتا ہے : دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہے اور کچھ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا ہے ؟

اور دوسری جگہ لکھتا ہے : دھرمیوں کی کوشش یہ ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہوں کہ دنیا کا تائیم بذاتہ ہے اور اذلی ہے۔ لیکن ہم کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کر سکتے جو بے آغاز اور بے علت ہو۔ اور خدا پرست اس سلسلہ میں ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہتا ہے : اللہ نے ہی دنیا کو پیدا کیا ہے اور جب کچھ سوال کرتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا ہے ؟ تو یہ لا جواب ہو جاتا ہے۔

ہم بھی اعتراض وہ پرستوں پر کرتے ہیں کہ اگر ہم سلسلہ کا تتبع کریں تو علت اولی تک پہنچیں گے ہم یہ نہیں کہنے کہ علت اولی خدا ہے بلکہ وہ ہے اب تم بتاؤ مادہ اولی کو کس نے پیدا کیا ؟ تم لوگ فون صیت کو قبول کرتے ہو اس لئے مجھے بتاؤ کہ ہر چیز تو وہ اولی سے ہے مگر یہ مادہ اولی کہاں سے آیا ؟

تم کہتے ہو مجدد حوادث کی بازگشت ، وہ اور طاقت اولی کی طرف ہے ؛ ہمارے سوال کرتے ہیں : اس مادہ اور طاقت اولی کے وجود کی علت کیا ہے ؟ اور سلسلہ اصل و معانی الی عالم نہایت کو کہاں ہوتے ہوئے ایسے ہیں اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں ہے کہ وہ کہیں : مادہ موجود انٹی ڈیپک ہے اس کو علت کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس کا اون ہے نہ آخر یہ مادہ قدیم ہے اس کی انتہا نہیں ہے اور اس کا وجود ذاتی ہے۔

پس ہادی حضرات اصل ازیئت کے قائل ہوں گے اور ان کا عقیدہ ہو گا کہ تمام چیزیں مادہ اذنیہ سے ہیں اور ہستی اس کی صیغیت سے ہوئی ہے ، اس کو کسی موجد خالق کی ضرورت نہیں ہے۔

نہ پر حرکت نہ لہو ۱۹۷۵

لہو ۱۹۷۵ء میں دارالافتاء ۲۷

رسل (RUSSFL) نے اپنی تقریر — جس کا ذکر ابھی کچھ پہلے ہوا ہے — میں کہا ہے: ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے یہ چرچے کہ دنیا کی ابتدا تھی یا اس کا اول تھا۔ ہر چیز کی ابتدا کا ہونا ضروری ہے اس موضوع پر غور و فکر کرنا درحقیقت ہمارے تصورات کی قدرت میں نقص دہی ہے۔

جس طرح رسل مادہ کو ازلی مانتے ہیں اسی طرح خدا پرست اللہ کو ازلی مانتے ہیں پس وجود ازیت کا قوں خدا مادہ کی ذاتی کے درمیان نقطہ مشترک ہے اور دونوں گروہ یکساں حوسے علت اولیٰ کو قبول کرتے ہیں پس فرق اتنا ہے کہ خدا پرست علت اولیٰ کو حکیم مدبر قادر، مرید مانتے ہیں (یعنی فعل اور مادی حضرات علت اولیٰ کو بے قص و بے ادراک مبدء ارادہ مانتے ہیں لہذا اگر خدا کو نہ بھی مانا جائے تب بھی ان کے باقی رہتا ہے۔

مادہ محل حرکت و تغیر ہے۔ اس کی حرکت اندرونی ذاتی اور دنیامیکی ہے اور ازلی چیز حرکت ذاتی کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتی۔ مادہ اور ثبوت ذاتی دو الگ الگ چیزیں ہیں ایک جگہ پران کا بیج ہونا محال ہے جو چیز ذاتی حور سے ثابت الوجود ہے اس کی ہویت و ذات کا محل قبول حرکت ہونا ناممکن ہے۔

مادسی (MARXIST) خود معترف ہیں کہ مادہ خود اپنی نفی کرتا ہے (ذاتی تناسل) پھر اس کو یہ لوگ کیونکر ازلی مانتے ہیں؟ ازیت کا مطلب ثبوت ذاتی اور (امتناع انفاء سے محافطہ مادہ بذات خود نسبی استعدادات اور قوئی کا مالک ہے اور مردہ و زندہ ہوتا ہے۔ ازیت کسی بھی طرح مادہ کے مناسب نہیں ہے نہ اس کے وجود میں اور نہ لوازم ہیت میں۔ لیکن مذاپرست

۱۔ چارمسیسی سیم ص ۷

۲۔ مادہ حضرات کا تفسیر کہ نہ پر علم جہاں اے ہستی کی تفسیر تو ذاتی تناسل و سنختر کی بنیاد پر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اصولی بغی علت سے وجود میں آتا ہے اور اصول اپنی علت کی نقیض ہوتا ہے۔ اور اس کی مثال مٹی کے ٹکڑے اور اس کے پچے سے مٹی پر ہے۔

جب اصل ثابت معلق کے وجود کے قائل ہیں تو ان کا یہ دعویٰ اس وجود کے لئے ہے جو ثابت مطلق کو قبول کرتا ہے اور خصائص مادہ سے بالکل بعید ہے۔ ان کا دعویٰ مادہ کے لئے نہیں ہے جو جمعی طور سے بقا کو قبول نہیں کرتا اور نہ ازلیت و دوام ہی قبول کرتا ہے۔ اور جو نسبت و حرکت سے جدا نہیں ہوتا اور فعلیت تام و اطلاق سے معافیت رکھتا ہے۔

ہر موجود محتاج علت ہے۔

ہم جو کہتے ہیں کہ کسی موجود کا وجود علت کے بغیر ممکن نہیں ہے اس کا مطلب وہ موجود ناقص ہے جس کی میسر و بقا ضرورت علت ہے۔ یہ قاعدہ ہر موجود کے لئے نہیں ہے یعنی اگر کوئی موجود نقص و محدودیت سے پاک ہو اور بذات خود واجبہ واقعیت ہو تو اس کے لئے یہ قاعدہ نہیں ہے۔

علت اولیٰ صرف اس لئے علت اولیٰ ہے کہ اس کا وجود کامل و غیر محدود ہے اور کسی عام سے متاثر نہیں ہے بلکہ وہ ایک غیر مشروط وجود ہے اور ہر قسم کے علاقہ و رابطے مستغنی ہے غیر و نحوں کا اس میں کوئی اثر یا تکلیف نہیں ہے۔

لہذا کے علت اولیٰ اور علت سے بے نیاز ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ متعلق الیٰ اللہ ہونے میں تمام موجودات کا مساوی ہے لیکن اس قانون سے بعوض استثناء و تخصیص اس کو الگ کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ معدوم ہی نہیں ہے تاکہ کسی علت کا محتاج ہو۔ اور نہ وہ حادث ہے جو کسی محدث کا محتاج ہو بلکہ تمام صور و خواہر و حوادث اسی موجود اذلی سے موجود ہوئے ہیں۔ قانون علت صرف ان موجودات کے لئے ہے جو مسبوق بالعدم ہوں۔

اسی طرح علت اولیٰ کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اسی نے اپنے کو پیدا کیا ہے اور وہ خود ہی اپنی ذات کی علت ہے۔ ہمیشہ مسنون کے متعلق الیٰ العلۃ ہر نیک سبب اس کے نوع وجود و کیفیت کے تابع ہوتا ہے۔ اور کوئی بھی موجود اپنے وجود کے لئے علت کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ علت کی ضرورت اسی لئے ہوتی ہے کہ اس کا وجود دوسرے سے متعلق و مرتبط ہوتا ہے ورنہ موجود غیر مشروط دوسرے غیر مرتبطہ قانون علت کے دائرہ باہر ہو کر رہے۔

اس توفیق کے بعد اب اگر کوئی موجود اپنے کمال اور غنائے ذاتی کی بنا پر علت سے بنے یا نہ ہو تو علت نے اسکو اس مرتبہ میں ہرگز قرار نہیں دیا جس میں وہ ہے اور نہ ہی کوئی علت اس میں دخلت کر سکتی ہے۔ علت اولیٰ کا وجود عین ذات ہے۔ بخلاف دوسرے وجودات کے ان کا وجود بطور افاضہ و عارضیت ہے۔ خروج من العدم الی الوجود ہی علت کا محتاج بناتا ہے۔

اور یہ کیونکر تصور کیا جاسکتا ہے کہ وجود خدا کا عقیدہ ناقض میں پھنس جانا ہے اور اگر ایسا تو کیا کسی معنوں کے بے علت ہونے کا عقیدہ (جیسے وہ) ناقض میں پھنس جانا نہیں ہے؟ ہم ایک ایسی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں کی ہر شے معرفتی تغیر و تحول و فنا میں ہے اور فنا و مقہوریت اس عالم کے تمام اجزاء کا مقصد بن چکی ہے۔ فقر و استیاء الی اخیر ہمارے نفوس کے گہرائیوں میں جڑ چکے۔ زمین و آسمان کے تمام موجودات میں بھی فقر و نیاز کا دور دورہ ہے اور یہ احتیاج ہمارے سراپائے ہستی پر محیط ہے کیونکہ ہمارا وجود ذاتی نہیں ہے اور ہمارا وجود ہماری ذات سے نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم نہ تھے پھر ہم کو لباس وجود پہنایا گیا تو ہو گئے۔ اور بدون شک ایسے موجودات کی پیدائش ذات ہستی بخش سے ربط پیدا کئے بغیر غیر ممکن ہے۔

البتہ ازلی وابدی واجب الوجود جس کا وجود ذاتی ہے جس کا نہ اول ہے نہ آخر اس علت کی ضرورت نہیں ہے۔

فصل میں علت کے معنی ایسی چیز کے ہیں جو کسی شے کو عدم سے وجود میں لائے اور ایسی ہستی پنہائے اور مادی علتوں میں اس کی قدرت نہیں ہوتی اور مادہ کا کام صرف اتنا ہے کہ پہلی صورت کے ختم ہونے کے بعد نئی صورت کے قبولیت پر آمادہ ہو۔ یہ درست ہے کہ موجود مادی اپنی ذاتی تحول و تغیر کی بنا پر ہر لحظہ ہویت چہ دیدہ پاتا ہے جو سابقہ سے مختلف ہوتا ہے مگر یہ ذاتی حرکت اور مسلسل جدت و نواں ہمیشہ دست حرکت آخری کا محتاج بنا رکھتا ہے۔ ایسا دست حرکت آخری جو کالبدان شتا بندہ کائنات کو برہوں سے اگاتا ہے اور فنا و وجود کو آگے بڑھاتا ہے۔

سلسلہ علل کا متبع

اگر مادی حضرات حقیقت کا انکار کریں اور ایک دوسرے مغالطہ کا سہارا لیکر کہنے لگیں کہ ہم سلسلہ علل کو کسی جگہ پر روکتے ہی نہیں اور لامتناہی حد تک اس کا سلسلہ باقی رکھتے ہیں تو اس مغالطہ کا جواب اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ جہاں آفرینش کا اس طرح تحلیل و تجزیہ کرنا وہی علت و معلول کے تسلسل کو قبول کرنا ہے کیونکہ ہر ایک کا ذاتا معلول ہونے کا مطلب فاقہ الوجود ہونا ہے اور علت فوق کے بغیر ان میں سے کوئی بھی دارائے وجود نہیں ہے۔ لہذا اس سلسلہ کے اجزاء فوفاً فوقاً محتاج و فقیر ہوں گے تو وہ (بغیر علت) عدم سے وجود کی طرف کیونکر آئیں گے اور خود ان اشیاء کا وجود جو مظاہر حدوث و عجز ہیں کہاں سے ہوا؟ اور غیر متناہی اعداد کے اجتماع سے اتنے بڑے موجودات کا مجموعہ کیونکر حاصل ہوا؟ کیا بے شمار عوامل مرگ کے اجتماع سے زندگی پیدا ہوا کرتی ہے؟

حالانکہ لامتناہی سلسلہ چاہے جتنا آگے بڑھ جائے یہ معلول ہونے ہی کے حکم میں رہے گا تو پھر تہیٰ طود پر ہمیشہ محتاج و فقیر و حادث رہے گا۔ اور یہ طے شدہ امر ہے کہ کوئی بھی سلسلہ جب تک ذاتی طود پر مستقل و غنی نہ ہو یا غنی بالذات المطلق — یعنی وجود الہی — تک نہ پہنچے نہ ہو وہ کبھی موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ (صرف وجود الہی ہی ایک ایسی علت ہے جو غیر معلول کے ہے بشرطیکہ یہ تعبیر صحیح ہو) اور نظام موجودات کی کبھی بھی صحیح تفسیر ممکن نہیں ہے جب تک ایک ایسے موجود کو نہ مانا جائے جو غیر مشروط ہو اور وہی علت العلل ہو اور تمام موجودات کے وجود کی بنیاد۔

فرمائیے محاذ جنگ پر فوجیوں کی ہر گز مادی حملہ کرنے سے انکار کر دے اس طرح کہ

جب جنرل کسی نگرانی کو حملہ کر نیا حکم دے تو وہ کہے جب تک فلاں نگرانی حملہ نہ کرے گی ہم حملہ نہیں کریں گے اور جب جنرل اس نگرانی سے کہے تو وہ اس پر نال دے کہ جب تک یہ حملہ نہ کرے گی ہم بھی نہ کریں گے یہی حال سب کا ہو تو کیا حملہ ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ ہر ایک نے دوسرے کی شرط لگا رکھی ہے اور ظاہر ہی بات ہے کہ مشروط حملہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک شرط پوری نہ ہو جائے اور شرط پوری ہو نہیں سکتی لہذا حملہ بھی نہیں ہو سکتا۔

بالکل اسی طرح اگر سلسلہ علت و معلول کو غیر متناہی مان لیا جائے تو چونکہ ہر ایک کا وجود دوسرے کے وجود پر موقوف ہے اور وہ دوسرا بھی اپنی جگہ تیسرے پر مشروط و موقوف ہے ورنہ تو درحقیقت ہر ایک اپنی جگہ سے یہ جدا بلند کر رہا ہے کہ جب تک وہ دوسرا موجود نہ ہو گا میں بھی لباس ہستی نہ پہنوں گا۔ پس یہ سب کب مشروط ہیں اور شرط کا تحقق ہو نہیں سکتا لہذا ان میں سے کوئی بھی جوڑ نہیں ہو سکتا۔

لیکن جب ہم کائنات کو موجودات سے بھری دیکھتے ہیں تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کائنات میں ایک ایسی علت ضرور ہے جو دوسرے کی معلول نہیں ہے یا ایک ایسا شرط ہے جو مشروط نہیں ہے۔

اور وہ علت اولیٰ تمام صور موجودات سے غنی بالذات ہے۔ عجیب و غریب حوادث پر قادر ہے۔ خلاق و فاعل ہے جب چاہے پیدا کیا اور وہی ذات تمام اجزائے حیات کو وجود بخشی ہے اور اپنے مقصد کے لئے عظیم نظام خلقت کو باقی رکھے ہے

ہادی مذہب کے پیروکار یہ چاہتے ہیں کہ عالم کو قدیم مان کر اس پھر سے دست بردار ہو جائیں کہ کائنات ایک فاعل کی محتاج ہے۔ اور ان طرح وہ کائنات کو مفہوم متقل بنا دیں۔ حالانکہ کائنات کو قدیم مان کر بھی وہ اپنے حسب منشاء نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ کائنات اپنے ابتدائے وجود میں خالق کی محتاج ہے اور جب پیدا ہو گئی تو کسی خالق کی ضرورت نہیں ہے۔ مخلوق ہونے کے بعد کائنات اور اللہ دو الگ الگ مفہوم متقل ہوں گے ایک کو دوسرے سے کوئی ربط نہیں ہوگا۔ اسی لئے ان کی ساری کوششیں یہ ہے کہ کائنات کے احتیاج اول کو ختم

کر دیا جائے اور اسی طرح وہ اپنے زعم ناقص میں خلقت و خالق کے مسئلہ کا حل ڈھونڈھ لکالیں گے ۔ اور یہ ثابت کریں گے کہ عالم قدیم ہے وہ خدا کا محتاج نہیں ہے ۔

مگر ایسا نہیں ہے بلکہ پیدائش کے بعد کے کائنات اور کائنات کا ہر ذرہ ہر وقت حادث ہے اور جب سارے اجزاء ہر لحظہ حدوث سے متصف ہیں تو مجموعہ بھی حادث ہوگا کیونکہ مجموعہ اپنے اجزاء کے صفات سے الگ کوئی صفت نہیں رکھتا ۔ لہذا کائنات کے لئے ابتدائے خلقت میں جو اہمیت تھو موجود و مستمر ہے آج تک بھی اور ہر زمانہ میں بھی ۔ اور عالم کو قدیم مان کر اس کو خدا سے الگ کر کے مستقل ماننا ممکن ہے ۔

عالم حادث ہے۔

جس طرح انسان اعتماد زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنی قوتوں میں کمی محسوس کرتا ہے اور ایک نیا کس عمر کا چراغ بجھ جاتا ہے اسی طرح سے عالم بھی رفتہ رفتہ نئے کے گھاٹ اتر جائیگا۔

چونکہ کائنات خالی سے ابتدا مادہ کو جو ہر ازل کی فرض کرنا غیر ممکن ہے بلکہ کائنات کو بھی مخلوق اور حادث ماننا ضروری ہے۔ کیونکہ کائنات میں موجودہ طاقتیں وحدت نوعیت کی طرف گامزن ہیں۔ ذرات طاقتوں میں بدل رہے ہیں اور فعال طاقتیں ساکن و غیر فعال طاقتوں کی طرف بدل رہی ہیں اور جب طاقتیں ایسی طاقتوں کی طرف بدل جائیں گی جو واحد فی النوع کے مساوی ہیں تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ سکون اور سکون مطلق میں ڈوب جائیں۔ اسی لئے مادہ کو بعنوان ذات یا جو ہر ازل کی قبول نہیں کیا جاسکتا بلکہ مجہول کائنات کو مخلوق ماننا ہوگا۔

اصول تھرموڈائنامکس (PRINCIPLES OF THERMODYNAMICS) کی دوسری اصل جس کو فرسٹ لکھنگی "سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم کو یہ بتاتی ہے کہ چاہے ہم کائنات کی تاریخ پیدائش کو معین نہ کر سکیں مگر اس کائنات کی یقینی طور پر ایک ابتدا ہے کیونکہ کائنات کی حرارت رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہے جس طرح لوہے کا ٹکڑا چراگ میں رکھنے کی جیسے سرخ ہو گیا ہو باہر نکالنے پر رفتہ رفتہ اس کی حرارت کم ہوتی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کی حرارت فضا کی حرارت کے برابر ہو جاتی ہے۔

اگر کائنات کا کوئی نقطہ آغاز نہ ہوتا تو تمام وہ موجودہ ذرات جو ازل سے چلے آ رہے ہیں، بہت مدت پہلے انجم کی صورت میں تبدیل ہو چکے ہوتے اور کائنات کی حرارت نہ معلوم کب ختم ہو چکے ہوتے۔ کیونکہ مادہ برابر غیر مرئی اہم کی طرف بدلتا رہتا ہے جو مسلسل تھوڑے تھوڑے

کی منزل طے کر کے ایٹم بن جاتا ہے اور پھر اس کے بعد یہ مادہ اور اجزاء متناسب کی صورت میں کبھی نہیں ملتے۔ اصل دوم کے مطابق قابل استفادہ طاقت کے ختم ہونے کے بعد دوبارہ کیمیا کی فعل و انفعالات کا تحقق نہیں ہو سکتا۔ اور جب یہ معلوم ہے کہ کیمیا کی فعل و انفعالات دائمی ہے اور اس کو ارض پر زندگی مستمر ہے اور سورج کی وہ شعاعیں جو روزانہ تین لاکھ ٹن گرمی دار حرارت چمکے حبس سے خارج کرتی ہیں وہ بھی مستمر ہیں ان میں کوئی کمی نہیں ہے تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کائنات حادث ہے۔

سیارات و ستاروں کی موت سورج و کواکب کا نابود ہو جانا حدوث کی دلیل ہے اسی طرح موت و حیات موجودہ نظام کے حدوث کی دلیل ہے اور اس پر بھی دلیل ہے کہ عالم فنا اور انتہا کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں علوم طبعی مادہ کو قدامت سے خارج کر کے نہ صرف حدوث عالم کو ثابت کرتے ہیں بلکہ اسکی بھی گواہی دیتے ہیں کہ کائنات ایک معین وقت میں پیدا ہوئی ہے۔ پس یہ کائنات آغاز و ولادت میں ایک ماورائے طبیعت طاقت و قدرت کی محتاج تھی کیونکہ آغاز میں ساری چیزیں برابر تھیں ان میں کوئی تفاوت نہیں تھا تو کائنات کو حیات بخشنے میں کوئی خارجی طاقت ضرور تھی ورنہ ایکٹ محیط جس میں کوئی فعال طاقت نہیں تھی جس پر سکوت بلکہ سکوت مطلق چھایا ہوا تھا وہ کیونکر جنبش و حرکت میں آیا؟ ماننا پڑے گا کوئی خارجی طاقت تھی جس نے اسکو حرکت بخشی!

پروفیسر نوبل نے تجویز کرتے ہیں، آج کا مادہ پرست انسان دعویٰ کرتا ہے کہ ایک بے انتہا انفجار اور طوفان کی وجہ سے کائنات کی آفرینش ہوئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس سے پہلے انفجار کا ایندھن اور فضائے مطلق موجود تھی جس میں یہ عجیب حادثہ رونما ہوا ہے! دوسرے لفظوں میں پھر یہ ماننا ضروری ہو جائیگا کہ مادہ اولیٰ اور کائنات کے تمام موجودات مشابہت و تکرار کے ستارے، کہکشاں یہ سب پہلے سے موجود تھے اور یہ ایک حقیقت ہے جو علمی

فکری، روحی، ریاضی کے حساب سے ناقابل انکار ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ فضا میں منتشر اجزا اس انفجار کے نتیجے میں کیونکر ایک جسم معین میں داخل ہو گئے؟ اور یہ جرم نظم آیا کہاں سے؟ اور بعض بعض کے اوپر کیونکر ڈھیر ہو گئے؟

اسی لئے، جو لوگ کائنات کی اچھی طرح معرفت رکھنے کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں:

ہماری کائنات میں کوئی چیز ثابت نہیں ہے اور ہر چیز تغیر و تحول کی حالت میں ہے۔

نیز روح کی طرف توجہ کئے بغیر مادہ کی تعریف غیر ممکن ہے۔ روئے زمین پر زندگی کی چھوٹی سی حرکت بھی ایک قادر اور عالی حکمت واسلے کی مقدار کر دہ ہے جس کو پھر اتفاق کہا ہی نہیں جاسکتا۔

گران دقیق تقدیرات کی مقبول و مقبول نفسیر بقول 'انسٹائن' (EINSTEIN) بغیر وجود خدا مانے ہوئے ممکن نہیں ہے۔

میکینکس (MECHANICS) کہتا ہے: جو جسم ساکن ہے وہ ہمیشہ ساکن ہی رہے گا اگر اس میں حرکت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسی خارجی طاقت کے ذریعہ ہوگی جو اس جسم سے الگ ہو۔ ہمارے عالم مادہ میں یہ اصلی اور معتبر قانون ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بھی طرح صدق و اتفاق کے اہتمال کو قبول نہیں کرتے۔ اسی میکینک کی قاعدہ کی بنیاد پر ایک ایسی قوت کا، نا ضروری، جو خود تو مادہ نہ ہو۔ لیکن مادہ کو خلق کرے اور اس کو قوت و حرکت بخشنے تاکہ مختلف شکل و صورت کا وجود ہو۔ فرانکلین (FRANKLIN)۔ علم فزیاء کے بہت بڑے شہور عالم — نے خدا کے وجود پر ایک خوبصورت استدلال کیا ہے وہ فرماتے ہیں: بہت سے لوگوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ جہاں مادی کسی پیدا کر نیوالے کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن جو بات ناقابل تردید ہے وہ یہ کہ کائنات بہر حال موجود ہے۔

اب اس کائنات کے وجود میں آنے کی چار صورتیں ممکن ہیں :-

- ۱۔ کائنات کو صرف ایک خواب و خیال مانا جائے۔
- ۲۔ کائنات بفرگہ خالق کے خود بخود موجود ہو گئی۔
- ۳۔ کائنات قدیم ہے، اذلی ہے اسکی کوئی ابتدا نہیں ہے۔
- ۴۔ کائنات مخلوق ہے حادث ہے ایجاد کردہ ہے۔

پہلی صورت کا مطلب یہ ہے کہ دراصل کائنات کوئی چیز ہی نہیں ہے جس کو من کرنے کی کوشش کی جائے۔ سوائے مسئلہ میٹافزیکل فیئر — مسئلہ حیات بعد الموت — اور خود آگاہی آدمی مگر وہ خود بھی اس صورت میں خواب و خیال سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس پہلی صورت کی بنا پر ہمارے لئے یہ فرض کرنا ممکن ہے کہ بہت سی خالی ریلیں وحشی مافروں سے بھری ہوئی مفہوم ذہنی سے بنے ہوئے غیر واقعی چیزوں سے — جو غیر واقعی نہروں پر بنے ہیں — گزر رہی ہیں۔

دوسری صورت بھی پہلی صورت کی طرح بے معنی اور محال ہے اور کسی بھی اعتبار سے قابل توجہ نہیں ہے۔

اب تیسری صورت تو وہ تصور آفرینش کے ساتھ ایک جزد مشترک رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مادہ بے جان، جو طاقت میں عا ہوا ہو "یا شخص خالق دونوں ازل سے موجود ہیں اور ان دونوں تصویروں میں کسی میں دوسرے سے زیادہ آشکال نہیں ہے دونوں برابر ہیں۔ مگر قانون تھرموڈائنامکس (THERMODYNAMICS) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کائنات مسلسل ایک ایسی حالت کی طرف رواں ہے کہ جس میں تمام اجسام درج حرارت میں مشابہ ہیں اور پھر اس کے بعد طاقت کسی مصدر کے قابل نہیں رہتی ایسی صورت میں اس کہ پر زندگی محال ہو جائیگی۔ اگر کائنات کی کوئی ابتدا نہیں ہے اور یہ اذلی ہے تو اس پر اس سے پہلے موت و رکوہ حادث ہونا چاہئے تھا۔ چھٹے والا سورج، روشن ستارے، زندگی سے بھرپور زمین اس بات کے بہترین گواہ ہیں کہ کائنات کے لئے زمانی آغاز ہے جو عدم کے بعد ہوا ہے۔ اور اس کا آغاز

زمانہ کے ایک خاص لمحہ میں ہو رہے۔ لہذا عالم ہر حال مخلوق ہوگا اور اس کے لئے ایک علت کبھی
یا خالق اپنی عالم و قارمانا ہوگا جس نے اس عالم کو پیدا کیا ہے۔

انسان کی بے بسی اور محدودیت

اگر انسان تھوڑی سی گہرائی میں جا کر سوچے اور واقعات پر زیادہ وسیع النظری سے غور کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ جغرافیائے ہستی کی وسعت کے مقابلہ میں ہماری توانائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مسلسل اور انتھک کوششوں کے بعد نظام کائنات کے بارے میں انسانی معلومات صفر کے برابر ہیں۔ کیونکہ معلوم نے اگرچہ کافی ترقی کر لی ہے۔ لیکن ہمارے مہموالات اسٹے زیادہ ہیں کہ ہمارے معلومات کی ان سے کوئی نسبت ہی نہیں دی جاسکتی۔ شاید ہزاروں بلکہ لاکھوں انواع بشر اس دنیا میں آکر چلے گئے اور مستقبل میں نہ معلوم کتنے آئیں گے لیکن ہم کو ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ آج کے علماء جن چیزوں کو علوم و معارف سمجھ رہے ہیں اور تمام واقعات کے جاننے کا آلینہ خیال کر رہے ہیں وہ چند ان قوانین کا مجموعہ ہے جو کائنات کے کسی گوشہ سے متعلق ہے۔ اور ان تمام تلاش و جستجو و تجربہ کا حاصل صرف ایک چھوٹے سے روشنی نقطہ کا جان لینا ہے اسکی مثال یوں بھی ایک ایسے صحرا کے وسط میں جس کی انتہا معلوم نہ ہو شدید تاریک رات میں ایک چھوٹی سی شمع کی بہت ہلکی روشنی ہو اس سے جتنی دور کا علم ہو سکتا ہے اسی طرح اس کائنات میں انسانی معلومات کی حیثیت ہے۔

اگر ہم کھربوں سال پہلے چلے جائیں تو اب ہم کے غبار اس فضا کو چھپالیں گے کائنات کی عظمت کے سامنے اس سے بشر کی کمزوری کا اندازہ لگائیں۔ اور شاید یہ مدت عمر کائنات کے مقابلہ میں ایک لمحہ سے زیادہ نہ ہو۔ اس حال میں ہم انسانیت کے محیط عدم میں داخل ہوں تو اس عدم کے تاریک دریا میں انسان کی کوئی خیر و خیر بھی نہیں ملے گی۔

مختصر یہ کہ ہم نہ اپنے آغاز میکے بارے میں صحیح خبر رکھتے ہیں اور نہ آئندہ کی حالت سے

واقف ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے لئے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ہم تصدیق کر سکیں کہ زندگی صرف اسی کرۂ خاکی ہی میں منحصر ہے کیونکہ آج کے علماء منطقہ حیات کو بہت زیادہ وسیع خیال کہتے ہیں۔ اور کروڑوں بے شمار کرات جن کو ہم عظیم ترین دود بینوں ہی سے دیکھ سکتے ہیں "چیونٹی کے برابر دکھائی دیتے ہیں۔

کامیل فلاماریون (CAMILLE FLAMMARION) مشہور عالم اپنی کتاب "الْحَيَاةُ الْعَظِيمَةُ" میں عالم لامتناہی کی طرف ایک خیالی و فرضی سفر کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم اسی تیز رفتاری کے ساتھ وسیع فضا کی رفتار میں لپکتے ہوئے ایک ہزار سال، ایک لاکھ سال، ایک لاکھ سو سال، تین لاکھ سو سال، دس لاکھ سال سفر کرتے رہیں تو کیا اس عالم محسوس کے کنارے تک پہنچ جائیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں! وہاں تو ایک عظیم تاریک فضا ہے جس کا عبور کرنا ضروری ہے نیز جدہ پیدستار سے ہیں جو دوسرے آسمان کی انتہا میں چمک رہے ہیں۔ اگر ہم ان کی طرف عین تو کیا پہنچ جائیں گے؟.....

اس کے بعد چند صدیوں سال سفر کریں تو پھر وہی تازہ اکت فضا، شکوہ و غصہ جیہ عالم تازہ، جدید عالم، نئی زمین، نئی چیزیں، نئے موجودات کا سامنا ہوگا۔ اس کے بعد کیا؟... پھر وہی صورت حال افق بند نہیں ہوگا اور کوئی آسمان ہماری راہ روکنے والا بھی نہ ہوگا۔ ہمیشہ فضا، ہمیشہ خن، ہم نے کوئی راستہ طے کیا ہے؟ ارے ابھی تو ہم اسی نقطہ پر ہیں۔ نقطہ ابتداء میں! پس ہر جگہ مرکز موجودات ہے اور دائرہ موجودات کا کوئی محیط متوسط نہیں ہے۔ ہاں یہ عالم لامتناہی ہے جو ہمارے سامنے کھد ہے لیکن ابھی تو اس کا مطالعہ بھی شروع

نہیں کیا ہے۔ ابھی تو ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ خوف سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اس بے مقصد مسافرت سے تھک کر گر پڑیں گے۔ کہاں گر جائیں گے؟ ممکن ہے مدت ابدیت میں گر پڑیں؟ ابے! گرواب میں گر پڑیں بغیر اس کے کہ اس کی گہرائی تک پہنچیں جس طرح پہاڑ کی چوٹی پر نہیں پہنچ پاتے۔ یہاں جنوب ہو جائیگا۔ آسمان کون سا ہے؟ نہ مشرق ہے نہ مغرب نہ اوپر نہ نیچے نہ

نہائیں جس طرف بھی عالم کو دیکھتے ہیں ہر طرف سے غیر متناہی ہے۔ اس غیر متناہی مجموعہ کے اندر ہماری دنیا ایسی ہے جیسے جزیروں کے بہت ٹپے مجموعہ میں کوئی جزیرہ اور یہ جزیرہ بھی ایسے سمندر میں ہو جس کی انتہا نہ ہو۔ اور پوری بشریت کی عمر علم سیاحی و دینی ادوار کے ساتھ بلکہ تمام عظمت کے ساتھ ہماری زمین کی عمر ایک لکھ خواب سے زیادہ نہیں ہے۔

اگر انسان کے تمام تحقیقی آثار جس کو لاکھوں اور دانشمندوں نے لاکھوں کتابوں کے اندر تجزیہ کر رکھا ہے دوبارہ تجزیہ کر لیا جائے تو ایک بیکہ روشنائی اس کے لئے کافی ہوگی۔ لیکن اگر تمام کائنات کی موجودات خواہ وہ زمینی ہوں یا آسمانی ماضی میں رہے ہوں یا مستقبل میں موجود ہوں سب کو تجزیہ کر لیا جائے تو ممکن ہے روشنائی کے لئے دنیا کے سمندر کافی نہ ہوں گے۔

یہ وہ فیصلہ دیا جاسکتا ہے: اگر تمام کائنات کا تصور برکاس کرنا چاہو تو تم یہ سمجھ لو کہ اس کائنات کے اندر اتنی کھپکھپائیں ہیں کہ اگر زمین کے تمام ساحلوں کی ریگ اکٹھا کر لو تب بھی کھپکھپائیں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

نہ توڑائی میں ہے اگر زمین کے تمام درخت بچھڑا دیں ایک دیا کی سات دیاں صدیوں کے روشنائی بن جائیں تو کھات خدا تمام نہ ہوں گے (کھف/۱۱۶)

نہ وہ ہزار دانشمند جو کئے خدا کے بزرگ ص ۱۱۶

علمی دھوکہ بازی

مادی حضرات دعویٰ کرتے ہیں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں جو مادی مدرسہ قائم کئے گئے ہیں، انھیں کے فیصل میں اتنی علمی ترقی ہو پائی ہے۔ اور ڈیالکٹک تلمیذاتیں حق منطق ذریعہ سے وہ سبہ ہے جو مسلم کے پر بار درخت سے حاصل کیا گیا ہے۔

یہ لوگ فلسفہ مادی کے علاوہ ہر فلسفہ کو دہی اور غیر علمی جانتے ہیں اور اپنے مدرسہ مادی کو علمی مدرسہ خیال کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حیات بعد الموت کے مسئلہ سے اعراض ہی حقیقت ہے۔ اسی طرح حسی و تجربی منطق اور مادی فلسفہ کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں ہے۔

لیکن یہ دعویٰ مبنی بر تعصب ہے اور ایسے نظریات پر قائم ہے جو بے بنیاد و بے دلیل ہیں اور اس قسم کی اصطلاحیں انھیں لوگوں کے افکار کا نتیجہ ہیں جن کا مرکز تفکر مادہ اور صرف مادہ ہے وہ کسی چیز کو مادہ کے بغیر دیکھتے ہی نہیں۔

یہ بات بحث سے بالا ہے کہ وجود خدا کا عقیدہ معارف بشری اور ثقافت کے عظیم منابع میں سے ایک منبع (چشمہ) ہے۔ اور خدا کی معرفت بہ عنوان یک جہاں مبنی راستیں نے مختلف اقدار میں اجتماعی اصول میں ایک تصور عینی اور انسانی افکار میں ایک بنیادی تغیر ایجاد کیا ہے اور آج بھی۔ جو علم و تکنالوجی کا دور ہے۔ جبکہ بشر نے فضا کی راہوں کو کھول دیا ہے۔ علماء کا ایک بہت بڑا طبقہ جو اپنے نظام فکر و عقیدہ میں مذہبی معرفت رکھتے ہیں وہ منطق و استدلال کی راہ سے وجود خدا اور مبدی ہستی تک پہنچنے لگے ہیں۔

اگر مادہ پرستوں کی تفسیر صحیح اور واقعی ہوتی اور تاریخ فکر مادی کی معرفت حق و صاف سے ناشی نہ ہوتی تو علم اور مادیت کے درمیان ایک رابطہ خاص ہوتا اور محیط علمی میں تنہا مادی

عقاید اپنا وجود منوایتے ۔

کیا ہر دور میں تمام علماء و فلاسفہ الہادی نظریے کے تھے؟ اور کیا سبک مبادیہ پرست تھے؟ بلکہ اگر مفکرین کے احوال و آثار کا تحقیقی نظریے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ نہ صرف ہرگز مذہبی لشکر و انصافی مفکرین و محققین سے خالی نہیں تھا بلکہ بہت سے مفکرین و بزرگ علماء اور بہت سے علوم و دانش کے موسس مکتب توحید کے پرچم دار تھے!

مادی اور الہادی عقیدہ کا تعلق کبھی بھی دودھ کا مکھن سے نہیں رہا۔ بلکہ عہدِ اول اور طول تاریخ میں یہ مادہ پرست ہمیشہ اہل توحید کے صفوف کے سامنے اپنے کفر و انکاد کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔

آج مارکسی علوم کے نزدیک علم سب سے زیادہ گمراہی کا ذریعہ بن گیا ہے اور تمام جماعتوں سے زیادہ یہی جماعت گمراہ ہے۔ ان کے لئے بہتر طریقہ تو یہ تھا کہ نود دانش کی مدد سے صحیح راستہ تلاش کرتے اور تعصب و بصیرت اور جلد بازی کو چھوڑ کر منطقی طریقہ سے تحقیق کر کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے تاکہ حقیقت تک رسائی حاصل کر سکیں۔ یہ لوگ انکاد جمود اور عقائدی تقلید میں مبتلا ہیں اور مفروضہ طور پر تمام عقل و فکر کی بلند و بالا ارزشوں کا انکار کرتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ پھر اپنے اس انکار پر فخر و مباہلات بھی کرتے ہیں۔

یہ لوگ کہتے ہیں: علم آسنے کے بعد وجود خدا کا مسئلہ منسوخ ہو گیا۔ یہ بات منطقی سے بہت دور ہے یہ تو بس ایک قسم کی لغو بازی ہے، کیونکہ ہزاروں علمی تجربے کے بعد بھی یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی موجود و حائل غیر مادی وجود نہیں رکھتا۔ بلکہ مادی عقیدہ تو میٹافزکی عقیدہ ہے جس کی نفی جیسے کہ اثبات صرف منطقی طریقوں ہی سے کیا جاسکتا ہے اس لئے اگر مادی عقیدہ قبول بھی کر لیا جائے تو اس سے میٹافزکی عقیدہ کی نفی نہیں ہو جاتی۔ اسی لئے مدرائے دنیا کا تھیل نہیں ہیں اس طرح کی بات کرنا محض لہجہ پر ہے معنی بات ہے۔ مادہ اس کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے، بلکہ یہ فطری عقیدہ صرف حقائق کی تحریف کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اس مادی مدرائے کو علمی کہنا علم و حقیقت کے ساتھ خیانت کرنا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ انسان کل تک طبعی عل و عوامل کو نہیں جانتا تھا۔ اور اس کے اندر گروہ ہونے والے خلوش کے اسرار و رموز سے بھی ناواقف تھا۔ مگر اس کا ایمان جہالت سے ناشی نہیں تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو بہت سے معنائی عالم کے انکشاف کے بعد معرفتِ خدا کی بنیاد ہی دھرجاتی اس کے برخلاف ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسرارِ وجود جتنے زیادہ منکشف ہو رہے ہیں۔ عقیدہ بر خدا اور زیادہ واضح و روشن ہوتا جا رہا ہے۔

علم اگرچہ صرف فضا کے محدود و محدود روشنی کرتا ہے۔ اور معرفت و علمِ جہاں شناسی جزئی ہے کلی نہیں ہے کیونکہ علم کائنات کی صورت کا مکمل کارائہ کرنے سے عاجز ہے۔ لیکن اس کے باوجود شناسختِ علمی دقیق اور شخص ہے اور توانائی بخش ہے اس لئے علوم میں جتنی وسعت ہوتی جا چکی خدا کی معرفت اتنی ہی علمی اور منطقی ہوتی جائے گی۔ کیونکہ انسان کی آگاہی ازراہِ شناسختِ سبب و عل و معلول ہوگی اور جب ایسا ہوگا تو انسان اسی عامل اور علت اولیٰ جو ان تمام عوامل و عل کی اصل ہے، اس سے چشم پوشی نہیں کر سکے گا۔

بقول پروفیسر رویہ : ذاتِ علمی پہلی مرتبہ اعلان کرتا ہے۔ اور یہ اعلان کسی ضعف و عاجزی کی بنا پر نہیں بلکہ تحقیق و تجربہ کی بناء پر ہے۔ کہ عرصہ وجود میں علمِ انسانی کا وظیفہ ذاتِ باری اور اس کی تجلیات کی معرفت کے سوئی کچھ اور نہیں ہے۔ اور واجب ہے کہ ان تمام کوششوں کو خدا کے نزدیک کائنات کی ایمانِ علمی اور صحیح منطقی معرفت پر صرف کیا جائے۔ اور یہ بات بھی زیر بحث نہیں ہے کہ علمِ ایمان سے یا ایمانِ علم سے مصاحت کرے گا؟ کیونکہ تمام دینی کتابیں، سارے انبیاء اور تمام دینی مفکرین نے عقل کو بہترین و برتر موجدِ انسانی بتایا ہے اور ان حضرات نے عقل سے مکمل استفادہ کرنے کی دعوت دی ہے۔

اکثریت کی جہالت و بے سوادی اور چھوٹے تہمتوں کی غمیرت اور بے فائدہ احساسات کے غلبہ و قرون اس دعوت کو پیچھے ڈالے رکھا۔ اور اب جبکہ انسان معرقل و دانش میں داخل ہو چکا ہے۔ اور اس تمام سائل و مسائل کو اپنی زندگی میں روز بروز وسعت دے رہا ہے اور اس ضرورت ہے کہ عقول و افکار کی تربیت پر

خاص توجہ دی جائے اور اس علم کی طرف توجہ کی جائے جو صحیح طریقہ سے موردِ استفادہ ہو۔
مثلاً اس جہاں پر اس جہاں اور اس جہاں پر یا اس جہاں پر اس جہاں پر اور نہ کھربوں فوری سال کا مسئلہ
ہے اور نہ عظمت کا کائنات کا مسئلہ ہے بلکہ دراصل مسئلہ اس دانش کا ہے کہ جو صحیح طریقہ سے
موردِ استفادہ واقع ہو۔

کل تک انسان تنہا اپنے پیکر متناسب و موزون کے بارے میں سوچا کرتا تھا اور
اس کا مشاہدہ کرتا تھا۔ لیکن وہ پیچیدہ اسرار جو اس کی آفرینش میں ودیعت کئے گئے تھے اسے
نآشٹ تھا۔ مگر آج اپنے اس چھوٹے جسم کی وسیع و حیرت انگیز معلومات رکھتا ہے
اور یہ جانتا ہے کہ اس کے چھوٹے سے بدن میں دس ملین ملین خلیا استعمال کئے گئے ہیں
اور صورتِ حال یہ ہے کہ ایسے مصنوع کے بنانے والے کی عظمت کا اندازہ موجودہ تمام علمی
ذرائع و وسائل کے باوجود نہیں لگا جاسکتا۔

اب سوچئے کیا یہ بات منطقی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ خدا پر صرف انھیں لوگوں کا عقیدہ ہے
جو انسان کی کیفیت آفرینش سے آگاہ نہیں ہیں؟ اور کیا وہ عقلمند جو عقل و عواملِ طبیعت سے
باجبر ہے اور سیرِ مکمل و رشد انسان سے مطلع ہے۔ اور جو جانتا ہے کہ تمام مراحل وجود
میں قانون و دقیق حساب کی حکومت ہے وہ اس بات کا معتقد ہو جائیگا کہ حیرت انگیز
قوانین کا بنانے والا ایک بے ادراک و بے شعور مادہ ہے؟ کیا یہ تمام انکشافاتِ اصدقا
اس دانشمند کو اس منزل پر پہنچائیں گے کہ وہ تمام موجودات کے خالق اور خود اپنے مبد
کرنے والے کو بے شعور مادہ کی طرف نسبت دے؟ مادی ثقافت جو کائنات کو آنکھ
بند کر کے دیکھتی ہے وہ ہمارے لئے بہت سے ایسے سوالات چھوڑ دیتی ہے جن کا جواب

۱۔ موزون دانشمند و جستجوئے خدا سے بزرگ ۲۱

۲۔ ایک ہزار بیوں کا ایک ملبارو ہوتا ہے۔

ی نہیں ہے !

دانشندان الہی نے از نظریۃ فزیکی یہ بات ثابت کی ہے کہ وجود کا دائرہ مادہ سے کہیں زیادہ وسیع تر و گسترده تر ہے اور غیر مادی موجودات کی دنیا مادیات کی دنیا سے بہت بڑی غنی اور پردہ من ہے۔ یہ لوگ اگرچہ نظام طبیعت کو قبول کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وجود کی ایک ایسی صورت کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں جو مادہ سے مجرور ہے اور اس کی ذات کی شناخت علوم تجربی کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ لہذا ہر حادثہ و حوادث طبیعت اس کی حقیقت ذات کی حکمت کرتی ہیں۔ کیا یہ توحید ہی فکر اس بات کی دلیل ہے کہ مدرسۂ توحید جذبہ علمی سے خالی ہے ؟ علم کے پاس از قبیل کیا دنیا وہ حصوں میں منقسم ہے مادی و معنوی ؟ دنیا کے لئے کوئی حد و مقصد ہے کہ نہیں ؟ سوالات کے جوابات نہیں ہیں ! کیونکہ اصطلاحی طور پر یہ سوالات علمی نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ معرفت علمی ہم کو بعض موجودات کی خبر دیتی ہے۔ لیکن ہم کو زندگی کے بارے میں صحیح آگاہی نہیں دے سکتی اور نہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ ہم کو وہ راہ و روش بطور الہام بتلا دے جس کو ہم اپنی زندگی میں اختیار کریں۔

برٹراند رسل (BERTRAND RUSSEL) کہتا ہے : اگر آج کا علمی تمدن مفید تمدن ہوتا تو علم کی زیادتی اور پیشرفت سے عقل انسانی میں اضافہ ہوتا۔ عقل سے میری مراد مقصد حیات کا ادراک ہے۔ مگر جدید تمدن یہ فائدہ نہیں پہنچا رہا ہے لہذا انسان کی ترقی کیلئے علم کی زیادتی و ترقی چاہیے جتنی ضروری ہو مگر یہ علوم انسان کی صحیح ترقی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ لہذا علمی معرفت میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ان کی آئینہ یا لوحی کا مدرک بن سکے کیونکہ علمی معرفت کی علی آئینہ یا لوحی سے زیادہ علمی قیمت ہے۔ اور یہ ان کو بصیرت پر مسلط کر سکتی ہے۔ جبکہ وہ چیز جو اس کو ایمان و عقیدہ کے مدرک پر متمکن کر سکتی ہے وہ علمی و نظری قیمت ہے نہ صرف علمی !

لے جہاں بین علمی

تمام علوم کا دار مدار تحقیق و تجربہ و ملاحظہ پر ہے اور تجربہ پر مشتمل قوانین متزلزل و غیر ثابت ہیں اور ایمان کے لئے ایک ایسا مددک چاہئے جو دائمی و بیشکلی سے ہمکنار ہو۔ تئزوں و تفرسے بہت دور ہو اور اس میں یہ بھی صلاحیت ہوئی چاہئے کہ جہاں مشنری کے مخصوص مسائل جو عام کائنات کے نکل و باہت سے مربوط ہوں ان کا معتقد و جاودانہ جواب دے سکے۔ اور وجود کے تفسیر میں ان کی ضرورت کو پورا کر سکے۔

انسان کا اس اعتدال نگہی و روحی کا محتاج ہے اگر اس کا کوئی ہدف معین نہیں ہے تو وہ ضائع و ہلاک ہو جائے گا۔ اگر دین و مذہب کی طرف سے اس کو کوئی معین ہدف نہ ملے گا تو وہ خود ساختہ حریف کو اپنا لے گا اور یہ نظام طبیعت کے خنڈ ہو گا اور وجود فکر کا سبب بنے گا۔ دور حاضر کے انسانی علمی انکشافات نے انسان کو دنیا کے عمومی قوانین و نظام کا معتقد بنا دیا اور اس عقیدہ میں یہ افراط ہو گیا ہے کہ انسان غرضی و مادی کی احوال و حاکمیت کا قائل ہو گیا۔ اور ان کو انہی مان بیٹھا اور عملی طور سے تاریخ یا طبیعت کی الوہیت و قاضیت کا معتقد بن گیا۔ اور انسان کی صفت شخصیت و اختیار کا انکار کر کے ڈیالیکٹکس جبر کے سامنے انسان کو دست بستہ اور مجبور بننے کا قائل ہو گیا۔

اور اب علوم کے تدریجی تقدم کے ساتھ معرفت اور عالم کے بارے میں علمی نظریہ وحدہ توحید کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ اور وہ حوادث و ظواہر جو پہلے غیر مرتبط معلوم ہوتے تھے اب ایک ربط سے مرتبط معلوم ہونے لگے ہیں۔ اور ایک منشاء کی طرف ان کی بازگشت تسلیم کی جانے لگی ہے۔ مختصر یہ کہ ظواہر مختلف و متناثرہ میں ایک علاقہ بستگی کا عقیدہ پیدا ہو گیا ہے اور جب یہ دیکھا جائے گا کہ فاعلیت تو ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہے تو پھر تمام ظواہر کو اسی ایک منبع کی طرف اور اسی ایک مبدئ کی طرف پٹا یا جائیگا۔ اور پھر تمام ظواہر مجتمع ہو کر اسی محور و مرکز پر منتہی ہوں گے۔ اور اسی سے سب کا وجود سیراب ہوگا۔

بے دینی کے اسباب

تاریخ ادیان کی کتابوں میں سارا زور اس بات پر صرف کیا گیا ہے کہ آخر وہ کون کس سبب نئے جگہ بنا پر لوگ دین کی طرف مائل ہوئے لیکن یہ نہایت ہی غلط اور ناقص طریقہ ہے جس سے کبھی انسان واقعت کی طرف نہیں پہنچ سکتا اور نہ حقیقت کو دریافت کر سکتا ہے۔ کیونکہ فطرت توحید کو دیکھتے ہوئے۔ یعنی نوع انسان کی وہ خصلت وجودی جو دیگر انسانی صفات مثلاً فکر، ارادہ، استعدادات متقابلہ کے درمیان ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ان اسباب کو تلاش کرنا چاہئے تھا کہ جن کی وجہ سے انسان اپنی فطرت کے خلاف بے دینی کی طرف چلا گیا ہے۔

دینی عقائد ایک فطری چیز ہے اور مادہ پرستی خلاف فطرت ہے۔ اگر انسان اپنی فطری خصوصیات کی بنا پر خدا کے برحق ہونے تک نہیں پہنچ پاتا تو اپنے لئے ایک خدا تراش لیتا ہے۔ چاہے وہ بے شعور مادہ ہو یا جبر تراش ہو۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہی باطل خدا، خدا کے برحق کی جگہ لے لیتا ہے اور پھر اسی کے فرمان، تفاوت، ہدایت، ارشاد طریق میں وہ اسکی پابندی کرنے لگتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ انسان خدا کے برحق کو یوحنا کہتا ہے اور قدیم یا جدید بت پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور پھر شرعی تفاوت و بے دردی سے خدا کو خدا کے تاریخی کے قدموں پر طعن کر دیتا ہے۔ اور جواہرات دیکر مٹی خرید لیتا ہے۔

اور بے نیادہ افسوس تو اس بات پر ہے کہ پسماندہ طبقہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کے ماننے تمام خدائی صفات کے ساتھ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ اور خدا کو وہ

ناشر کیلئے سے اعراض کر لیتا ہے اور اس ننگ آلود عبودیت کو جان کی بازی لگا کر خرید لیتا ہے۔ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مادیت کا ظہور یورپ میں بعنوان ایک مکتب اور حقیقتِ مطلقہ سے علاوہ انسانی کو جدا کرنے کے لئے ہوا تھا اور اس لئے ہوا تھا کہ انسان کو مادہ کی زنجیر میں گرفتار کر دیا جائے اور مذہب کی جگہ اس مادہ کو دے دی جائے اور یہ سارا کام کچھ تارہ بکچی و اجتماعی اسباب کی بنا پر کیا گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے مغرب میں اس کی بنیاد پڑی تھی۔ من جہان اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا کہ جس وقت نئی صنعتی ترقی شروع ہوئی اور ان علماء نے ایسے عقائد و آراء سے جدیدہ کا اظہار کیا جو سچی علماء کے نظریات کے خلاف تھے تو سچی علماء نے اس کے ابتدائی دور میں بڑی شدت سے ان لوگوں کی مخالفت شروع کر دی جس کا رد عمل یہ ہونا ہی تھا کہ موجودین نے دین و دیانت کا عملی الاعلان انکار کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ طاقتور ہوتے گئے اور سچی علماء کی ان کے مقابلہ میں ایکٹ چلی۔

کلیسا۔ مخصوص دینی عقائد کے علاوہ۔ قدیم یونانی و غیر یونانی فلامنہ کے اصول و نظریات کو انسان و کائنات کے سلسلہ میں، وراثتی طور پر مانتا تھا اپنے دینی اصول و عقائد کے ساتھ ساتھ۔ لیکن جب کھیس نے کچھ ایسے نظریے دیکھے جو کتب مقدس اور ان کے دیگر مسدود مقبول اصول کے خلاف تھے تو انھوں نے۔ یعنی کھیس نے۔ اپنے منہ لف نظریہ دے لے کو کافر و مرتد قرار دے دیا اور اس کے لئے سخت ترین غیر انسانی سزائیں مقرر کر دیں۔ علمی و مذہبی محافل میں جب علم جدید و مذہب کا تضاد ظاہر ہونے لگا تو طریقہ میں مخالفت و مخالفت کا جذبہ بھی شدید ہونے لگا۔ روشن فکر و دانشمند جتنے دیکھا کہ سچ کا کھیس عقل و فکر کو پا بزنہ بن کر چاہتا ہے اور حیرت و آنا دای فکر کو چھینا چاہتا ہے اور پھر نتیجہ اس جامد نظامِ فکری نے عصرِ جدید کے انسان کے لئے خلاف عقل ایک نہ ہونے والی فضا پیدا کر دی اور صاحبانِ فکر و نظر کو گوشہ گنہ می میں مجبور کیا۔ اور اس سلسلہ فحاشانہ پورے یورپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور پھر جب کھیس کا اقتدار ختم ہو گیا اور ظلم و بربریت کے باد چلنے لگے

تو عصر جدید کے علماء جو گوشت گنہ گری میں قید و بند کی سختیاں گزار رہے تھے انہوں نے ماضی کی تلخیوں کا بڑی شدت سے جواب دیا۔ اور جتنے بھی روشن خیال لوگ تھے انھوں نے قدیم مذہب کا جواب اپنی گردن سے اتار پھینکا اور مذہب بے برگشتہ ہو گئے اور پھر عصیت و رنج جانکاہی کی ایک عظیم مذہب کے خلاف قائم ہو گئی اور شدید معنوی بحران کا آغاز ہو گیا اور اس کا نتیجہ علم و ایمان کی جدلی کی صدمت میں ظاہر ہوا۔ اسی غیر منطقی انتقام کا نتیجہ یہ کہ لوگ اصلی آسانی ماسک اور وجود خدا کی حقیقت کا انکار کر بیٹھے۔

یہ درست ہے کہ دین کی بعض تعلیمات غیر منطقی تھیں بلکہ بے بنیاد تھیں اور اصل دین سے ان کا کوئی ربط بھی نہیں تھا مگر کلیسا سے انتقام لینا ایک الگ بات ہے اور جلد بازی اور قطع کاری کی وجہ سے بطور علم و دین ہی کا انکار کر دینا ایک الگ چیز ہے۔ اور یہ بدیہی بات ہے کہ انتقام لینے وقت علمی محاسبہ کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہوتا اور اس وقت کی فضائیں جو چیز حکومت کرتی ہے وہ صرف احساسات کا طوفان ہوتا ہے۔

اس وجہ سے ان کا فخر معنوی بہ نسبت میکانیکی و علمی استغنا کے زیادہ ہو گیا اور ان کی صنعتی سر زمین پر قبضہ بڑھتا گیا اخلاق و معنویات میں پیچھے ہوتا چلا گیا اور پھر ضروری قدرت معنوی کو ان علوم و معارف سے حاصل نہ کر سکے۔

ارزش و معنویت کے مقابلہ میں علوم بذات خود زیادہ اہمیت کے حامل نہیں ہیں کیونکہ ہم حقیقی علوم کی طرف مراجعہ کر کے سکھوں افراد کا وظیفہ و فریضہ معین نہیں کر سکتے۔ علوم میں چاہے جتنی ترقی ہو جائے اپنے سامنے ایک قدم سے زیادہ نہیں دیکھ سکتے۔

شہنشاہائے بشر نہ تو اس کائنات کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ مستقبل میں انسان کے سر نوشت کی پیش گوئی کر سکتے ہیں۔

یہ تو صرف نظریہ توحید ہے جو صرف انسان کے مادی حیات ہی پر اقتدار نہیں کرتا بلکہ انسانی زندگی کے سب سے اہم اور بلند غایت بھی معین کرتا ہے۔ اگر انسان اپنے کو توحید کے راستے

ہر چلتا رہے تو وہ ایسے کلید تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے جہاں بنی کے جو کچھ میں اپنے نام بنیادی اور استعلیٰ سوالات کے جوابات پالیتا ہے۔ اور پھر انسانی زندگی اپنے رنگ اصلی قدر و قیمت کو کامل تجلیات کے ساتھ پالیتی ہے اور یہ عقیدہ توحید کے طفیل میں ہوتا ہے۔

خدا کے انکار اور لادینیت کے اسباب میں سے ایک سبب یہی ہے۔ ایک دوسرے گروہ نے کلیسا کی طرف سے خدا کے بارے میں جو نادرت و نارسا اور ناقدرہ شبہات متعالیٰ غلام پیش کئے تھے ان کی وجہ سے اسی گروہ نے مذہب استغنیٰ دیکر مادیت کے دامن میں پناہ لی۔ کیونکہ خدا کا جو نظریہ کلیسا پیش کرتا تھا ہوشمند افراد کے لئے وہ کسی بھی طرح قابل قبول نہیں تھا۔ اور نہ قانع کر نوالا تھا۔ اس لئے کہ کلیسا خدا کو مادی اور انسانی قالب میں ڈھال کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا تھا۔ جبکہ ان میں ہمیشہ ازیش ہائے مطلق کے جستجو میں سے اور عقیدہ کے چوکھٹے کو توڑ کر اس سے کہیں بلند و بالا جانا چاہتا ہے تو خدا کو محدودیت کے چوکھٹے میں کیونکر قبول کر سکتا ہے؟

یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اگر مسلم حقیقت کو بھی ناقص اور قصہ کہانی کی طرح ذہنوں میں ڈال دیا جائے تو جب انسان فکر و علم کے عالی مستوی پر پہنچے گا تو اس حقیقت کے تصور سے برے ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

مذہبی فکر حضرات نے جب مسیحی الہیات میں خدا کی ایسی تصویر دیکھی اور یہ دیکھی کہ مسیحی مذہب ایمان کو عقل پر مقدم سمجھتا ہے۔ اور دین کے بیرونی کاروں کو سوچنے سے بے ایمان لانا ضروری ہے تو انھوں نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا کہ یہ دینی رنگ و محدود نظریات اور مسیحی الہیات کے رنگ چوکھٹے میں علم و حکمت کا انحصار میزان عقل و دانش میں کے خذف ہے اور ان کے سامنے کلیسا اور تحریف شدہ کتابوں کے علاوہ معارف الہی کو سمجھنے اور اس قسم کے مسائل میں تحقیق کرنے کی کوئی معجم اور واقعی پناہ گاہ بھی نہ تھی۔ اور نہ وہ کسی ایسے بلند و برتر نظام تک رسائی حاصل کر سکے تھے جو ان کی مادی خواہشات کے ساتھ معنوی ضرورت

کو بھی حل کر سکا ہوتا اور پورا کر سکا ہوتا اور ان کے تمام حیات مادی و معنوی، عارضی و مکرری عناصر کے لئے مناسب قالب پیش کر سکا ہوتا۔ تو ان کی بنش مادی گری نے ان کے افکار و خیالات میں ایک انتھاب پیدا کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مادہ کے طبیعت کی غیر مادی اور مشابہت معالی کا انکار کر بیٹھے۔ اور اس بات کی طرف متوجہ نہ ہوئے کہ وہی جب بھی مسیر جمالت میں پڑ جاتا ہے تو ہمیشہ اشتباہ اور غلط راستہ کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن جو مذہب سچا ہوتا ہے۔ خرافات، تحریفیات، موهیات کے شرابہ سے خالی ہوتا ہے وہ ان کو قصد کہا نیوں اور خرافات سے نجات دلا دیتا ہے۔ اور صحیح عقیدہ پر ثابت قدم بنا دیتا ہے اور معارف الہی کی صحیح و درست تصویر پیش کرتا ہے جو اہل تحقیق کو صحیح جواب دے سکے۔ اور معقولوں و لائوں سے ٹکروں اور تعظیوں کی اصلاح کر سکے۔

لیکن اس روشنی فکر جتنے سے جب دین کو ایک خرافات اور باطل باتوں پر مشتمل دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ دین کی بنیاد غیر منطقی اصولوں پر رکھی گئی ہے تو ان کو یقین ہو گیا یہ تمام دینی پروگرام عبث و بیکار ہیں۔ اور اپنے مذہب میں جو چیزیں دیکھی تھیں ان کی بنیاد پر تمام ادیان و مذاہب کی مخالفت پر آمراءے حالانکہ اس بنا پر مصلہ بازی اور غلات واقع بنیاد پر تمام ادیان و مذاہب کی تردید عقل و منطق سے بعید اور بالکل غلط ہے۔

والٹر اسکار (WALTER OSCAR-L) جو فیریا لوجی اور میوکیٹسٹری کا بہت بڑا عالم ہے وہ اس حقیقت کو اس طرح آشکار کرتا ہے کہ علمی مطالعات میں بعض دانشمندوں کی تو یہ جو وجود خدا کی طرف منتہ نہیں ہوتی اس کے متعدد اسباب ہیں۔ میں ان میں سے دو علتوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ غالباً اوضاع سیاسی استبداد یا احوال اجتماعی یا حکومتی تشکیلات وجود پر ہنگام کے افکار کا سبب بنا سکتے ہیں۔

۲۔ انسانی فکر ہمیشہ بعض اوضاع کے تحت تاثیر ہوتی ہے اور اس کے باوجود کہ بعض نے وہ دم جو خالص اہم ہے متعلق ہو اس دم کے ذریعہ جبکہ نامیت کرتے ہیں جسم کے بعد دوسری حمایت دلا سکتے ہیں۔

کسی بھی قسم کے جہاں یا دنیوی عذاب کا خوف نہیں رکھنا پھر بھی اس کی فکر صحیح راستہ اختیار و اختیار کرنے میں کاملاً آزاد نہیں ہوتی۔ ————— سیسی خاندانوں میں زیادہ تر نیچے آبدائے عمر میں ایک ایسے خدا پر ایمان لاتے ہیں جو ان کے مشاہد ہوتا ہے۔ گویا کہ بشر بصورت خدا پیدا کیا گیا ہے۔ اور یا خدا جب علی حیا میں داخل ہونے میں اور علی مسائل کے یاد کرنے اور شقی کرنے میں مغفل ہیں تو یہ سنی شکل کا ضعیف خدا منطقی دلائل اور علمی حقائق پر نہیں مبنی اور جب کسی صورت سے دونوں۔ تعزاتی خدا اور منطقی دلائل والا خدا۔ میں اتحاد نہیں پیدا ہوتا تو مفہوم خدا کو ترک کر دیتے ہیں اور اس کو دائرہ فکر سے خارج کر دیتے ہیں۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ منطقی دلائل اور علمی تعزلیات سابق عقائد کو بدل نہیں پاتے اور پھر دوسری طرف یہ لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ ایمان باللہ کے سلسلہ میں ہم نے غلطی کی ہے اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے اسباب ہوتے ہیں جو انسان کو اس دینی مفہوم کے ٹوٹ جانے پر متوجہ کر دیتے ہیں اور نتیجہ میں وہ شخص معرفت خدا کا انکار کر بیٹھتا ہے۔ یہ وجہ تھی کہ دانشمند حضرات نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی کہ مسائل ہستی و آفرینش میں جہاں کہیں بھی خدا یا مذہب کا نام ہے اس کو ختم کر دیا جائے۔ اور سقیم یا غیر سقیم ایسے قوانین و فہم مومے ایجاد کئے جائیں جو ان تمام مقامات کے لئے۔ جہاں پر خدا یا مذہب کا نام ہو۔ علمی محال تلاش کر کے خدا و مذہب کا نام باقی نہ رہے دیں۔ اور نزع خود انسانوں کی امیدوں کو دیں کہ سلسلہ میں ختم کر دیں اور نظام طبیعت یا گردش جہاں میں خدا کی کسی بھی قسم کی تاثیر نہ کرے نہایت دنا بود کر دیں۔

اور جب یہ لوگ کسی ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں تائید کا دروازہ بند ہے تو وہاں پر کچھ مختلف مفروضات کے ذریعہ مسدود کر کے کی سعی رائیگ کی اور یا یہ کہہ کر ٹال گئے کہ مستحقین میں ہونے والی تحقیقات سے یہ گتھی سلجھ جائے گی۔ اور اس طرح۔ اپنے

خیال عام میں۔ اس بات پر تیار نہ ہوئے کہ اس قسم کی خرافات اور غیر علمی مسائل میں کوئی کوشش کریں اس لئے اگرچہ یہ لوگ شرک کی گمراہی سے تو بچ گئے۔ مگر کفر و ایمان کے دلدل میں پھنس گئے۔ اگرچہ خدا کی معرفت اور عقیدہ مجدد فطری و طبعی چیز ہے لیکن مادی زندگی کی ضرورت یا طرح انسانی اس کی تلاش و جستجو میں زیادہ نہیں رہتا۔ بلکہ یہ مسئلہ مادی زندگی سے بالکلیہ متعلق ہے۔ اس میں وقت نظر اور گہرائی فکر کی ضرورت ہے۔ اور فضا یا کے اصل تک نفوذ اور مسائل وجود میں تحقیق درکار ہے۔ اور ہر انسان کو مستقلاً چاہئے کہ غور و تدبر سے اس کو حاصل کرے۔ مختصر یہ کہ ہدایت اور فکریت میں اند نظر ہدایت کوئی مشابہت نہیں ہے۔

اور دوسرے نقطہ نظر سے نا دیدہ موجود جس کی توصیف بھی ناممکن ہو اس کا انکار کر دینا اس کے وجود کے اعتراضات سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اور اسی لئے جن لوگوں کے اذہن اس فکر کو معمول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ اور خصوصاً جبکہ حقیقت نامرئی کی شناخت مختلف پہلوؤں و عوامل کی بنا پر خدشہ دار ہو گئی ہو تو وہ لوگ بجائے اس کے کہ راہ فکر کو اپنے لئے ہموار کریں۔ ایسی راہ اختیار کرتے ہیں جو آسان ہو اور اس میں کوئی درد دوسری بھی نہ ہو اور وہ راہ کفر و ایمان کی ہے وہ لوگ اسی کو انتخاب کر لیتے ہیں۔ اور محض ظاہر اس راہ کو اختیار کر لینے میں اپنی کو کوئی نقصان بھی نہیں دکھائی دیتا۔ اور جب مسئلہ وجود خدا سے دور ہو جاتے ہیں تو غنا و خوشحالی و عصیت پر اتر آتے ہیں۔ اگر آپ تفصیلات کو یہ کام مطالعہ کریں جو دین سے بیزار لوگوں سے بھری ہے تو اس حقیقت کو پالیں گے۔

اور اسی کے ساتھ اس بات سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں ہے کہ جاہل و بے سلیق نادان عابدوں اور زاہدوں کی تبلیغات نے بھی بہت سے لوگوں کو دین سے بیزار کر دیا اور وہ آخر کار بد پرست ہو گئے۔

وہ غمراہ جو انسان کی طبعی حیات کے ساتھ شروع اور اسکی موجودیت سے ہم نشین ہوتے ہیں وہ نہ تنہا یہ کہ بہت دیر ہو وہ نہیں ہیں بلکہ وہ ایک معین کنندہ طاقت و سروریت

ساز اور عامل رشد و حرکت ہیں جو انسان کو اس مقصد کی طرف — جو اس کی آفرینش میں منظور تھا — لے جاتے ہیں اور اہم چیز یہ ہے کہ جس طرح انسان کو اپنی خواہشات کا بندہ اس طرح نہ ہونا چاہئے جس طرح قیدی اپنے وجود و حرکات و اختیارات میں دار و قہیل کا تابع ہوتا ہے اسی طرح اپنی واقعیت درونی سے بھی جنگ نہ کرنی چاہئے اور نہ فطرت کی ہر دھڑ دھوٹ ہر تلاش و حرکت کو روکنا چاہئے۔ بلکہ نہاد انسانی کا فائدہ بخش ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ آدمی کے وجود میں فعالیت ہر وقتی ہو۔ مگر اپنے ترکیب و اعمال میں معتدل و متوازن ہو ورنہ غرائز کی سرکوبی بھی مشکلات پیدا کر دیتی ہے اور انسان کی شخصیت کو دیران بنا دیتی ہے۔

قرون وسطیٰ میں کلیسا کے پیش نظر صرف اور صرف آخرت تھی۔ یعنی مادی دنیا بچ و بوز تھی۔ آپ خدا غور کیجئے مذہب و خدا کے عنوان کے پیش نظر اگر ہم فطری خواہشات کو غیر مہم کہہ اس کو نابود فرمیں کر لیں اور رہبانیت و تجرد کو مقدس مانیں۔ اور شاہی بیاد اور شکیں نوازہ — جس کے زیر سایہ قبائے نسل کا اسکان ہوتا ہے — کو گندی اور نجس چیز فرمیں کر لیں انفر و نادر کی کو مایہ سعادت سمجھیں گلیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور دوسرے لوگ ایسے مذہب کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ اور اس سے کتنی امیدیں وابستہ کریں گے؟

مذہب کا مقصد اصلاح و دہری، خواہشات پر تسلط، اعمال انسانی کو کبھی اور نہ یا وہ روی سے محفوظ کرنا اور اس کے دائرہ خواہشات کو محدود کرنا ہے تاکہ بالکل نیست و نابود نہ کر دینا ہے۔

اب اگر اپنے فرائز کو کنٹرول میں رکھے اور خواہشات کے جال میں گرفتار ہونے کے بجائے برابر اس سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا رہے تو وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے با مقصد سر نشہ کو بنا سکتا ہے، ورنہ انسانی فطرت میں خواہشات کی کشمکش کی شدت اس درجہ ہے کہ جب تک انسان کو ہر طرح کی تربیت نہ دی جائے سادگی و سہولت کے ساتھ وہ اپنے اندر خواہشات کو سمجھ نہیں کر سکتا۔

منقطع کا سبب اور اپنی بدنہی کا سبب نہ ہوتے تو ہرگز حرام نہ کئے جاتے۔ محرمات کی محنت کا اندازہ اس طرح سے کیا جاسکتا ہے اور دنیا کے ساتھ آخرت کی سعادت کا راز معلوم کیا جاسکتا ہے۔ یہی صورت و حیات کی ہے کیونکہ عبادتوں کا وجوب اور ان کا بے دیا ہونا یہ انسان کے فائدہ کے لئے ہے اس لئے نہیں ہے کہ انسان کی دنیاوی خوشنہی کو ختم کر دے۔

طلب انسان کے آب و اکہ میں عبادت ایک طوفان کا کام دیتی ہے۔ عبادت درون فطر اور معیار بندش کو متغیر کر دیتی ہے۔ بلکہ عبادت ایسا سنگ ناز ویر ہے جس پر دین کی بنیاد استوار ہوتی ہے اور ایسا نمرخی و تریخی پر بار قسم کا عمل ہے جو دل کی گہرائیوں تک نفوذ کرتا ہے اور ایسی دھار و ارتطوار ہے جو تمام فساد کے تہوں اور اندرونی پستی کو کاٹ دیتا ہے اور انسانی شخصیت کو دنیا کے نہایت دگستہ و پکے تک پرواز کی صلاحیت عطا کرتی ہے اور ان کے لئے رشد و ہدایت کی کو ممکن بناتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ معنویات اور مادی حیات میں کوئی عبادت کوئی تناقض نہیں پیدا کرتی بلکہ ایک سعادت مندانہ زندگی عطا کرتی ہے۔

اور شاید یہ بھی تعلیمات کے نقص و غیر منطقی ہونے کا نتیجہ ہو کہ رسول جیسے فائدہ پر لوگ یہ کہنے لگے کہ دین اور خدا پر عقیدہ ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے انسان ہلاک ہو گیا چنانچہ وہ کہتا ہے: کلیسا کی تعلیم انسان کو دو بدنہی اور دو محرومی سے ایک کے درمیان ڈال دیتی ہے یا تو دنیا کی بدنہی اور اس کی نعمتوں سے محرومی یا آخرت کی بدنہی اور اس کی نعمتوں اور محرومی و تصور سے محرومی۔ کلیسا کی نظر میں ضروری ہے کہ انسان ان دونوں بدبختیوں میں سے ایک کو اختیار کرے یا تو دنیا کی بدنہی اختیار کرے اور خود کو محروم و گوشہ نشین بنائے۔ اور اس کے بدلے میں آخرت — دوسری دنیا — کی لذتوں سے بہرہ مند ہو۔ یا اگر دل چاہے تو دنیا کی لذتوں سے فائدہ اٹھائے تو پھر یہ طے کرے کہ آخرت میں محروم ہی محروم رہے۔

اس قسم کے افکار کا نشر ہونا مذہب کی حقیقی فکر سے بے خبری کی دلیل ہے اور اس سے مذہب و ایمان کی سرزشت کا اندازہ مستقبل میں کیا ہوگا بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

دین کے بارے میں اس قسم کے تصورات کا اثر انسانی اعمال و افکار پر کتنا گہرا ہوگا اس کو طبعی نظر سے سوچ کر گزرا نہیں جاسکتا۔ اسی طرز تفکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعوری یا لاشعوری طور پر انسانی توجهات صرف مادیات پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اور اس بالکل بے نتیجہ کے نتیجہ میں معنویات و اخلاق کی دیواریں کمزور سے کمزور تر ہو گئیں۔

اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ انسان دو ہی تختیوں میں ایک کو بہر حال قبول کرے۔ بلکہ انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت حاصل کرے۔ اور بھلا وہ خدا جس کی رحمت وسیع ہے وہ اپنے بندوں کے لئے سعادت دنیا و آخرت کو کیوں نہ چاہے گا؟ یقیناً خدا اپنے بندوں کے لئے دونوں جہاں کی سعادتوں کو چاہے گا۔

افکار مادی کی دعوت کی دوسری وجہ ضحوت رانی اور خواہشات میں غلبہ جانا ہے جس طرح ہر ذہنی فکر عمل کی بنیاد بنتی ہے اور نظری عقائد انسان کی زندگی میں اس کے خطایس کو معین کرتے ہیں اسی طرح عمل و اخلاق بھی کیفیات ذہن کو متاثر کرتے ہیں بلکہ فکر کی بنیاد بدل دیتے ہیں۔ شہوت پرست انسان تدریجی طور پر خدا پرستی کے بلند و بالا افکار کو اپنے ہاتھ سے دسے دیتا ہے اور جس دن وہ اپنے لئے خدا کے علاوہ کوئی اور محدود عملی اختیار کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ جو کچھ بھی دنیا میں ہے وہ آزاد ہے اور اپنی خلقت کے ہدف و غایت کو قبول نہیں کرتا بلکہ وہ سمجھ ہی نہیں پاتا کہ اپنا اپنا تمام کوشش لذت و شہوت کے حصول میں صرف کرنے لگتا ہے۔ اور پھر اس لذت آمیز سقوط کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکی روح کے جذبہ جہاد کی پگھلائی ٹکھے خشک ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح خدا پرستی کا عقیدہ بھی ایک شیخ کی طرح ہے جو ایسی زمین کو چاہتا ہے جو اسکی نشوونما میں مدد دے۔ اور یہ شیخ پاک و پاکیزہ محیط میں پھونٹتا ہے۔ ایسا محیط

جس میں انسان کے لئے یہ ممکن ہو کہ مخصوص چوکھٹے میں رہ کر اپنے اصلی خطوط کو معین کرتے ہوئے سہولت و سرعت کے ساتھ اپنے بلند و برتر کمال کو حاصل کر سکے۔ اگر خدا پرستی کا عقیدہ ایسے ماحول میں ہے جو اس کے لئے مائدہ ہے تو کبھی بھی تہیج و خش نہ ہوگا۔

زندگی کی پیماہو اور غواہ، بشیخی و صنعتی پیدائش اور کی کثرت، ثروت و قدرت کی نیابتی کمال و جہاں کا ہر جگہ وجود و مشہورتوں کے وسائل کی فراوانی نے انسان کو اتنا غافل بنا دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھول گیا ہے اور وہ اپنی پوری طاقت اس بات پر صرف کرتا ہے کہ اپنے کو دین و دنیا اور اس کے مسائل سے کسی بھی طرح بچائے سکے اور کسی بھی قیمت پر کنٹرول کوئے والی طاقت کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھ کوئی مادی نفع نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے پیس و خواہش کے طوفان کے سامنے وہ ایک رکاوٹ بن جاتا ہے۔

اسی لئے جس جگہ کے لوگ گناہوں میں ڈوبے ہوں اور قید و بند سے آزاد ہوں اور عمل و کردار میں کسی ضابطہ کے پابند نہ ہوں وہاں پر صرف مذہب کا نام ہی نام باقی رہ سکتا ہے اور کام جوا اور مادہ پرست حضرات کبھی بھی خدا جزا اور خدا پرست نہیں ہو سکتے۔ اور فطری بات ہے کہ مادی اور الہی دو فکروں میں جب ایک فکر فضا پر چھا جائے گی یعنی انسانی ذہن میں بیٹھ جائے گی تو دوسری فکر کی وہاں جگہ ہی باقی نہ رہے گی۔ لہذا یا تو مادی خواہشات روح عبودیت خدا کو انسان سے دور کر دیں گی اور یا عبودیت خدا مادیت کو بھگا دے گی اور جب خواہشات نفس مغلوب ہو جائیں گی اور سعی مسلسل الہی مقاصد کی طرف انسان کو سٹے جائی تو انسان اپنے مادی اقدامات کو ترک کر دے گا اور فطرت کے قید و بند سے آزاد ہو کر انسانی حریت کا ایک کامل نمونہ بن جائے گا۔

اور انسان کا ہدف جتنا بلند اور دور ہوتا ہے اس کی طرف چڑھنا اور اس کے لئے کوشش کرنا بہت زیادہ اور طولانی ہوتا ہے۔ پس اگر ہم خدا کو اپنا ہدف بنالیں تو وہ ہدف و مقصد بھی بہت بلند ہے اور اس تک پہنچنے کا راستہ بھی بے انتہا روشن و مستقیم ہے۔ اور

بہت سے مسائل و مشکلات کا جواب دنیا بھی آسان ہو جائیگا۔ اور نفی طاغوت نفس کے زیر سایہ آزادی بھی جنم لے گی۔

اگر ہم خدا کو بعنوان مقصد و ہدف قبول کریں تو تکامل و آزادی کے درمیان تقابلی بھی ہو جائیگا اور تکامل کی خاطر بشر جو رنج برداشت کرتا ہے اور جو عاش و جستجو کرتا ہے وہ حیات ابدی کے عقیدہ اور انگیزہ الہی کے ساتھ اپنے مفہوم کو حاصل کرے گا۔ خدا کی بندگی سے جو تکامل حاصل ہوتا ہے وہ نہ تو حریت سے منکر آتا ہے اور نہ انسان کی غلامی و بندگی کا سبب بنتا ہے۔

ہم کسی وقت آزادی کا دعویٰ کر سکتے ہیں جب ہمارے ساتھ کائنات کے سیرنگامی میں عزم مکمل و شخصیت صلاحیت کے ساتھ شریک ہوں۔ فطرت کے دستور یا تاریخ کے جبر کی بنا پر نہ ہوں۔ کیونکہ فطرت کی خواہش کے مطابق ساتھ دنیا معلوت و منفعت کے برخلاف ہو کر فطرت کی اسیر کی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور جو تکامل جبر و اکراہ کے ساتھ فطرت کی پیروی کر کے حاصل ہو وہ ایک اندھی تقلید کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

مکتب مادی جو تکامل و سعادت فطرت کے قید و بند سے خارج ہو جائے تو سمجھتا ہے۔ ہم اس مکتب میں حریت و تکامل کے درمیان تناقض محسوس کرتے ہیں۔ جس تکامل کو انسان بطور وظیفہ بڑی کوشش و تلاش سے اس کی پیروی کرے لیکن اس کے آئندہ نتائج و ثمرات سے کوئی فائدہ نہ اٹھا وہ کیا مفہوم اور کیا معنی رکھتا ہے؟

کیا سعی و کوشش — اگرچہ انسانی عوامل کی بنیاد پر ہو — اس شخص کے لئے جو مبداء وجود کا قائل نہ ہو لغو اور بیکار نہیں ہے؟ چاہے وہ معاشرہ کے لئے کتنی ہی نفع بخش اور مفید ہو۔ کیا وہ ایک لغو اور غیر منطقی عمل محبوب نہ ہو گا؟

اگر میری قرآن الیٰ کمال انسانیت اور تکامل نوبہ بشر کے لئے ہو۔ لیکن اس قرآن الیٰ سے شخصی طور پر مجھے کوئی فائدہ نہ پہونچے تو یہ مقصد خلاف حریت بھی ہے اور خلاف منطق و عقل بھی! مادی مدیس کے زعماء جو یہ خیال کرتے ہیں کہ تکامل و قید و بند کے درمیان ایک تضاد

تضاد ہے۔ ان کی نظریہ حقیقت اسی مادی مکمل کی طرف ہے جو الہی نہیں ہے اور واقعہ نفس
الامر میں جس کا کوئی مقصد و ہدف نہیں ہے۔

خدا کے صفات اور خصائص

قرآن خدا کی کس طرح توصیف کرتا ہے؟ جس وقت ہم کسی علمی شخصیت اور دانشمند مولف کی حدود و معلومات کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو اس کے علمی آثار کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کو مورد تحقیق قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم کسی فنی کار کی قدرت و استعداد کا اندازہ لگانا چاہیں تو اس کی فنی توجہات اور مصنوعات کی تحقیق کرنی پڑے گی۔

اسی طرح اگر ہم خدا کے صفات و خصائص کا ادراک کرنا چاہیں تو اس کے موجودات و مخلوقاتِ دقیق میں تدبر کرنا پڑے گا تب کہیں جا کر اپنی مسببیت خالق کی حکمت و حیات و قدرت و علم کا اندازہ لگا پائیں گے۔

اگر بحث یہ ہو کہ خدا کی ہر لحاظ سے اور مکمل طور سے معرفت حاصل کرنی چاہئے تو پھر ہم کو یہ قبول کر لینا چاہئے کہ انسانی قوتِ معرفت اپنی جامع شدت پروردگار پر قادر نہیں ہے اور نہ ہی اسکی خصوصیات کے حدود و سرحد کو پہچانا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہر قیاس و تشبیل غلط ہے کیونکہ پوری کائنات میں بشر کے لئے علمی و فکری لحاظ سے جو چیز مشہور ہے وہ سب کی سب خدا کی مصنوع اور اس کے امر و امداد کی محصول ہے اور خود اسکی ذات نہ جزو طبیعت ہے اور نہ اس کے مخلوق کے سنج سے ہے تاکہ اس قسم کے وجود کی ناپیت کا ادراک از دوسرے قیاس ممکن ہو سکے۔

خدا ایک ایسا وجود ہے کہ جس کی معرفت ذات کے لئے نہ تو کوئی مقیاس ہے اور نہ اسکی قدرت یا علم کی مقدار کا اندازہ لگانے کے لئے کوئی عدد ہے اور نہ ہی احصا کا کوئی طریقہ ہے پھر کیا ایسی صورت میں اس کی حقیقت ذات یا صفات کا ادراک کرنے کے لئے افسانہ عاجز و

خیر نہیں ہے۔ !

لیکن کامل و وسیع و عتیق معرفت کی عاجزی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم کسی بھی طرح اسکی معرفت حاصل ہی نہیں کر سکتے یعنی معمولی معرفت بھی نہیں حاصل کر سکتے۔ کیونکہ نظام وجود میں جو چیزیں اس کے صفات کو بتا رہی ہیں۔ اور ہمارے بس میں یہ بات ہے کہ مظاہر فطرت و جمال طبیعت میں غور کر کے اسکی قدرت و ابداء کو پہچان لیں۔ ارادہ و شعور، علم و آگاہی، نظام وجود میں ہم آہنگی، فہم و فہم کے گونا گوں مظاہر ہمارے لئے اس امکان کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ مہیا ہم نہ کر رہے اور تمام وہ چیزیں جو مقصد و ہدف کی حکایت کرتی ہیں یہ کسی ایسے خالق کے ارادہ کی تابع ہیں جو ان تمام خصائص سے متصف ہے اور جسکی قبضہ قدرت میں یہ بھی ہے کہ اس عالم کے موجودات کو برعکس کر دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز خدا کی مشافت کر سکتی ہے اور اسکی وجود کو لمس کر سکتی ہے۔ وہ وہی عجیب و غریب قوت مگر ہے جو اسی ضیع نازلہ کے فرمان کی ایک بھلی ہے جو مادہ پر چمکی ہے اور وہی فرمان ایزدی ہے جس نے فکر کو اور اسکی معنی اور نفوذ الی التحقیقہ کی طاقت بخشی ہے۔ اور اسی مہریت غیبیہ سے معرفت حق بتائی جاتی ہے۔

● اسلام میں خدا کی معرفت جدید اور واضح بنیادوں پر رکھی گئی ہے۔ اور قرآن — جو مصدر اسکی ہے — شہادتِ جہاں یعنی اسلام کے لئے — اس مسئلہ کا حل بطور سوال و جواب نفی و اثبات کے درمیان کرتا ہے۔ قرآن پہلے تو واضح دلیلوں سے پروردگارِ مان؛ اطل کی نفی کرتا ہے۔ کیونکہ توحید تک پہنچنے کے لئے شرک اور ماسوی اللہ کی بندگی کے حجابات کا اٹھنا ضروری ہے۔ اور یہ پہلا قدم ہے جو توحید تک پہنچنے کے راستہ کو ہمارا کرتا ہے۔

قرآن اعلان کرتا ہے :

أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُلُوبًا مِثْلَ قُلُوبِنَا أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً؟ قُلْ هَاتُوا بُحَائِكُمْ هَذَا ذِكْرٌ مِّنْ

مَعْنَى وَذَكَرْ مَنْ جَاءَ مِنْكَ الْكُفْرَ هُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقُّ فَهُمْ مُّعَذِّبُونَ (انبیاء/۱۶)
 کیا ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر کچھ اور معبود بنا رکھے ہیں؟ (اے رسول) تم کہو کہ بھلا
 اپنی دلیل تو پیش کرو جو میسر (زمانہ میں) ہیں۔ ان کی کتاب (قرآن) اور جو لوگ مجھ سے
 پیسے تھے ان کی کتابیں (توریت و انجیل) یہ (موجود) ہیں (میں) میں خدا کا شریک بنا رہا
 بلکہ ان میں سے اکثر توقع (بات) کو جانتے ہی نہیں (تو جب خدا کا ذکر کرتا ہے) بگو کہ
 منہ پھیر لیتے ہیں۔

نیز اعلان کرتا ہے :-

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ لَكُمْ مُضْتَرٌّ أَوْ تَنْفَعُكُمْ وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ
 هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (مائدہ/۷۵)

جس شخص کا علاوہ توحید سے ختم ہو جاتا ہے وہ عالم و جہود میں اپنے رابط اور موقعیت کو بھول جاتا
 ہے اور خود اپنے سے بیکار ہو جاتا ہے اور اپنے کو گم کر دیتا ہے۔ اپنے سے بیکارگی کی آخری صورت
 یہ ہوتی ہے کہ انسان فطرت انسانی سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے۔ اور مختلف اندرونی و بیرونی عوامل
 کی تاثیر کی وجہ سے انسان اپنی ذات و فطرت سے اجنبی ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان اپنی ذات
 سے اجنبی ہو جاتا ہے تو اپنے خالق سے منقطع ہو جاتا ہے اور دوسری بندگی میں داخل ہو جاتا
 ہے اور عقل و منطق کے بدلہ اس بندگی کو قبول کر لیتا ہے اور یہی چیز منظر طبیعت کو خدا بنانے
 کی طرف بازگشت ہے۔ اب خواہ ہم قبول کو سمجھ کریں یا اصالت مادہ کے قائل ہو جائیں دونوں
 باتیں ارتداد اور رجعت قبحہ کی ہیں اور یہ چیز انسان سے عامل رشد کو چھین لیتی ہے۔

ایسی صورت میں توحید ہی وہ تہا قوت ہے کہ جس کے ذریعہ انسان اپنی موقعیت کو واپس
 پالیتا ہے اور طبیعت انسانی اور ماییت ہستی سے ہم آہنگی کے ذریعہ اپنے وجود کو کمال بخشتا ہے
 تاہم سچ میں دیکھتے تمام باتیں اور آسمانی الہی سیانیں الوہیت و ربوبیت و توحید کا پیغام
 لیکر اپنے مشن کا آغاز کیا کرتی تھیں۔ انسانی لغات کے اندر توحید سے زیادہ پر معنی لفظ دیکھی ہی نہیں

جو اپنے دامن میں ایسے سائنہ معاصر جمائے ہوئے ہے جو حیات انسانی کے مختلف گوشوں پر محیط ہے اور اس کو تحریکات سے بچاتا ہے۔

قرآن و افصح دلائل کے ذریعہ ذاتِ متعدی ربوبی کی شناخت و معرفت کے راستہ بتا رہا ہے۔

أَمْ خَلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمْ الْخَالِقُونَ؟ أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ؟
بَلْ لَا يُؤْقِنُونَ (الطہ ۳۵-۳۴)

کیا یہ لوگ کسی کے (پیدا کئے) بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہی لوگ (مخلوقات) پیدا کر رہے ہیں۔ یا انھوں نے ہی سارے آسمان و زمین پیدا کئے ہیں و (نہیں) بلکہ یہ لوگ یقین نہیں رکھتے:

قرآن نے دو معروضوں کے بطلان کو عقل و فطرتِ سلیم کے معائنہ کر دیا ہے:

۱۔ انسان خود بخود عدم سے وجود میں آگیا۔
۲۔ انسان خود اپنے کو پیدا کر سکتا ہے۔ تاکہ ان اس کو اپنے عقلی معیار پر پرکھے اور اس کی تکمیل کرے۔ اور آیاتِ الہی میں غور کر کے قطعی اور یقینی صورت سے صبیح وجود کو قرار کرے۔ اور یہ سمجھے کہ کائنات کا وجود ایک مدبرِ منتظم کے بغیر ممکن ہے۔

دوسری آیتوں میں تدبیرِ بھی پیدا شدہ اور کیفیتِ تخلیق کی طرف انسان کو متوجہ کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ بدیعِ آفرینش اپنی عجیب منفعت و تدبیر کے ساتھ اس خداوندِ قدوس کے آثار اور اس کی نشانیاں ہیں جس کی قدرت اور جس کا ارادہ لامحدود ہے چنانچہ ارشادِ باری:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سَلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ، ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَبَارَكُ اللَّهُ أَحْسَنَ

الْخَالِقِينَ۔ (المومن ۱۵-۱۶-۱۷)

اور ہم نے آدمی کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے اس کو ایک جگہ دعوت کے رحم میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم ہی نے نطفہ کو جہاں خون بنایا۔ پھر ہم ہی نے منہ خون کو گوشت کا نوختہ بنایا پھر ہم ہی نے نوختے کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہم ہی نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم ہی نے اس کو (روح ڈال کر) ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔ تو (سبحان اللہ) خدا بابرکت ہے جو سب بنانے والوں سے بہتر ہے۔

جس وقت جنین نقاشی و صورت بندی کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ تمام اعضا اکٹھے، کان، مفتر اور دیگر اعضا اپنے مخصوص وظیفہ کو اپنے ذمہ لیتے ہیں۔ قرآن ان فنوں کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ کیا یہ عجیب و غریب تحولات خدا کے بغیر معقول اور قابل قبول ہیں؟ یا یہ خواہر قطعی طور سے اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا وجود دقیق ہندسہ، صحیح قیادت، علم ارادہ معین پروگرام پر مبنی ہے؟ خلاصہ یہ کہ کیا سٹو لکے بدن کسی بزرگ مدبر کے بغیر اپنے وظیفہ سے آشنا ہو جاتے ہیں؟ اور اپنے مقصد کو اس دقیق و منظم، حیرت انگیز طریقہ سے جہاں ہستی میں شکل کرتے ہیں؟ قرآن خود اس کا جواب دیتا ہے:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ يَوْمَ تَوَلَّىٰ وَرَاۤءَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَنِ الْعَرْشِ ۚ (عشر ۲۳)

وہی خدا (تمام چیزوں کا) خالق، موجد، صورتوں کا بنانے والا ہے۔

بس وہی اجزائے علیہ کا خالق ہے اور وہی ہر عضو کے اجزاء کا پیدا کرنا والا ہے اور وہی صورت مختلف کا موجد ہے۔

ڈاکٹر کمال (Dr. Khalil) کہتا ہے:

”انفاد کی ترکیب بچوں کو سنائے جانے والے قصوں اور کہانیوں میں جنات سے زیادہ

عالموں کے معنی میں زندہ و محسوس و متحرک موجد کے ہیں جو زندہ موجودات کے بدن کا اصلی مفرقہ ہیں جس طرح وہ ہے۔

مشابہ ہیں۔ اور یہ سلو لھائے بدن کا کار نامہ ہے جو گویا اس بات سے واقف تھے کہ اعضا کو اس شکل و صورت میں ہونا ہے اور یہ اپنے محیط داخلی کی مدد سے طرح ساختمان اور مصالح کا گراں کو آئادہ کرتے ہیں۔

ہر اس محسوس چیز کو جسے انسان اپنے ارد گرد دیکھتا ہے۔ ان کے بارے میں قرآن پر عنوان سائل اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کے بارے میں وقت نظر سے سوچنا چاہئے اور نتیجہ حاصل کرنا چاہئے ارشاد ہے :-

وَاللَّهُ كَمِ الْأَعْيُنِ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ
فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ الْفَالِكِ
الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ
مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا فَبَيِّنَ فِيهَا مِنْ كُلِّ ذَاتٍ
وَتُفْرِغُ الْوَيْحَ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِينَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ
لَا يَأْتِيَهُمْ لُغُومٌ يَعْقِلُونَ (بقرة ۱۶۳، ۱۶۴)

اور تبارِ معبود تو وہی کیسا خدا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں جو بڑے امہرانِ رحم کریم والا ہے۔ جسک آسمان و زمین کی پیدائش اور رات دن کے بدل میں اور کشتیوں (جہازوں) میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں (مال تجارت وغیرہ) دیا میں لے کر چلتے ہیں اور پانی میں جو خدا نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو مردہ دیکھا، ہونے کے بعد جلا دیا و نشا و آب کر دیا، اور اس میں ہر قسم کے جانور بھینلا دیئے اور ہواؤں کے چلاسنے میں اور ہر قسم جو آسمانی و زمینی کے درمیان (خدا کے حکم سے) گھبراتا ہے۔ (ان سب باتوں میں عقل والوں کے لئے دیکھنی پڑتی ہیں۔)

لے انسان سوچنا چاہئے

قُلْ اَنْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؟ (روم ۲۵)
 اے رسول! تم کہہ دو کہ خدا دیکھو تو سہی کہ آسمانوں اور زمین میں (خدا کی نشانیاں) کیا
 کچھ نہیں۔

قرآن ماریخ بشر، اس کے تحولات، گزشتہ قوموں کے حالات کو صرف اس لئے بیان کرتا ہے
 کہ یہ معرفت کے مخصوص مصادیق ہیں اور اکثر فی حقیقت کے لئے مختلف مسمیٰ بقہ کے فتوحات،
 ناکامیاں، عزت، ذلت، خوشبختی، بدبختی کا بھی ذکر کرتا ہے تاکہ قوانین کی معرفت اور
 دقیق و منظم حسابائے تاریخی کی شہنائی سے انسان خود بھی فائدہ اٹھا سکے اور انسانی معاشرے کی
 بھی سودمند ہو جائے اور ارشاد ہوتا ہے :-

فَاَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ
 عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِيْنَ (آل عمران ۱۳)

تم سے پہلے بہترے واقعات گزر چکے ہیں پس خدا دے زمین پر چل پھر دیکھو تو
 کہ اپنے اپنے وقت کے پیغمبروں کو، بھٹانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

نیز ارشاد ہے :-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، وَكَمْ قَصَمْنَا
 مِنْكُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ كَاٰتٍ ظَالِمَةً فَاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِيْنَ (انبیاء ۱۰۴)

ہم نے تو تم لوگوں کے پاس وہ کتاب (قرآن) نازل کی ہے جس میں (تمہارا بھی) ذکر فرما
 ہے تو کیا تم لوگ (اس کا بھی) نہیں سمجھتے اور ہم نے کئی بستیوں کو جن کے رہنے والے
 کسر کر دیے تھے، برباد کر دیا اور ان کے بعد دوسرے لوگوں کو پیدا کیا۔

قرآن مجید نفس انسانی کو بھی سودمند فکر اور کثیف حقیقت کے لئے ایک دوسرا منبع قرار دیتا

ہے اور اس کی اہمیت کا اس طرح اعلان کرتا ہے :-

سَنُرِيْهِمْ اٰیٰتِنَا فِي الْاَفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی يَسْتَبِيْنُوْهُمْ اِنَّهُ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (مجادلہ ۱۸)

ہم عنقریب ہی اپنی قدرت کا کئی نااطراف عالم میں اور خود ان میں بھی دکھا دیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی تعینا حق ہے۔
 وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُؤْمِنِينَ قَوْلِي أَهْلِيكُمْ أَفَلَا تَبْصُرُونَ (الذاریات)
 اور تعین کرنے والوں کے لئے زمین میں (قدرت خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور خود تم میں بھی ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔

یعنی یہی مناسب و زیباجسم اپنے غایت و فعل و انفعال اور دقیق و ظریف کنیک کے ساتھ کہ جس میں غرائز و قوتوں کے انواع، انسانی و حیوانی متنوع احساسات و عواطف و ادراکات خصوصاً حیرت انگیز قوت تفکر کو ودیعت کیا گیا ہے، اور ابھی تک بشر نے غیر مرئی اور معنوی قوت کی راہ کے شناسخت میں، اور اس کی جسم بادی کے ساتھ کیفیت ارتداد کے سلسلہ میں چند قدم سے زیادہ ترقی نہیں کی۔ اور ابھی تو اس میں معرفت کے فیاض منابع موجود ہیں۔
 قرآن اعلان کرتا ہے کہ اگر تم اپنے نفس ہی میں غور و فکر، تحقیق و تفتیش کرو تو تم کو منبع لا بزال و غیر محدود و بے نیاز اور توانائی بے پایاں تک پہنچا دے گا یہ جان لو کہ وہ حقیقت غیر منہا ہی ہے کہ جس نے ایسے پر بار مجموعہ کو مکمل وحدت کے ساتھ ایک جگہ مرکب کیا ہے اور مرکز ہستی میں لے آیا ہے۔

اس لئے ایسی زندہ نشانیاں اور حجت قاطعہ کے بعد جو خود تم میں ودیعت کی گئی ہیں اور تمہارے اختیار میں ہیں عدم معرفت خدا کے سلسلہ میں تمہارا کوئی بہانہ اور کوئی عذر قابل قبول نہ رہے گا۔
 قرآنی الٰہی صفات کے بارے میں بھی نفی و اثبات کی مدش سے استفادہ کرتا ہے۔ یعنی خدا کے کچھ صفات ایسے ہیں جن کا وہ دارا ہے — صفات ثنویہ — جیسے علم، قدرت، ارادہ اور وجود خدا نہ تو موقوف بالغیر ہے اور نہ موقوف بالعدم اور اس کی ذات کا کوئی آغاز نہیں ہے۔ کائنات گردش میں ہے مگر صورتے اس خدا کے امر و ارادہ و قدرت کے کسی سے طاقت و قوت نہیں نہیں حاصل کرتی۔

ایک ذات یگانہ تمام معنی انگہ اور ترکیب سے منفرہ تمام کمالات کی جامع ہے۔ کیونکہ وجود مطلق لامحدود سے بڑھ کر کوئی کمال نہیں ہے۔ اور اگر اس وجود لامحدود سے خارج کوئی کمال ہوتا تو اس ذات کی محدودیت لازم آتی —

جس طرح تمام موجودات کا ایک ذات واجب الوجود تک منتہی ہونا ضروری ہے باین معنی کہ اس ذات کا وجود از خود ہو کر کسی غیر سے حاصل نہ ہوا ہو بلکہ وہ ذات عین وجود ہو اور تمام وجود اپنے وجود میں اسی ذات اور اسی وجود مطلق سے متعلق ہوں — اسی طرح اس کائنات کے اندر جتنے بھی صفات کمال پائے جاتے ہیں مثلاً حیات، قدرت، علم و غیرہ ان کا بھی ایک حیات و قدرت و علم مستقل مطلق کی طرف رجوع ضروری ہے اور ان تمام صفات کا اسی وجود لامحدود سے فصائل سے ہونا ضروری ہے۔

آئیڈیل خدا کے شرائط

یقیناً خداوند تعالیٰ۔ جیسا کہ قرآن نے بھی کہا ہے۔ محبوب کا حق مطلق کے تمام صفات کا جامع ہے۔ وہ حسن و جمال و کمال کا خالق ہے تمام قوتوں اور قدرتوں کا ایجاد کرنا والا ہے۔ اس کی قدرت ایسا گہرا اوقیانوس ہے جس میں غواص فعل معمولی موجدوں کا باز کچھ بن جاتا ہے۔ اسی نے زمین و آسمان کو گرنے سے روک رکھا ہے۔ اگر ایک سکنہ کے لئے بھی اپنی غایتوں سے چشم پوشی کرے یا اسی کائنات سے صرف نظر کرے تو عالم ہستی بہت سی تبدیلیاں سے بدل جائے اور گرد و غبار بن کر لاپتہ ہو جائے، کائنات کا ہر ذرہ اپنے وجود و ثبات و پائیداری میں اسی پر بھروسہ کرتا ہے۔

وہ تمام نعمتوں، سعادتوں کا بخشنے والا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں ہماری پیشانی ہے وہ جب کسی چیز کو خلق کرنا چاہے تو کہیں کچھ دے دے پس وہ چیز ہو جاتی ہے۔

اس کی ذات سے حق و حقیقت ہے، آزادی، عدالت اور دیگر فضائل و کمالات اسی کے پر تو صفات کا کرشمہ ہیں۔ اُس کی طرف پرواز اور اسی کی بارگاہِ ذوالجلال میں تقرب کا مطلب تمام مخلوق کو ان کے اعلیٰ درجہ میں حاصل کرنا ہے جس سے اس سے لو لگائی اس کو ہمدان، انیس اور پر محبت دوست پایا، جس سے اس پر بھروسہ کیا اس نے اپنی امید کی بنیاد ایک محکم و مضبوط پایہ پر رکھی۔ اس کے غیر سے دل لگانا باطل اور اس کی بنیاد برباد ہے۔

وہ کائنات ہستی کی جزئی ترین حرکت و جنبش سے باخبر ہے۔ وہ ہماری خوشخبری کے خطایہ کو معین کر سکتا ہے۔ وہ انسان کی زندگی اور اس وسیع کائنات میں اس کے روابط کے لئے شریعت عطا کر سکتا ہے کیونکہ ان کے واقعی مصالح سے وہی واقف ہے اور یہ حق صرف پروردگار عالم ہی کو ہے کیونکہ یہ اس کی ربوبیت کا طبعی و منطقی نتیجہ ہے اور صرف الہی برنامه کے مطابق

عمل کرنا ہمارے نفوس کی بلندی کا فیصل ہے۔ اور یہ کیونکہ ممکن ہے کہ ان حقیقت و عدالت سے اتنی محبت کرے کہ اس کے لئے جانی قربانی کرتے پر تیار ہو مگر منبع عدل و حق سے اعراض کرے؟

اگر کوئی وجود پرستش کے لائق ہوتا تو سوائے خالق کائنات کے علاوہ — جو جوہر کائنات ہے — کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی چیز اور نہ کوئی شخص ایسا ہے جو انسان کو اپنا بندہ اور شہر بنائے کیونکہ دیگر تمام اندیشیں نہ تو مطلق ہیں نہ اسیل اور نہ ہی اپنے پرانے کام رکھتی ہیں بلکہ ان کی اندیشہ نبی ہے اور مراتب مافوق کے وسیلہ کا حکم رکھتی ہیں۔

خالق کے لئے عبودیت و بندگی مخصوص ہے اس کی اصلی دلیل یہ ہے کہ اس نے ہم کو نعمتوں سے نوازا ہے اور ہمارے جسموں میں ودیعت کی ہوئی طاقتوں، استعداد اور ہمارے فاعل و ضروریات و امکانات کا عالم ہے۔ لہذا عبودیت صرف اس خدا کے لئے مخصوص ہے جس کی طرف ہر موجود اپنے وجود میں استناد کرتا ہے اور اسی پر اعتماد کرتا ہے۔ اور اسی کی مدد سے کائنات کا قافلہ اسی کی طرف رواں دواں ہے اور اس کا حکم اسی کائنات کے نقطہ نقطہ میں نافذ ہے۔

بنا بریں انبیاء و پرستش مطلق بھی اسی ذات اقدس کے لئے مخصوص ہے جو کائنات کے ذریعہ فزے کے دلی میں موجود ہے۔ اور دوسرے افراد جو ہماری طرح ہیں اور عاجزی و ناتوانی ان کے پورے وجود میں ہے وہ کسی بھی طرح خضوع کے لائق نہیں ہیں۔ اور نہ وہ اس لائق ہیں کہ خدا کے قلمرو میں اپنی زندگی کے اندر فاسقانہ تصرف کریں اور خود انسان اس سے کہیں بزرگ و برتر ہے کہ ان کے سامنے خضوع کرے۔

انسان کو جس وجود کی پرستش کرنی چاہئے وہ خدا ہے وعدہ لا شریک لہ ہے اور اسی کی ذات ایسی ہے کہ انسان پر واجب ہے کہ اپنی ساری کوششوں کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے صرف کر دے اور خدا کے علاوہ کسی بھی محبوب و موجود کی خوشنودی کو خدا کی خوشنودی پر ہرگز مقدم نہ کرے۔ اور اس کا مطلب انسان کی بزرگی اور اس کی قدم و منزلت کا قائل ہونا ہے۔ انسان ایک چھوٹا سا قطرہ ہے اگر یہ قطرہ نہ یا کہ ساتھ نہ رہے تو ہمیشہ معرض طوفان میں

اور ناقب نہ نہ و فساد کی زد میں رہے گا اور آخر کار خشک ہو جائیگا۔ مگر جب اس منبع فیاض سے مل جائیگا تو ہجویت واقعی پائے گا اور جاودانی بن جائیگا۔ اور اس کا خدا اس کی زندگی کا صحیح معنی ہو جائیگا۔ اور تمام حوادث زندگی کے پس پشت اسی کی ذات ہوگی۔ اور اسی جگہ سے ہمارے لئے عوالم افراد کی وسعت و ضمیر کا ان کے اعتداف کے اعتبار سے سمجھنا ممکن ہو جائیگا۔ ہم یا توفیق و شرف و عدالت اور تمام محترم و مستحق فضاہوں کو وحی و خیالی فرض کریں یا بحکم وجدان و قنوت اور ضرورت و واقعی ان کو دیکھنا میں شکاں نہ کریں، دونوں صورتوں میں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس وجود اور کمال مطلق کی حقیقت کھیر کے سامنے جو خیر و حیات و قدرت و تمام ارزشوں کا فیضان کر رہا ہے، حضور و سرچشمہ ہو۔ ہم جو غور کر کے دیکھیں تو معلوم ہو جائیگا کہ عالم کے بے شمار موجودات، اور ہماری وہ ضرورتیں جسکی جڑیں ہمارے وجود کے گہرائیوں تک پہنچی ہوئی ہیں یہ سب کی سب ایک منبع اور ایک نقطہ تک منتہی ہوتی ہیں اور وہ خدا ہے۔ کہ کائنات کی تمام واقعت و بایت کی اضافت و نسبت اسی کی طرف ہے اور سب کا تعلق اسی سے ہے اور جو وجود اس نقطہ سے شروع ہوتا ہے پھر اسی کی طرف پلٹ کر آتا ہے اور تنہا اس کی ذات ہے جو لائق عبادت ہے اور جب بندہ اس کو پائے اور اس کی عبادت کرنے لگے تو اس کو دوست رکھے گا اور اس کے جلال و کمال مطلق کو اس طرح دوست رکھے گا کہ اس کے سر کی کو بھول جائیگا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تمام موجودات عدم سے وجود میں آئے ہیں اور یہ اپنی مدت بقا — چاہے وہ مختصر جو بالائی — میں خالص کے محتاج رہے ہیں اور ان کے چہرے پر مقہوریت اور عدم استقلال کی مہر لگی ہوئی ہے۔

جس معبود کی ہم کو تماشہ ہے کہ مل جائے تو اسکی قربت حاصل کریں اگر وہ ہماری خواہش و نیکالی سے اور خدائی عالم سے جا مل ہو یا ہماری امیدوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہو بلکہ ہماری ہی طرح قاصر و ضعیف ہو تو ہم اس کو بھلا اپنا ہدف و غایت کیونکر بنا سکتے ہیں؟ اور کمال مطلق سے اس کی توصیف کیونکر کر سکتے ہیں؟ عبادت اگر کسی حاجت کے پیش نفس ہے تو صرف

خدا ہی اسکو پوری بھی کر سکتا ہے کوئی دوسرا پوری نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید کا اعلان ہے:

إِنَّ اللَّهَ ذِي الْقُوَّةِ الْعَظِيمِ ۚ يَنْزِلُ فِي السَّمَوَاتِ يَخْفِى ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَهْدِي مَا يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (اعراف / ۱۹۳)

بے شک وہ لوگ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ (بھی) تمہاری طرح رُخ ہٹا کے رہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ خیر خدا کے سامنے حضور یا توجہ کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اور ہمارے معیئر ہوا ہے۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی معبود انسان کی عبادت کا مستحق ہوگا اور انسان کو سعادت کی بلند چوٹی تک پہنچا سکتا ہوگا تو وہ ہر قسم و درجے پاک ہوگا اور اپنی دائمی شعلوں سے موجودات کی زندگی کا مدد و معاون ہوگا اور اپنے جمال سے ہر صاحب خیر کو اپنے سامنے چمکا سکتا ہوگا، انسانی کی تمام روحی و معنوی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہوگا اور اسکی شناخت کا راستہ پائینا سوائے فطرت انسانی کے متباد حقیقی تک پہنچے بغیر ناممکن ہے۔

وہ نہ اگر ہمارا خدا بعض جہات میں ممتاز ہو اور بعض ضرورتوں کو پوری کرنے پر قادر ہو تو جس وقت ہم اپنی ضرورتوں کو پورا کریں تو ہمارے نزدیک صفت الوہیت سے گرجا بیگا۔ کیونکہ اب ہم اس کے محتاج نہیں ہیں۔ اور ہمارے خوف کا سبب ہوگا۔ اور نہ صرف یہ کہ ہماری فطرت پریشانی غیر و عبادت خیر کو تشفی نہ دے سکے گا بلکہ ہم کو کسی بھی بلند و برتر کمال کے بارے میں تفکر سے مانع ہوگا۔ اور ہم کو ایک تنگ و محدود دائرہ میں اسیر و متعید کر دے گا۔ اور پھر مدارج علیا کی طرف ترقی کی ہماری خواہش بھی ختم ہو جائے گی۔ اور اگر ہمارا خدا ہمارے مرتبہ کا ہوا۔ چہ جائیکہ ہم سے پست تر درجہ کا ہو۔ تو ہمارے صلاح کا سبب نہ بن سکے گا اور نہ ہماری ترقی کا وسیلہ ہو سکے گا۔ بلکہ ہم اگر اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اور زیادہ قعر مذلت و انحطاط میں پہنچ جائیں گے اور ہماری مثال اس متناہی عسریب کی ہو جائیگی جو اپنے فطری و طبعی رخ سے اعراض کر کے دوسرے اجنبی عنصر کے حیف متناہی میں داخل ہو جائے جس کا نتیجہ حیرت و پریشانی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اور اس وقت ہمارے لئے ہلاکت و بد بختی ایک ایسی ابدی شہنشاہ بن جائے گی جس سے کبھی بھی مفر ممکن نہیں ہوگا۔

وعاشا کرین کی بہترین علامت ہے۔

وہ معمولہ جوان کی حرکت کو جہت بخش سکتا ہے۔ اور چلنے والوں کے راستے میں تاریکی دور کر کے روشنی عطا کر سکتا ہے وہ وہی خدا ہے جو اس بات پر قادر ہے کہ انسانی آرزوؤں کو پورا کر سکے اور جو دھامِ ثبوت و تاثیر و وجود کے اعلیٰ ترین درجات پر فائز ہوتا کہ آثار معنوی کا منشأ اور فکر و عمل کا ادبی بن سکے اور انسان کے بیشتر کمالی کو تاسانی بنا سکے۔ انسان کی کوئی بھی سعی یا حرکت جو غلط مقاصد کی طرف ہو وہ انسان کو اس کی شخصیت سے دور کرتا ہے اور اس کی ہایت و حقیقت کو سمجھ کر دیتا ہے۔

اگر انسان خدا کی معرفت سے دور ہو چکا ہے تو اپنا صحیح اور اک نہیں کر سکتا۔ خدا فراموشی کا لازمہ خود فراموشی ہے اور حیاتِ بشر کے مقاصد کی سے غافل ہونا ہے۔ اور جس دنیا میں وہ پہنچ چکا ہے اس میں وہ ہر قسم کے بلند افکار سے غافل ہو جاتا ہے۔

جس طرح غیر خدا سے وابستگی انسان کو اپنے سے بیگانہ بنا دیتی ہے اور اس کو ایک متحرک مشین بنا دیتی ہے۔ اسی طرح خدا پر بھروسہ کرنا اور اس کی بارگاہ میں رجوع ہونا، غفلت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے، اور حیاتِ معنوی کے ناقص انسان کو اوقیانوسِ غفلت کی گہرائی سے باہر نکال دیتا ہے اور اس کو ہوش میں لاتا ہے اور اس کو اس کی اصل حالت کی طرف پس دیتا ہے۔ عبادتِ حق کے سایہ میں دوجی صلاحیتیں اور ملکوتی طاقتیں پرورش پاتی ہیں اور انسان اپنی حقیر آرزوؤں اور بے قیمت و محدود مادی امیدوں، اور اپنے اندرونی ضعف و نقائص تک پہنچ جاتا اور ان کی حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے اور اپنے کو ویسا ہی دیکھتا ہے جیسا کہ ہے۔

اَنْ حَرَكْتَ فَنَسَكَ عَنْكَ اَلْبَتَّہُ، جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔

خدا کا ذکر اور اس کا قرب دل کو نورانی اور طلب کو زندہ کرتا ہے اور وہ لذت سے بھرپور ہوتا ہے ایسی لذت جس کا قیاس دنیاوی لذتوں سے کیا ہی نہیں جاسکتا۔ مختصر یہ کہ اس حقیقت معنویہ بجز وہ کی طرف متوجہ ہونے سے انکار میں ترقی ہوتی ہے اور اندشوں کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔ حضرت عیٰیؑ ذکر خدا کا دلوں میں عجیب اثر ہوتا ہے۔ اسکو میانِ فطرت میں خداوند عالم نے ذکر کو دلوں کی جلاہ قرار دیا ہے۔ یاد خدا کے تقویٰ میں دل بہرے ہونے کے بعد سننے لگتے ہیں، اندھے ہونے کے بعد دیکھنے لگتے ہیں، غفلت و کسرشی کے بعد نرم و ملائم ہو جاتے ہیں۔ (شیخ البداء - خطبہ ۶۲)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں : خدا یا تو اپنے دوستوں کے لئے بہترین ایس، اور تجھ پر بھروسہ کر نبیوں کے لئے تو سب سے زیادہ مشکل کشتا، ان کے باطن کو شاہدہ کر نبیوں، ان کی خیر کی گنجائشوں پر واقف، ان کی میزانِ بعیت و معرفت پر مطلع ہے۔ ان کے رائے تجھ پر آشکار ہیں، ان کے دل تیرے قرب میں بے تاب ہیں۔ اگر تمہاری ان کے لئے سببِ وفت و اضطراب ہو تو تیری یاد ان کے لئے مونس ہے اور اگر سختی و دشواری ان پر بار ہو تو تو ان کی پناہ گاہ ہے۔ (شیخ البداء - خطبہ ۱۲۵)

نفسیات کا مشہور عالم - ویلیئم جیمز (WILLIAM JAMES) کہتا ہے : انسان کا عبادت کی طرف رجحان اس امر کا نتیجہ ہے (اور وہ امر یہ ہے) انسان کا ذاتی شعور اگرچہ ذاتی و عملی اختیار کے گہرے قسم سے ہو پھر بھی وہ اپنے مصائب کو دنیا کے فکر ہی میں پاسکتا ہے اور زیادہ تر لوگ خواہ متواتر یا اتفاقاً اپنے دل میں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس طرح زمین پر حقیر ترین فرد اس توجہ عالی کے ساتھ اپنے کو واقعی اور باارزش کر لیتا ہے۔

خدا نے بزرگ و دبیر کی چو کھٹ پر سب اعلیٰ و بلند طریقہ انسان کے شکر کا یہ ہے کہ اس کی عبادت کرے اور اس کو ان مطلق سے اظہارِ محبت کرے۔ اور یہ بھی تمام موجوداتِ مسمیٰ سے ہم آہنگی کا ایک طریقہ ہے کیونکہ سب ہی اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے :-

فَسَبِّحْ لَهُ السَّمَاوَاتِ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ قُرْآنِ مِنْ مَقْشُ
إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ إِنَّهُ كَانَ
خَلِيقًا عَظِيمًا (الاسراء/ ۴۳)

ساتوں آسمان اور جو لوگ ان میں ہیں (سب) اس کی تسبیح کرتے ہیں اور
دوسرے جہان میں، کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے حمد (دُشنا) کی تسبیح نہ کرتی ہو۔
مگر تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا پروردگار بخشنے والا
البتہ تقدیس و پرستش خداوند عالم کو فہم برابر بھی فائدہ نہیں پہونچاتی کیونکہ وہ تو کمال مطلق
ہے۔ اس کے جہان کائنات و انسان کی طرف سے نذرانہ بڑا بڑی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔ اور بھلا یہ کیونکر
سوچا جاسکتا ہے کہ جس خدا نے انسانی کو پیدا کیا ہے وہ اس کی پرستش و تقدیس سے استفادہ کرے گا؟
البتہ خدا انسان حقیقت مطلق کی معرفت اور پروردگار عالم کی عبادت کر کے اپنے کمال واقعی اور
مقصد آخری تک پہونچ سکتا ہے۔

پروفیسر ریمونڈ روایہ (Raymond Roaya) جو فلسفہ کے استاد اور مشہور فیروز دہاتھے وہ
کائنات میں وجود شعور کے سلسلہ میں کہتے ہیں: جدید علم کہتا ہے ذرات اور تمام مالیکیولز جو حرکت
ہیں اس کا علم رکھتے ہیں۔ یہ اپنے اعمال اور زندگی کی مسلسل حرکت کا شعور رکھتے ہیں اور یہ اپنے
اس شعور میں علمائے فیزیا سے زیادہ عالم ہیں، کیونکہ علمائے فیزیا، ایک ایٹم کے باصے میں جو جاتے
ہیں وہ یہ ہے کہ اگر یہ ایٹم محسوس اور قابل شناسائی نہ ہوتا تو کوئی اس کے بارے میں کیا جانتا؟
جسم، حرکت، سرعت، یہاں، وہاں، شعاعیں، توازن، فضا، فاصلہ یہ سب ایٹم
کی برکت سے وجود میں آئے ہیں۔ اور اگر یہ ایٹم نہ ہوتا تو عالم وجود میں ان ظواہر عجیبہ کو کون پیدا
کرنا؟ شعور و جسم میں درہی تناسب موجود ہے جو حرکت و سکون میں ہے اور جو حرکت کے
جہات مثبت و منفی ہیں۔

لیکن یہ فضا اپنے مجموعہ کے اندر اندھی نہیں ہے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو یہ بات ثابت ہو چکی

ہے کہ مشاہدات میں منظر ملی آنکھ ہے لیکن آنکھ حد و قدرت بشر سے محدود ہے اور اس کا تعلق صرف زمین اور زمینی موجودات سے ہے لہذا اس کے فیروز آدمی مل کا میدان بھی محدود ہو گیا ہے۔ اس لئے زمین و سورج، سورج و کہکشاں، کہکشاں اور بہت دور پر واقع ہوتے والے بڑے بڑے کواکب کے درمیان آنکھ کا کوئی من دخل نہیں ہے ایک زمینی عضو کے لئے۔ مثلاً آنکھ۔ کہاں ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کا بھی مشاہدہ کر سکے؟

لیکن اسی دلیل سے ہم اس بات کی تصدیق پر قادر نہیں ہیں کہ قدرت عظیمہ اور تبادل قوی کے میدان میں بھی ولا شعور کا غلبہ ہے۔ قدرت عظیمہ سے مراد مثلاً وہ کہکشاں ہیں کہ جن میں فقط جاذبیت و توازن و حرکات و قوت و سرعت اور مرکز دائرہ سے دوری کے قوانین ہی حکمرانی کرتے ہیں ان میں یہ بے شعوری فنا آگاہی موجود ہے ہم اس کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان موجودات عظیمہ میں بھی اور کوری نہیں ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ وہ ذرات نور جو اپنی حرکت میں ایک پوسٹ میں کام انجام دیتے ہیں وہ بھی اپنے اخبار و اشارات کے پہونچانے میں بے سوا نہیں ہیں۔

صفات خدا قابل قیاس نہیں ہیں

اگرچہ ہم اپنی تمام تر کوشش کے باوجود خداوند عالم اور اس کی صفات کی معرفت کے لئے کچھ ایسے مفہیم و اصطلاح کے محتاج ہیں جو ہماری دسترس سے باہر ہے اور جن اصطلاحات کو ہم اسکی توصیف واقعی کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ ہماری مدد کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ خدا کے لامتناہی اوصاف کی کیفیت کو درک کر لینا ہمارے محدود ذہنوں کے بس سے باہر ہے۔ تمام وہ مفہیم و اصطلاح جو زمین بشر کے ساختہ و پرداختہ ہیں ان سے خدا کبھی بلند و برتر ہے۔

انسان جو کہ ایک مخلوق ہے اور ہر لحاظ سے محدود ہے اس کو اس کے انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ موجود غیر مادی کو مادی صفات و خصوصیات سے تو لایا بیان کیا جاسکتا ہے۔

ہماری بحث اس حقیقت کے بارے میں ہے جو طبعی موجودات و ممکنات کے ماسویٰ ہے اور جس کی قدرت مطلق اور غیر محدود و علم تمام ماسویٰ الہیہ پر محیط ہے اور یہ تعبیر قرآن مجید وہ کسی بھی محدود و ناقص مخلوقات سے مشابہت ہی نہیں رکھتا۔ (شوریہ ۹۱) اور ظاہر ہے کہ ایسا موجود مادی مسائل کے ردیف میں نہیں ہو سکتا۔ موائے کائنات حضرت علیؑ فرماتے ہیں جو شخص خدا کو کسی چیز سے تشبیہ دے یا اس کے مانند قرار دے یا اس کی ذات مقدس کی طرف اشارہ کرے درحقیقت اس نے خدا کا قصہ ہی نہیں کیا ہے۔ خدا فائق و آفریدگار ہے اور جو دوسرے پرشکی ہو وہ معلول و مخلوق ہے۔ مگر خدا تو علت ہے اور سب !

خدا اسباب و وسیلوں کے بغیر خلق کرتا ہے۔ انھارے سے مدد حاصل کئے بغیر اندازہ کرنا ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ وقت و زمانہ اس کے ہمراہ نہیں ہیں۔ آلات و اوزار اس کی مدد نہیں کرتے اس کی ہستی ہر زمانے سے پہلے ہے۔ اس کی ازلیت ہر آغاز و ابتدا سے مقدم ہے۔ وہ غیر محدود

یہ تو موجودات کی صفت ہے کہ اپنے مخصوص حدود کے اندر اپنی ماہیت کو محدود بنا دیتے ہیں۔ اور یہ اجسام کی خصوصیت ہے کہ ان کے نظائر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کی ذات مقدمہ میں مفہوم حرکت و سکون کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اور یہ کیونکہ ممکن ہے کہ جن چیزوں کو اس مخلوق کے ضمن میں پیدا کیا ہے خود اس کے وجود میں موجود ہوں؟ اگر ذات خدا میں حرکت و سکون کا وجود ہوگا تو اس کی ذات عمل تغیر ہو جائے گی اور اس کے وجود کا انہی ہونا محال ہو جائیگا۔

وہ تمام قوتوں کا منبع ہے لہذا کوئی بھی موجود اس میں اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ وہ ایسا آفریدہ گار ہے جو تحول کو قبول نہیں کرتا اور کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اور ان معرفت کی نظروں سے پنہان نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ اس کے بارے میں بحث ایک علمی اور دقیق بحث ہے۔ حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں: ہم نے اسے کیفیتوں والا بھی اس نے اسے کچھ نہیں سمجھا۔ جس نے اس کا نقل قرار دیا تو اس کی حقیقت تک نہیں پہونچا اور جس نے اس کی تشبیہ کی اس نے اس کا راہ ہی نہیں کیا جس نے اس کی طرف اشارہ کیا وہ ہم میں لانا چاہا۔ اس نے اس کو بے نیاز نہیں سمجھا، جو اپنی ذات سے پہچان جائے وہ مصنوع اور جو دوسرے کے سہارے قائم ہو وہ محتاج ہوتا ہے، وہ آات کو استعمال کئے بغیر فاضل ہے وہ فکر کو جولاں کئے بغیر اندازے مقرر کرنا بیوقوفانہ ہے وہ دوسروں سے استفادہ کئے بغیر فنی ہے، نہ زمانہ اس کا ساتھی ہے اور نہ آات اس کے مددگار۔ اس کی ہستی زمانہ سے پیشتر اس کا وجود عدم سے پہلے، اس کی اذیت ابد سے (عالم سے) سابق ہے۔ چونکہ اس نے شعور کی طاقتیں ایجاد کی ہیں اس سے ثابت ہوا کہ وہ شعور کے آات نہیں رکھتا اور چونکہ اس نے امور میں حدیث قرار دی ہے اس سے پتہ چلا کہ اس کی مدد محال ہے۔ اور اس نے چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھا اس سے معلوم ہوا کہ اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے، اس نے نور کو تاریکی کی روشنی کو اندھیرے کی خشکی کو تر کی، اور گرمی کو سردی کی ضد قرار دیا۔ وہ ایک دوسرے کی

وہی چیزوں کو باہم جوڑنے والا، متضاد چیزوں کو ملائے والا، ایک دوسرے سے دور کو قریب کرنا والا، اور مٹی ہوئی چیزوں کو الگ الگ کرنا والا ہے۔ وہ کسی حد میں محدود نہیں ہے۔ وہ شمار میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ مادی چیز میں ہمیشہ مادی چیزوں کو گھیرا کرتی ہیں۔ اور اپنے عیسوی طرف اشارہ کیا کرتی ہیں۔

پروردگار عالم کے صفات اور ہمارے صفات میں جو فرق ہے اور دونوں قیاس کے ناممکن ہونے کی وجہ ہے وہ یہ ہے کہ منبع وجود میں جو صفات ہیں ان کے مقابلہ میں جو موجودات ہیں جو صفات پائے جاتے ہیں ان کے مقابلہ میں بہت تفاوت ہے۔ مثلاً ہم بعض اعمال پر قادر ہیں لیکن ہماری قدرت ان اعمال پر اس طرح کی ہرگز نہیں ہے جیسی خدا کی قدرت ان پر ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں قدرت اور ہے اور اس کا موصوف اور ہے یا جس وقت ہم اپنے علم کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ہم اور ہمارا علم دونوں ایک چیز نہیں ہیں کیونکہ زمانہ طفولیت میں ہم تھے مگر ہمارا علم نہیں تھا۔ ہم نے تو بعد میں اس کو رفتہ رفتہ کر کے حاصل کیا ہے۔ تو معلوم ہو کہ علم اور قدرت ہمارے وجود سے الگ چیزیں ہیں اور یہ صفات — علم و قدرت — ہمارے عین ذات نہیں ہیں اور نہ ہمارے وجود سے منقطع ہیں۔ بلکہ یہ صفات عارضی ہیں اور ہمارا وجود معروضی ہے اور دونوں کا حساب الگ الگ ہے۔

لیکن خدا کے یہاں صورت عالی اس کے برعکس ہے کیونکہ جب ہم کہتے ہیں خدا علم ہے یا خدا قادر ہے تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا علم و قدرت کا منبع ہے اور یہاں صفت اور موصوف والا قصہ نہیں ہے اگرچہ مفہوم صفت و موصوف شمار میں نہ آتا ہے۔ لیکن صفات خدا عین ذات خدا ہیں، اس لئے کہ ان کوئی واسطہ نہیں ہے جس پر صفت جا کر عارض ہو بلکہ خدا وجود و مطلق ہے جو عین علم و قدرت ہے عین حیات و ثبوت ہے۔ اس کا مادہ عقل یا غائی نہ کوئی حد نہ قید۔

اور اس قصہ یہ ہے کہ ہماری تربیت فطرت و طبیعت کے گود میں ہوئی ہے۔ ہم نے اسی علم و زندگی و ہوش آنکھ کھولی ہے اور نظام فطرت سے ہمارا مسلسل انس رہا ہے اور یہاں ہم نے جو بھی چیز دیکھی ہے اس کے مخصوص العباد و اسکا میں زمان و مکان ہے اجسام کے خواص ہیں

ان خواہر حضرت کے مفہیم سے ہمارے اذعان کے انست کی وجہ سے ہم اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ ہر چیز کا قیاس اسی پیمانہ سے کریں۔ بلکہ علمی و فلسفی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے عقل و فہم کا مفہیم بذات اول سے ہمیں سے ناشی ہوئے ہیں۔

اس لئے ایک ایسے وجود کا تصور جس میں مادہ کی کوئی بھی خاصیت نہ ہو یا بن معنی کہ ہم اپنے ذہنوں میں جو کچھ بھی سوچیں وہ وجود اس کا غیر ہو۔ اور ایسی ذات کے صفات کا ادراک کرنا جس کے صفات اس سے کبھی کسی بھی طرح جدا نہ ہو سکتے ہوں۔ علاوہ اس کے کہ یہ خود بہت ہی مشکل امر ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے اذہان مکمل طور سے مادی موجودات کے تصور سے بالکل خالی ہوں۔ حضرت علیؑ کا اس مسئلہ میں ایک بہت ہی پر معنی عمیق و دقیق بیان ہے جس میں آپؑ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اللہ کی تعریف قیود و اوصاف میں کرے جس طرح کہ وہ تصور کرتا ہے۔ فرماتے ہیں: خدا کی کمال توحید یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے کیونکہ ہر صفت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وہ موصوف کی غیر ہے جس نے خدا کی صفت بیان کی اور انہما یکہ اس کے لئے صفت زائدہ کا قائل ہو تو، اس نے گویا خدا کا مہدم و قرین بنادیا اور جسے خدا کا قرین و مہدم بنادیا اس نے خدا کے اجزاء قرار دیئے اور جسے اس کے لئے اجزاء قرار دیا وہ خدا سے جاہل ہو گیا۔ (رہلہ غیبیہ، ج ۱، ص ۱۷۷)

ذہنی مفہیم میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ صفات کے حدود میں خدا کی تعریف کر سکیں یا جس طرح مفہوم اپنے مصداق پر منطبق ہوتا ہے اسی طرح صفات وجود خدا پر منطبق ہو جائیں یہ ناممکن سی بات ہے۔ کیونکہ تمام صفات و مفہیم اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے دیگر صفات سے متماثل ہوتے ہیں۔ مثلاً حیات کا مفہوم قدرت کے مفہوم سے بالکل اجنبی ہے اور ایک مفہوم دوسرے پر منطبق نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا مخصوص مصداق مل جائے جس میں یہ تمام صفات متعلق ہوں۔ لیکن اصطلاحی کلمہ تو اپنے مخصوص معنی ہی پر منطبق کیا جائے گا۔

جس وقت انسانی عقل یہ چاہتی ہے کہ کسی چیز کی توصیف کسی صفت سے کرے تو باوجود

اس کے کہ اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ازلی یا مصادیق موصوف و صفت میں ایک قسم کی وحدت نوعی برقرار رکھے۔ لیکن چونکہ صفت مفہوم موصوف کے معیار ہے اس لئے خواستہ و خواستہ بہر حال دونوں میں معیاریت کا حکم لگانا ہی پڑتا ہے اور چونکہ اشیاء کے شناخت کا واحد ذریعہ معیاریم ذہنی ہے ان کی توصیف کرنا ہے جو از نظر تصور مکمل طور پر ایک دو سرے سے جدا ہیں اور ان اوصاف کا لازم محدودیت ہے بنابرین وہ معیاریم ذہنی اس حقیقہ متعالیہ کی تعریف یا معرفت سے قاصر رہتے ہیں۔ اور وہ ذات اقدس اس سے کہیں بلند ہے کہ وصف سے اسکو پہچانا جاسکے۔ اس لئے یہ بات کہی جاتی ہے کہ جو خدا کی تحدید و وصف سے کرتا ہے سمجھ لو کہ اس نے خدا کو پہچاننا ہی نہیں بلکہ ایک مثال دیکر کسی حد تک یہ سمجھانے کی کوشش کر لیا گئے کہ صفات خدا از ابد پر ذات نہیں ہیں۔ آپ سوچئے کہ آگ کا شعلہ ہر چیز کو گرم کر دیتا ہے۔ یعنی آگ کی کیفیات میں سے ایک کیفیت سو زندگی اور حرارت کا منتشر کرنا ہے۔ کیا آگ کی یہ خصوصیت شعلہ کے کسی خاص حصہ میں مخصوص ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ شعلہ جو بھی ہے اس کا پورا وجود یہی خاصیت رکھتا ہے۔

ایک شخص نے اہم نشیتم سے پردہ و گار کی حقیقت کے بارے میں پوچھا تو حضرت نے فرمایا: وہ ایک ایسی چیز ہے جو تمام اشیاء کے معیار ہے۔ وہی تمہا میں حقیقت وجود ہے۔ وہ نہ جسم رکھتا ہے نہ صورت اور نہ حواس خمسہ سے محسوس کیا جاسکتا ہے اور نہ راہ کاوش و جستجو سے اس کو پایا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ حواس پنجگانہ میں سما سکتا ہے۔ اولہم و تصورات اس کے اور اس کے عاجزی میں، زمانہ و دہر اس میں کوئی کمی نہیں کر سکتے۔ اور نہ وہ معرض تغیر و تحول میں کبھی ہو سکتا ہے۔ (اصول کافی، کتاب توحید ص ۱۸)

پال کلارنس (PAUL CLARENCE. A) - جو اجتماعی فیئر بار کا بہت بڑا عالم تھا وہ کہتا ہے: کرب مقدس - توہیت و انجیل - میں جب بھی خدا کی تعریف کی جاتی ہے تو انجیل الفاظ سے کی جاتی ہے جو انسان کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات

لغات کے نکلے دامان کی وجہ سے ہے۔ وہ نہ مفہوم خدا ایک روحی و معنوی مفہوم ہے اور انسان
 — جس کے افکار مادہ کی چہار دیواری میں محصور و محدود ہیں — کہ ذات الہی تک پہنچ
 ہی نہیں سکتا۔ اور نہ مفہوم خدا کی کوئی تعبیر بیان کر سکتا ہے۔
 اس کے باوجود کہ ہم کسی بھی طرح خدا کی ذات و صفات کے احاطہ پر قدرت نہیں رکھتے
 ہم کو کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارے امکانات ہم کو جس حد تک بھی اجازت دیں اس کی معرفت
 کے راستہ میں قدم بڑھائیں۔

خدا کی یکتائی

جب کبھی مذہبی بحثوں میں توحید کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو اس سے خداوند عالم کی ذات و صفات میں، کائنات پر حکومت اور افعال اور نظام عالم کے ادارہ میں اور دوسری جہتوں میں بھی یگانگی اور وحدانیت کا عقیدہ مراد ہوتا ہے۔

جس طرح توحید ذات میں تعدد کا تصور ممکن نہیں ہے اسی طرح توحید صفات میں بھی ترکیب اور ذات و صفات میں اختلاف بھی قطعاً منافی ہے۔ کیونکہ اختلاف محدودیت کے لوازم میں سے ہے۔ اور خدا کی ذات اور اس کے صفات غیر محدود ہیں۔ اور ہم جو ذات خدا اور اس کے صفات میں تشکیک کے قائل ہوتے ہیں وہ محض ہمارے افکار و مضامعات کی وجہ سے ہے ورنہ ذات پروردگار میں تعدد و جہات و اضافات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اگر ہم کسی چیز کو رنگ برنگ شے بشوں کے پیچھے سے دیکھیں تو ہم مرتبہ وہ چیز الگ رنگ میں دکھائی دے گی۔ اسی طرح جب ہم اپنی عقلوں سے ذات پروردگار عالم کی طرف دیکھتے ہیں تو کبھی اس لحاظ سے کہ اس کے سامنے تمام موجودات حاضر ہیں اس وجود لامتناہی کو عالم کہتے ہیں اور جب اس لحاظ سے نظر کرتے ہیں کہ وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے تو اس کو قادر کہہ دیتے ہیں۔

اسی بنا پر ہم چونکہ اپنے مختلف صفات کو جو ہمارے محدود وجود کی خاصیت ہے۔ جب رنگ برنگ و تپخوں سے دیکھتے ہیں تو انہیں مفاہیم کو اس ذات نامحدود سے انزع کرتے ہیں۔ حالانکہ خارج میں یہ تمام مفاہیم یک وجود رکھتے ہیں اور ایک حقیقت کی خبر دیتے ہیں اور وہ حقیقت وہی ہے جو ہر نقص و عیب منزو ہے۔ اور جو تمام کمالات کی مظہر ہے جیسے قدرت، رحمت، علم، برکت، حکمت، جلال و غیرہ

جب ہم نے یہ جان لیا کہ خدا کا وجود بذاتہ ہے تو اب یہ جاننا چاہئے کہ وجود مطلق تمام جہات سے غیر محدود ہے۔ کیونکہ اگر اسی کا وجود و عدم دونوں برابر ہے تو اس کے وجود کے لئے خارج سے ایک علت کی ضرورت ہوگی جو اس کو موجود کرے۔ کیونکہ وجود خود بخود تو ممکن نہیں ہو کرتا اس لئے کہ صرف ایک وجود محض ہے جس کا وجود ذاتی ہے۔ اور چونکہ ذات عین وجود ہے لہذا وہ مسلم، قدرت، ازلیت، ابدیت کے لحاظ سے غیر محدود ہوگا، اس لئے کہ علم و قدرت بھی ایک قسم کے وجود ہیں۔ اور جو ذات عین وجود ہو کرتی ہے اس کے لئے یہ سارے کالات بطور غیر محدود ثابت ہو کر رہتے ہیں۔

خدا کی یکتائی اس کے واضح صفات میں سے ہے۔ تمام آسمانی ادیان نے اپنی اصلی اور غیر تحریف شدہ تعلیمات میں بشریت کو خالص توحید — جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہو — کی طرف دعوت دی ہے۔ کیونکہ شرک اپنے تمام صور و ایما کے ساتھ بشر کے لئے سب سے زیادہ مضر و مسموم گمراہی ہے۔ جو طول تاریخ میں جہالت و نا اگاہی اور عقل کی رنجائی سے انحراف اور انبیاء کے مکتب توحید سے اعراض کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

اگر لوگ فکر صحیح اور دلائل عقلی و انبیاء کی راہ نمائی کی پیروی کر کے خدا پر ایمان لاتے تو کسی بھی موجود و مصنوع غیر خدا کو خدا کی جگہ قبول نہ کرتے۔ اور نہ کوئی دوسرا موجود خدا کی تدبیر و تقدیر و امر کے ساتھ شریک ہو سکتا۔

ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اللہ واحد ہے تو اس سے حسیت مراد نہیں ہوتی کیونکہ جسم تو کئی خفرو اور اجزاء سے مرکب ہوا کرتا ہے اور ہم تو اللہ سے ترکیب، تجزیہ، تو اللہ کی نفی کرتے ہیں کیونکہ یہ چیزیں ممکن کے صفات ہیں۔ اور ہر وہ مرکب جو ترکیب سے پیدا ہوا ہو وہ نہ خدا ہو سکتا ہے نہ شبیہ خدا۔

خدا کے لئے متعدد معادیقی کا تصور اس وقت ممکن ہوتا۔ جب اس پر کثیت، کیفیت،

زمانہ، مکان جیسے صفات کا صدق ممکن ہوتا۔ اور خدا ان اوصاف و قیود میں سے کسی سے بھی نہیں ہے لہذا فطری طور پر اس کے لئے کسی مشابہ یا مثل کا بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔
 اگر کسی قید کے بغیر حقیقت آپ کا تصور کریں اور کئی مرتبہ اسی تصور کو دہرائیں تو پہلے تصور پر کوئی چیز نہ پادہ نہیں ہوگی۔ کیونکہ ابتدائی میں پانی کا تصور بطور مطلق کسی بھی قسم کی قید و شرط و کیفیت و کیفیت کے بغیر کیا تھا۔ دوسرے اور تیسرے تصورات میں حقیقت آپ کی دو فردوں کا فرض کرنا ممکن ہے۔

لیکن اگر حقیقت آپ سے خارج قیود کا اضافہ کر دیں تو اس کے بہت سے افراد ہو جائیں گے اور مواد و مصالح کی تعدد اس کے ساتھ آپ بھی متعدد ہو جائیں گے۔ مثلاً بارش کا پانی، چشمہ کا پانی، نہر کا پانی، سمندر کا پانی، مختلف نالوں اور مکالوں میں یہاں اور وہاں کی قید سے افراد بڑھتے ہی جائیں گے لیکن جب قیود کو حذف کر دیں اور صرف اس حقیقت آپ کو ملحوظ رکھیں تو اس میں تعدد ناممکن ہو جائے گا اور صرف ایک ہی حقیقت رہ جائے گی۔

اسی طرح یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جو موجود کسی مکان میں ہوگا وہ خود بخود مکان کا محتاج ہوگا۔ اور مکان کے اندر رہنے والا موجود اپنے وجود میں ظرف زمانہ و مکان کا جو اس کے مناسب حال ہو بہر حال گروہ ہوگا۔ اور صرف اسی زمانہ میں اس کا وجود پایا جائے گا جو مخصوص ان شروط پر مشتمل ہو۔ لیکن اگر ہم کو ایسا موجود ملے جس سے کوئی زمانہ کوئی مکان خالی نہ ہو اور بلند ترین صفات کمالات سے منصف ہو اور کامل مطلق ہو اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز تکامل نہ مطلق ہو اور نہ کوئی دوسری ذات اس کے علاوہ نقص و عیوب سے منزہ ہو تو ایسی صورت میں ایسی حقیقت متغایہ کے لئے دو گانگی کا تصور اس کے عین متغایہ ہونے اور محدود ہونے کا تصور ہے۔

بنیادی اور اصولی طور پر خدا واحد بالعدد نہیں ہے کہ اس کے لئے اسی کی کئی کئی فرد دوم کا تصور کیا جاسکے بلکہ اس کی یکتائی اس قسم کی ہے کہ اگر اس کے ساتھ دوسری فرد کا وجود فرض

کیا جائے تو وہ بین فرد اول ہو۔

چونکہ تعدد اشیا کے لئے ایسے قیود کا ہونا ضروری ہے جو ان کو ایک دوسرے سے میز و ممتاز بنا دیں۔ اس لئے اگر ایسا موجود فرض کیا جائے جو ہر قید و شرط سے آزاد ہو تو دوسرے فرد کو فرض کرنا قطعاً غیر معقول ہوگا کیونکہ فرد ثانی کا وجود مستلزم ہوگا کہ اس کے لئے حدود و میز و نماں جائیں اور اگر یہ کہا جائے کہ دوسرے فرد میں تمام حدود متفق ہیں تو پھر وہ وہ موجود نہ ہوئے بلکہ دوسرے فرد کا تصور وہی فرد اول کے تصور کی تکرار ہوگا۔

خدا کی یکتائی کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم تہہ خدا کا تصور تمام موجودات سے قطع نظر کر کے کریں۔ اگرچہ یہ فرض بعید ہو۔ تو بغیر کسی شریک یا مثل یا ولد یا کفو کے اس کا وجود ثابت و برقرار رہے۔ اسی طرح اگر ہم خدا کا تصور تمام موجودات کے ساتھ کریں جب بھی اس کا وجود با شریک ثابت و برقرار رہے۔ لیکن اگر ہم تمام موجودات کا تصور وجود خدا کے بغیر کریں تو ان موجودات کی بقا ممکن نہ رہے کیونکہ موجودات کے وجود کا صدقاً و بقاً دار مدار خدا کے وجود پر ہے۔ جب خدا ہی نہ ہوگا تو یہ موجودات کیونکر ہو سکتے ہیں؟ اس بنا پر اگر خدا کے لئے کسی قید و شرط کو مان لیں تو جب بھی یہ قید یا شرط متفق ہوگی خدا کا وجود بھی متفق ہو جائیگا۔ کیونکہ اذا فاق الشرحا ذات المشروط۔ ابتدا وجود خدا مطلق ہے اور غیر مشروط اس کے ساتھ تعدد کا فرض کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے عقل اس کی سنخ سے فرد دوم کو فرض ہی نہیں کر سکتی۔ اس بات کو ہم ایک مثال دیکر سمجھائیں مثلاً اگر ہم فرض کریں کہ اس عالم کی نہ کوئی حد ہے اور نہ کوئی انتہا ہے اور اگر ہم اس کے کسی طرف بھی چلن شروع کر دیں تو نقطہ انتہا پر نہیں پہنچ سکیں گے تو اب اس طرح کا عالم مان لینے کے بعد کیا ہم اس کے ساتھ دوسرا عالم فرض کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! کیونکہ جب ہم نے پہلے ایک غیر محدود عالم فرض کر لیا تو وہ خود ہی ذاتی طور سے اس بات کا مانع ہوگا کہ اس ساتھ دوسرا عالم فرض کیا جائے کیونکہ جس چیز کو ہم دوسرا عالم فرض کر لیں گے وہ یا تو یہی عالم ہوگا

یا اس عالم کا جزو ہو گا۔

ہنذا جب ہم کو یہ معلوم ہے کہ خدا وجود محض ہے تو اب اس کے ساتھ اسی جیسا دوسرا خدا بنانا ایسے ہی ہے کہ ہم نامحدود عالم مان کر اس کے ساتھ ایک دوسرا جسمانی عالم مانیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ناممکن بات ہے۔

اس تقریر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ واحد ہے کہ مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرا خدا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ اس کے ساتھ دوسرا خدا فرض کرنا بھی ناممکن ہے۔ اور نفس وجود خدا اس کے واحد اور فرد ہونے کا مستلزم ہے۔ اور یہ کہ وہ بذاتہ منفرد ہے۔ اس طرح وہ دیگر موجودات سے مجز ہو جاتا ہے جبکہ دیگر موجودات بذات خود متمیز نہیں ہوتے۔ بلکہ خدا نے جو حساب فیثقیلیں مجھے ہیں ان کے ذریعہ وہ متمیز ہوتے ہیں۔

اگر کلمہ اللہ کا صحیح اور واقعی معنی ان کا عقل کے ذہن میں متحقق ہو جائے اور ان کا صحیح معنی سے معرفت حاصل کر لے تو وہ خود ہی فطری طور پر طے کرے گا کہ ذات خدا کے ساتھ تعدد و ثنائی قطعی طور سے ناممکن ہے۔

ہم بڑی وضاحت کے ساتھ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک نظام و اعداد مستمر تمام اجزائے عالم میں کارفرما ہے۔ انسان گناہ و نباتات کے لئے ہمیشہ کاربن گیس کو پیدا کرتا رہتا ہے اور درخت و نباتات ان کی نفس کے لئے آکسیجن خارج کرتے رہتے ہیں اور انسان و نباتات کے اس داد و ہستہ کے نتیجہ میں ایک معین مقدار آکسیجن کی محفوظ رہتی ہے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہو جائے تو کرو ذہن پر ان کا نام و نشان نہ ملے۔

ذہن سورج سے بخشی حرارت حاصل کرتی ہے اس کی مقدار اتنی ہوتی ہے کہ زندہ موجودات کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ سورج کے گرد زمین کی سرعت رفتار اور عظیم منبع طاقت و حرارت کے مالک سورج سے زمین کا فائدہ اس طرح سے رکھا گیا ہے کہ زمین پر انسان کی زندگی ممکن ہو سکے۔

مثلاً اگر زمین کی سرعت رفتار ہزار فی گھنٹہ سے گھٹ کر سو میل ہو جائے تو موجودہ دن رات وہ گنگا بڑھ جائیں گے اور گرمی کے زمانہ میں درجہ حرارت اتنا بڑھ جائے کہ تمام نباتات جل جائیں اور سردی کے زمانہ میں راتوں کی ٹھنڈک اتنی زیادہ ہو جائے کہ تمام قسم کے گیاه اور پھول بجھ ہو کر رہ جائیں۔

اور اگر سورج کی گرمی جتنی اس وقت ہے اس سے گھٹ کر آدھی رہ جائے تو سردی کے زمانہ میں تمام جاندار جم جائیں اور کسی بھی حرکت پر قادر نہ ہو سکیں اور اگر سورج کی گرمی موجودہ وقت سے دو گنے سے زیادہ ہو جائے تو لطفہ حیات مرعہ نکوین ہی میں متوقف ہو جائے۔

اسی طرح اگر چاند کی زمین سے دوری بہت زیادہ ہو جائے تو سمندروں کے پانی کا جزر و مد اتنا بڑھ جائے کہ سمندر کی موجیں پہاڑوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

یہ کائنات کچھ اس طرح خلق کی گئی ہے کہ گویا یہ ایک کاروان ہے جس کے تمام روبرو مقام زنجیر کی طرح باہم جڑے ہوئے ہیں اور یہ سب ایک نظام و واحد کے چھوٹے بڑے اجزاء کی طرح ایک جہت میں سعی و فعالیت میں مشغول ہیں اور اس نظام کے ہر جز کی اپنی ایک تکلیف اور ایک وظیفہ ہے اور یہ پورا نظام ایک دوسرے کی مدد کر کے ایک دوسرے کے تکمیل کا سبب بھی ہے اور اس کے تمام ذرات کے درمیان ایک عتیق و معنوی علاقہ موجود ہے۔

مشہور مفکر دواۓہ کہتے ہیں: اس کائنات کے تمام مخلوقات میں ایک زنجیر یا تانگے سے بندھا ہوا مستحکم رشتہ ہے جو ان کے درمیان بھرپور توازن کو قائم رکھے ہے۔ یہاں تک کہ بے شعور و بے وجدان مخلوقات بھی اس مخصوص رشتہ کے فیوض و برکات سے محروم نہیں ہیں۔ اور اس کائنات کی مخلوقات گویا ایک مرتب و مسلسل لامتناہی قطار میں ہیں اور یہاں پھر ایک تسبیح کے دانوں کی طرح ہیں جو نہ ٹوٹنے والے ہیں۔ اور اس مخلوقات کی حرکات حیات اسی نامرئی اور قومی علاقہ کے طفیل میں ثابت و برقرار ہے۔

ذرا ایک زندہ آدمی کو دیکھئے اس کی گردش خون، گردش نفث، ہار مونی و عصبی حرکات

لہذا بدن انسان میں ایک بے رنگ سیال چہرے۔

نہاد آدمی میں اتنی زیادہ ہم آہنگ و وابستہ و پیوستہ ہیں اور اتنی وسعت و قدرت کے ساتھ ہر ایک طہر پر ہیں کہ پہلی مرتبہ دیکھنے والا یہ سوچنے لگتا ہے کہ شاید یہ ایک ہر ج و مرج سے بھر پور بے ترتیب نظام کے طوفان میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جب فیروز علی سے قطع نظر کر کے ہر زندہ حلیہ کی عام شکل بصورت حلقہ آئے زنجیرے پائیاں یا ہر ج و مرج عظیم و وحشت ناک طوفانوں کے درمیان ایک دوسری طویل صف، تب و تاب کی تلاش میں ہے۔ اور ان کی فکر اس وقت سمجھوت ہو جاتی ہے اور انگشت بہ دندان رہ جاتی ہے جب یہ دیکھتی ہے کہ تمام یہ زیر و بم، طوفان، تعامل، باہم، نیکی، ایک عظیم وحدت بخش عامل کے زیرِ حمایت کام کر رہے ہیں۔ اور اس عاملِ قدیر کو ہر وحدت و نظام میں جو بظاہر غیر منظم مجموعہ ہے، دیکھا جاسکتا ہے۔

اسی باہر ہم کہہ سکتے ہیں جو کائنات ایک وحدت سے سرشار ہے اس کو ایک حقیقت اور ایک مبدیہ سے وابستہ ہونا چاہئے اور اس کائنات کا وجود اسی ایک نقطہ وجودیہ اور مبدیہ واحد سے ہونا چاہئے۔ اگر وجود ایک ہو جائے تو اس کا مرجہ بھی ایک ہی ہو سکتا ہے جس خدے مختلف و متکثر وجودیں ایک وحدت و نظم کو پیدا کیے اس نے اپنی اس قدرت کا مظاہرہ کر کے اپنی وحدانیت اور علم و قدرت پر ایک واضح دلیل پیش کر دی ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:-

قُلْ أَمَّا أَيْسَرُ كَمَا تَكُونُ السَّيِّئَاتُ فَإِنَّ دُونَ اللَّهِ أَسْرَفًا وَمَا ذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ؟ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ؟ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ؟ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ؟ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ؟ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ؟

يَسْتَفْتِيهِمْ. بَلْ لَنْ يَبْعُدَ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمُ الْآخَرِينَ إِلَّا أَعْيَانُهُمْ إِلَّا اللَّهُ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا. وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا (فاطر/ ۳۱-۴۰)

اے خداوند دانشمند و رحمتورس خدائے بزرگ صفت

دلے رسولؐ : تم ان سے پوچھو تو خدا کے سوا اپنے جن شریکوں کی تم عبادت کرتے ہو، کیا تم نے انھیں (کچھ) دیکھا بھی مجھے بھی خدا دکھاؤ تو کہ انھوں نے زمین (کی چیزوں) سے کون سی چیز پیدا کی یا آسمانوں میں کچھ ان کا آدھا سا بھابھ یا ہم نے خود انھیں کوئی کتاب دی ہے کہ وہ اسکی دلیل دے سکتے ہیں (یہ سب تو کچھ نہیں) بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے (دھوکے اور) فریب ہی کا وعدہ کرتے ہیں، بیشک خدا ہی سارے آسمان و زمین کو اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر (فرس کر دو کہ) یہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو پھر اسی کے سوا کوئی انہیں روک نہیں سکتا۔ بیشک وہ بڑا مرد بار (اور) بڑا بخشنے والا ہے۔

خود ہماری فطرت بھی اس یگانگی کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ جب ہم سخت محزون، اور جان فرسا گرفتاریوں میں مبتلا ہوتے ہیں تو (فطری طور پر) ہماری امیدیں ایک ہی مرکز کی طرف مائل ہوتی ہیں اور ایک ہی نقطہ کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور اسی سے دلچسپی پیدا کرتی ہیں۔ امام جعفر صادقؑ کے ایک شاگرد نے حضرت سے پوچھا خدا کی یکتائی پر کیا دلیل ہے؟ فرمایا: جہاں تفریق و تشکیک کا دوام و استمرار اور باہم پیوستگی اور نظام ہستی کا مکمل ہونا۔ جیسا کہ ارشاد خدا ہے: - لَوْ كَانَ فِيهَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا - (کتاب الصدوق - باب التوحید) پس اس نظام عالم کا استقرار و شمول تعدد الہیہ کے مفروضہ کے بطلان کے لئے کافی ہے۔

متر مو بیس میٹرنگ (MORIS METERING) کہتے ہیں: جس وقت تمام اجسام کے ذرات کو فتح کیا جائے تو ایک ایٹم تک رسائی ہوگی اور جب ایٹم کو شکاف دیا جائے تو ہماری رسائی ایک ایسی چیز کی طرف ہوگی جس کو ہم مجھوتی، بھٹی سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی وہ

چیز ہے جو تمام شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے اور تمام دنیا کے مصالح کا مدار اسی پر ہے۔ اور اس سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیا کا پیدا کرنے والا ایک ہے دو ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ دنیا کی تمام چیز خواہ وہ مواد ہوں یا قوانین ایک ایسی چیز سے وجود میں آتی ہیں جس کو ابھی تک ہم نہیں جانتے۔

باوجود اس کے کہ حقیقت واردہ عالم کے سلسلہ میں قرآن خدا کی یکتائی کی تاکید کرتا ہے
بھیر بھی ان اسباب و اسباب کا بھی تذکرہ کرتا ہے جو اس کے فرما یا بروا رہی۔ چنانچہ ارشاد ہے :-

وَاللَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْيَاهُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا. إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ. (نمل ٤٦)

اور خدا پہلے اسے پانی بھریا تو اس کے ذریعہ زمین کو مرودہ (بڑی) ہونے کے بعد زندگی و شاداب کیا، کچھ نہیں کہ اس میں ان لوگوں کے لئے جو سختے ہیں (قدرت خدا کی بہت بڑی نشانی ہے۔

اور جب ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ : اس کا رگڑا ہستی میں خدا کے علاوہ کوئی خالق و مدبر
و مرید نہیں ہے اور کائنات کے تمام مابین تاثیراتی کے امور ارادہ کے تابع ہیں ۔ اور نفس الیحاد
کسی بھی عامل کی طرف سے ہو یا کائنات کی ہر علت و مسببائی ذات واحد و لاشریک کی طرف
سے اس کے پیرو ہے۔ پھر خدا نے کتنا بے ساختہ دوسرا خدا کیونکر بنا سکتا ہے ؟ اور کس طرح
دوسرے کی عبادت کی جاسکتی ہے ؟ قرآن اسی چیز کو بیان کرتا ہے :- وَمِنْ آيَاتِهِ الْيَلْقَ وَالْهَامِ
وَالتَّمِيمُ عَلَى الْقَمَرِ لَا تَجِدُ فِيهِ لَشَيْءٍ إِلَّا بِإِذْنِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ إِنَّ كَثِيرًا مِنْ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

اور اسکی (قدرت کی) نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند میں تو یہ تم لوگوں
میں سورج کو سجدہ کرنا اور نہ چاند کو اور اگر تم کو خدا ہی کی عبادت کرنی منظور ہے تو میں
اسی کو سجدہ کرو جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے ۔

نہ دیکھتا ہے اور مصلحت ہے اس کو حکم السجدہ کہیں کہا جاتا ہے۔ جس طرح اس سے پہلے واسطہ سورہ مومن کو سورہ غافر میں کہتا ہے۔

خدا کی غیر محدود قدرت

فطرت کے ظواہر اور ان کے الوان و اشکال — جو بیان سے باہر ہیں — کے مطالعہ سے واضح و روشن تردیل خداوند عالم کے غیر متناہی قدرت پر نہیں ملے گی۔

جب ہم مخلوقات خدا پر نظر ڈالتے ہیں تو اپنے وجود کو خدا کی اسی عظیم قدرت کے سامنے دیکھتے ہیں جس کے حدود و قیود کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ان مخلوقات کا مطالعہ اور ملبوسوں وہ حقائق جو

ان میں اور ہمارے نفوس میں قدرت نے ودیعت کئے ہیں وہ ہم کو ایسے براہین تک پہنچاتے ہیں جن سے خالق کی لامتناہی قدرت کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اس نظام کی تفسیر و تعبیل خدا کی قدرت مطلقہ کے علاوہ کچھ ہو بھی نہیں سکتی۔

خدا کی قدرت لامتناہی ہی وہ چیز ہے جو فعل کو اس عظیم نظام کے خالق کے سامنے سرنگوں کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اور ہمارے پاس کوئی ایسا کلمہ نہیں ہے جو اس عظیم لامتناہی قدرت کے ابعاد مشخص کر سکے۔ خدا کی قدرت تو یہ ہے کہ جس کی طرف اسے خود اشارہ کیا ہے۔ انصاف اور

اذا امر او شیا ان يقول لک فیکون (قرآن ۲۱/۱۶۲)

علوم طبعیت کے بڑے بڑے بنیادی اور تحقیقات علیہ کے بڑے بڑے نامی گرامی پہلوان آج تک اس چھوٹی بڑی مختلف مخلوقات کی اس کثرت کے باوجود بطور کامل ایک جزیرہ کی بھی حقیقت کا انکشاف نہیں کر پائے۔ لیکن پھر بھی اس عالم کے موجود نظام کے نسبت یہ تھوڑے اور ناقص و مختصر معلومات اس بات کے لئے بہر حال کافی ہیں کہ جن سے اس کی عظیم لامتناہی قدرت کا اور اک کیا جاسکے۔ یعنی یہ تمام گونا گون مخلوقات جن کے حجم بھی الگ الگ ہیں۔ اور قابو و دہ یاؤں کی گہرائیوں میں چھوٹے اور بڑے جانور اپنے حیرت انگیز قیادوں

کے ساتھ، اور رنگ بزرگ خوشنما، بال و پر والے اور خوش الحان پرندے جو فضا میں اپنے بال کھلادیتے ہیں، جنگلوں کے وسط میں زندگی بسر کرتے ہیں کہ اگر چہ دوست ہر مند حضرات ان پرندوں کے خوبصورتی کی تھوڑی بہت تقلید اپنے فنی پاروں میں کر دیں تو ان کے ہنر کا بازار گرم ہو جائے اور یہ نجوم و کواکب، سورج کا صعود و غروب، شفق و افق، شمس و قمر، کرات و نکشائیں اور وہ بادل جن میں بیرونوں عظیم جبکہ دار نجوم ہیں یہ جیسی صاحبان عقل کو متحیر کر دیتی ہیں کیا جیتر اس کی لامتناہی قدرت پر دلالت نہیں کرتی ہیں؟

پروفیسر روایہ ————— عالم فضا کے ایک گوشہ کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ہمارے اس نظام شمسی میں ایک لاکھ ستارے موجود ہیں اور اب تک ان میں سے صرف پانچ ہزار پہچانے جا سکے ہیں، اور ہمارے پورا نظام شمسی ہماری نگہبانی کا ایک بہت ہی چھوٹا سا جز ہے اور ہم صرف اس نگہبانی کے چھوٹے حصے ہی کو دیکھ سکتے ہیں اور یہ حصہ بہت ہی کیف و مشرک ترین ہے۔

اور یہ عظیم نگہبانی دوسری میٹار ونگنگٹاؤں کے مقابلہ میں صرف ایک ایسا مختصر بادل ہے جس میں ستارے ہوں۔ اور ان تمام نگہبانیوں کا مجموعہ علمی لحاظ سے (مثلاً لاکھوں) کہا جاتا ہے جو ہماری دنیا کو تشکیل دیتا ہے۔

آئنسٹائن (۱۸۷۹ء - ۱۹۵۵ء) — بے مثال دانشمند اور نظریہ اضافت کے بانی آدم نے اس کائنات کی اضافی شاعریوں کا حساب چھ سو ملیار نو سو سال کیلئے کیا ہے۔ اور علماء کو اپنے اس نظریہ پر قانع کر دیا تھا کہ عالم اپنے اعلیٰ حد میں بے انتہا ہے اور ہمارے آج کے دور کے

نہ ایک ہزار میلوں کا ایک میٹار دھرتا ہے، یہ علماء کی جگہ ہے

تہ ۱۹۴۶ء ۱۹۴۶ء

تہ اس سے مراد یہ ہے کہ نو ایک سال میں متواہف کے کرتا ہے، نو کی رفتار ایک سیکند میں ۱۸۶ ہزار میل ہوتی ہے۔

علمی وسائل و امکانات اس عالم کی انتہا کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ اس لئے اب بہتر صورت یہی ہے کہ اس عالم کی اضافی شعاہوں کو چھ سو ملیا۔ دوسری سال مان لیا جائے جو لا نہایت کے مساوی ہے اور اس کے بعد اس اضافی فضا کی تحقیق شروع کریں جس کا قطر دو ہزار دو سو ملیا دو دوسری سال کے انسٹالیشن (۱۹۸۷-۸۸)۔ نے یہ صواب اور یہ علمی تحقیقات ان فضائی رصدگاہوں کے سہارے بیان کئے ہیں جو فضائی تحقیقات کے لئے قائم کی گئیں تھیں جیسے رصدگاہ پالومار جو کہ سب سے زیادہ طاقت ور رصدگاہ سمجھی جاتی تھی اور آج بھی شمار کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ریڈیو نے اس سرحد کو توڑا ہے۔ یعنی رصدگاہ پالومار کی اہمیت کم کر دی ہے۔

فضائی کیمروں کے ذریعہ اتاری گئی اسی رنگوں سے زمین کا فنی سے زیادہ تصویریں جن کو رصدگاہ (پالومار) نے کھینچا تھا اور خصوصاً جارجس گیلکشن کی تصویریں بہت دیرینہ تک عالم میں تلاش فضا کے لئے عمل تحقیق رہی ہیں اور علمائے فضا نے بن نظریات کا اظہار کیا تھا وہ انہیں تصویروں کی بنا پر تھے۔

جارجس اس گیلکشن کا طول ایک لاکھ نوادی سال ہے اور جارجس نظام شمسی اس کے ایک کونے میں ہے اور یہ گیلکشن فضا میں پھیلاؤ سال سے دو سو پچاس کھو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔

پس کیا یہ کائنات اپنی اس مجرا بقول عظمت کے ساتھ خدائے بزرگ کی قدرت مطلقہ پر دلالت نہیں کرتی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس خالق کی قدرت سے چشم پوشی کر لیں؟ جس نے

نہ یہ شمسی رصدگاہ انسٹالیشن قائم ہوئی اور اس کا نام (PALOMAR MOUNT OBSERVATORY) رکھا گیا پھر ۱۹۷۹ء میں اس کا نام (PALO MOUNT OBSERVATORY) رکھا گیا۔ اور ۱۹۷۹ء تک اس میں دنیا کی سب سے بڑی دوربین نصب تھی۔

ان متنوع اور مختلف الٰہان کو حیات بخشی ہے اور جس نے ان کے لئے اصول حیات بنائے ہیں اور ان کو صورت و شکل عطا کی ہے اور ان کے حدود و معین کئے ہیں۔

ہم کو معلوم ہے کہ یہ دل فریب موجودات کی خلقت ارحم سے ہوئی ہے۔ اور ان موجودات کی تفسیر بغیر ایک لامتناہی قدرت جو با ابدہ و با قدرت و ہدایت کر نیوالی ہے کے مانے ہوئے ممکن ہی نہیں ہے جس کو اللہ کہا جاتا ہے۔ اور جو قادر علی الخلق والابداع ہے اور جو محدس و مکیم ہے۔

چھوٹا، بڑا، مشکل اور آسان مسئلہ موجودات محدود کے خواص میں سے ہے۔ لیکن خدا کے ہاں کم و زیادہ، چھوٹے و بڑے کا مسئلہ نہیں ہے، عاجزی و ناتوانی کہ جو فاعل کی محدود طاقت کا معلول چوتی ہے اور باوجود مانع اور باکمی و سائل کی معلول ہوا کرتی ہے اس کا خدا کے بارے میں تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کہتا ہے:-

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا (ذہر/۷۲)

اور خدا ایسا (گیا گزرا) نہیں ہے کہ اسے کوئی چیز عاجز کر سکے نہ تو آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ بے شک وہ بڑا خبردار اور قوی قدرت والا ہے۔

اور باوجود اس کے کہ خدا ہر چیز پر مرقمہ ہے۔ لیکن دنیا کو اس نے ایک مخصوص و مشخص نظام کے پیش نظر خلق کیا ہے۔ اور اس نظام دقیق کے چوکھٹے میں ہر شے کے لئے ایک معین دائرہ بنا دیا ہے اور ساری چیزیں اس کے احکام کی فرمانبرداری میں معمولی سی عدول حکمی نہیں کر سکتیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے:-

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مَسْجُوتٌ بِأَمْرِهِ. أَلَاِنَّ الْخُلُقِ وَالْأَنْفُسَ مَبْسُوتَاتٌ بِاللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (الاعراف/۵۳)

اور اس نے آفتاب و مہتاب و ستاروں کو پیدا کیا یہ سب اسی کے حکم کے تابع رہے

ہیں۔ دیکھو حکومت اور پیدا کرنا خاص اسی کے لئے ہے وہ خدا جو سارے جہاں کا پروردگار ہے بڑا برکت والا ہے۔

نظام ہستی کا کوئی موجود تنہا نہ منظر قدرت ہو سکتا ہے اور نہ اپنے ارادہ و حکم میں مستقل ہو سکتا ہے۔ اور خدا کا جس طرح ذات میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی طرح فاعلیت میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ اور جس طرح موجودات جہاں اپنی ذات میں مستقل نہیں ہیں بلکہ خدا سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح فاعلیت و تاثیر میں بھی مستقل نہیں ہیں۔ ہر فاعل و سبب اپنے وجود کی حقیقت کو خدا سے حاصل کرتا ہے اور اپنی فاعلیت و تاثیر کو بھی اسی سے حاصل کرتا ہے۔

اگر شیت الخی کا تقاضا ہو اور وہ اس نظام ہستی کو ختم کرنا چاہے تو یہی طاقتور نظام اس کے ارادہ کے سامنے سرنگوں ہو جائیگا۔ کیونکہ جس خالق نے اسباب و ضل کو خاص اثر بخشا ہے وہ ہر وقت اس بات پر قادر ہے کہ جس وقت چاہے ان کے اثر کو ختم کر دے۔ اور جس طرح ایک حکم سے موجودات کو پیدا کیا تھا دوسرے حکم سے ان کی تاثیر کو ختم بھی کر سکتا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

قَالُوا احْزِقُوهُ فَاَنْصَرَفُوا اِلَھِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ فاعِلِینَ قُلْنَا یَا نَارُ کُونِیْ
بَرْدًا وَاَسْلًا مَّا عَلٰی اِبرٰھِیْمَ فَاَرَادَ وَاِبٰہُ کَیْدًا فَجَعَلْنَاھُمْ
الْاٰخِزِیْنِ - (انبیاء - ۶۸-۶۹)

دفعہ ۱۵ لوگ (براہم کہنے لگے کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو ابراہیم کو آگ میں جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو دغرض ان لوگوں نے ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا تو) ہم نے فرمایا اے آگ تو ابراہیم پر بالکل ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث ہو جا کر ان کو کوئی تکلیف نہ پہونچے اور ان لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ چال بازی کرنی چاہی تھی تو ہم نے ان سب کو ناکام کر دیا۔

سورج اور زمین کی قوت جائزہ اگرچہ اس دنیا کے بہت بڑے میدان میں اپنا نفوذ رکھتی ہے

مگر خدا کے ارادہ کے سامنے سرنگوں ہے۔ جہاں خدا نے کسی چھوٹے سے پرندہ میں بھی طاقت بخشی تو وہ زمین کی قوت جاذبہ کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور وہ فضا میں اڑنے لگتا ہے اسی کو قرآن کہتا ہے۔

اَنۡتُمْ مَّرۡسُوۡدُوۡا اِلٰی الْعَلِیُّوۡرِ مُسۡحَرَّاتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ مَا یَصۡصِلُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَا یَاقُوۡتَ لِقٰوۡمٍ یَّوۡمَئِذٍ (العنکبوت)

کیا ان لوگوں نے پرندوں کی طرف غور نہیں کیا جو آسمانوں کے نیچے ہوا میں گھسے ہوئے دائرے سہتے ہیں۔ ان کو تو بس خدا ہی (دگرسنے) روکتا ہے۔ یہ تنگ بس میں بھی (قدرت خدا کی) ایسا ندوں کے لئے بہت عجائبات ہیں۔

اس نظام کے اندر جو موجود بھی فرض کیا جائے اس کے وجود و دوام حیات کی ضرورت محفوظ ہی کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہیں اور اسی نظام میں جس قدرت کا بھی وجود فرض کیا جائے آخر کار خدا کی لاستنا ہی قدرت کی طرف اس کی بازگشت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ (نوع البدلہ - خطبہ ۵۹) میں فرماتے ہیں: ہم تیری کہ عظمت کو نہیں پہچان سکتے ہیں تم تو اتنا جانتے ہیں کہ تو جی و قیوم ہے نہ سمجھ کو پیدا آتی ہے نہ اونگھ، کوئی نظر و فکر تجھ تک پہنچ نہیں سکتی نہ کوئی آنکھ تجھ کو دیکھ سکتی ہے تو نے العباد کا اوداک کیا ہے۔ اعمال کا احصا کیا ہے اور نواہی و اقدام سے گرفت کی ہے، باوجودیکہ ہم نے تیری آفرینش کی کسی چیز کا اوداک نہیں کیا ہے مگر تیری قدرت پر متعجب ہیں تیری عظیم عظمتوں کی تعریف کرتے ہیں۔ حالانکہ جو چیزیں ہم سے پوشیدہ ہیں ہماری آنکھیں ان کے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتیں۔ اور ہمارے خرد و فکر کی دلیں تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے اور ان چیزوں کے درمیان جو بیہمی پر دسے چڑے ہیں وہ بہت عظیم ہیں۔

ان جب کسی چیز کو بنانے کا ارادہ کرتا ہے مثلاً استپان بنانا چاہتا ہے تو وہ کچھ ایسے وسائل و آلات کو مہیا کرتا ہے جن کے درمیان کوئی ذاتی علاقہ نہیں ہوتا صرف اس میں سب کے کام آندہ ہونے کا رشتہ ہوتا ہے اور یہ سب اس لئے کرتا ہے کہ حصول مقصد میں کامیابی ہو۔

اور ان ضروری — دکارتہ ہونے والی چیزوں — کے ایجاد کے لئے مختلف چیزوں اور طاقتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور اس کا یہ عمل — جو اس نظام کی ایک جزئی چیز ہے — فاعلیت ایجاد نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی حرکت کی فاعلیت ہے جو اشیاء موجودہ کو ایک مخصوص شکل کی صورت میں کر دے گی۔ پس کے برخلاف خدائی مصنوعات کے کہ ان میں چند بیگ نہ چیزوں کو اکٹھا کر کے ان کو ایک مخصوص صورت دیدینا نہیں ہے۔ بلکہ خدا تمام چیزوں کو ان کی خصوصیات و قوتوں کے ساتھ خلق کرنے والا ہے۔

یاد رکھئے یہ جو کہا جاتا ہے کہ ”خدا ہر چیز پر قادر ہے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی قدرت کا تعلق صرف ممکن امور سے ہو کر تا ہے لیکن محالات عقید اس کے دائرہ قدرت سے باہر خارج ہیں۔ بلکہ محالات میں لفظ قدرت کا استعمال ہی بے معنی ہے — یہ درست ہے کہ خدا کی قدرت غیر محدود ہے لیکن یہ نہ بھونا چاہئے کہ اس کے لئے سب کے اہم شرط یہ ہے کہ محل میں قدرت الہی قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ کسی بھی چیز سے قدرت خدا کا تعلق اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ شیئی محال عقلی نہ ہو اور ذاتی صلاحیت قبول قدرت کی رکھتی ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ فیض الہی قائم ہے اس کی کٹاؤں انتہا نہیں ہے لیکن اس مورد — محال عقلی — میں اس فیض کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ سمندر میں پانی بہت ہے لیکن آپ کے پاس جتنا جزا طرف ہوگا اتنا ہی تو پانی سے سکے ہیں؟ کوئی بھی طرف اپنی صلاحیت سے زیادہ پانی نہیں لے سکتا۔ یعنی محدودیت طرف کی طرف سے ہے سمندر کی طرف سے نہیں ہے۔

ایک شخص نے حضرت علیؑ سے پوچھا کیا خدا اس بات پر قادر ہے کہ پوری دنیا ایک آنسو میں سمودے مگر نہ دنیا چھوٹی ہو اور نہ اندھا بڑا ہو؟ آپ نے فرمایا خدا کی طرف عاجزی کی نسبت دنیا صحیح نہیں ہے لیکن تم نے جو پوچھا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ (بحار الانوار ج ۲ ص ۱۷۳) یعنی تہ مقدس الہی میں معجز نہیں ہے مگر فعل محال کے بارے میں قدرت خدا کے تعلق سے سوال کرنا بے غیر معقول اور بے معنی سی بات ہے۔

جس مومن کا دل ایمان خدا سے اور اس کی محبت سے بھرا ہوگا وہ کبھی اپنے کو اکیلا و غلام نہیں سمجھے گا کیونکہ جس بات پر اقدام کرے گا یہ یقین ہوگا کہ ہم ایک عظیم طاقت کے زیر نگرانی ہیں جو مشکل کو دور کرنے پر قادر ہے۔

جو خدا کو پہچانتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ خدا اس کی مدد کرنا چاہے وہ مشکلوں کے سامنے ضرور نجات کا مظاہرہ کرے گا اور مشکلات کی حیثیت اس کے نزدیک سمندر کے جھاگ جیسی ہوگی جو بہت جلد دور ہو جاتا ہے۔ اور جتنی جتنی مشکل کی آگ اس کے ارد گرد بھڑکتی ہے اتنا ہی وہ برابر اسمدی کی طرح سخت و طاقتور ہو کر نکلتا ہے۔

تمام مشکل مقام پر فضل و عزت خدا کا احساس کرتا ہے اور یہی احساس اس کی غایت و تلاش کو تشکیں دیتا ہے۔ کوئی بھی ناگاہی اس کا راستہ نہیں روک سکتی اور نہ وہ کسی مشکل کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے بلکہ سچی مسلسل اور خلوص نیت کی بنا پر اپنے مقصد کو آخری منزل تک حاصل کر لیتا ہے۔ مومن بخوبی جانتا ہے کہ اس نظام میں کوئی بھی رنج و غم نہیں ہوتا اور کامیابی مومنین کے لئے ہے اور جو مظلوم خدا کے عطا کردہ کوئی جائز پناہ نہیں رکھتے خدا ان کی مدد کرتا ہے اور اوج عزت و عظمت تک ان کو پہنچا دیتا ہے اور بہت سے ایسے صاحبان عزت جو طاعنی و باغی ہوتے ہیں انعام و ستیجہ رہتے ہیں جو اپنی قدرت و طاقت کے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے جو ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھتے خدا ان کی نگاہوں کو دیتا ہے۔

اسنہم کے کہنے ہی ظالم و باغی رینجہ بشر میں گزرے ہیں جو ذلت کی موجوں میں گرفتار ہو کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ انبیائے کرام ان فی اقداس کے کامل نمونے تھے انھوں نے مخالف قوتوں کا کس طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یہ صرف اس لئے کہ لوگوں کی ہدایت کریں اور معاشرہ کو انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کی طرف سوق کریں۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اہل شرک و عدال کے سامنے سب سے پہلے انقلاب کی مشعل جلائی۔ اور ان کی تبلیغات کا تاریخی بشر میں خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔ اور یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے توحید کی بنیادوں کو

مضبوط کیا۔ کیا کوئی ایسا ہے جو ان کی ان کوششوں کا انکار کر سکے جن میں نہ ٹھکانٹ کا احسن کرتے تھے اور نہ رنج و غم کا؟ ہم کو سوچنا چاہئے کہ انسان کتنا صبر کر سکتا ہے اور اپنے لڑکھ میں کتنا مضبوط ہو سکتا ہے؟

اگر ان کی پرانہ زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو تعلیمات اخلاص، صفائے باطن، درگزر، رحمت و شفقت، ہدایت و انسان سازی سے شدید علاقہ کا ورک و لمس کیا جاسکتا ہے اور ان کی بقا کا اساسی راز یہ تھا کہ انھوں نے کبھی اپنے ہار سے میں نہیں سوچا۔ اپنی پوری ہستی غرضی کے ساتھ اس کی راہ میں پیہ کر دی۔ لہذا خدا نے بھی ان کو ادبیت و جاودانیت بخش دی۔

علم خدا

خدا نہ تو کسی مکان میں بسا سکتا ہے نہ اسکی ذات کے لئے کسی حد کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ زمین و آسمان میں کوئی نقطہ اس کے وجود سے خالی ہے۔ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور پورے نظام ہستی میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر اس کی دانش کی تابناک شعاعیں نہ پڑتی ہوں۔

دور ترین نقطہ عالم میں بھی جو حادثہ ہوگا۔ کھربوں سال گزرتے ہوئے واقعات اور کھربوں سال بعد ہونے والے واقعات اس کے دائرہ علم سے باہر نہیں ہیں اسی لئے جامع ترین تفسیر لغو ذراہ یا بی کی اس کے حوزہ علم تک پہنچنے سے عاجز ہے۔

اس کے وسعت علم کے دائرہ کے اندر اک کے لئے دامن تفکر کو چاہے جتنا زیادہ وسیع کر دیں اور عقل کے بال و پر سے — جو ایک سکند میں فطرت کے پورے وجود کو گھوم کر دیکھ چکی ہے — چاہے جتنی پرواز کریں اور آزاوی فکر کے ساتھ تلاش مقصد میں آگے بڑھیں پھر بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

جس طرح کہ ہم ایک جگہ اور مخصوص نقطہ میں ہیں اسی طرح اگر تمام جگہ جھٹے اور کوئی جگہ ہمارے وجود سے خالی نہ ہوتی تو اس صورت میں ہم سے بھی کوئی چیز پوشیدہ نہ ہوتی۔

کائنات دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ غیب و شہود۔ کچھ حقائق کا غیب میں ہونا۔ عدم محدودیت کی وجہ سے یا مادہ کی نہ ہونے کی بنا پر یا ہمارے حواس ظاہری سے محسوس نہ ہوسکنے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ وجود ان امور محسوس میں منحصر نہیں ہے جو ہمارے تجربہ میں داخل ہوں۔

حقائق ہستی کے رموز و اسرار کے اندر اک کے لئے ہم کو ایک ایسی بیڑی چاہئے جس سے ہم جھلنگ لگا سکیں اور اس جھلنگ کی فعالیت و کامیابی فعال فکر کی قوت پر موقوف ہے

اگر یہ مدارج ہمارے لئے ممکن ہو جائیں تو بہت سے واقعات کو ہم بھی جان سکیں گے۔

خداوند کریم عنوانِ غیب کے تحت ایک وسیع نیشن کو ہستی کے بارے میں بیان کرتا ہے۔
 نبیائے الٰہی نے بھی اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ انسان کو عالمِ خلقت سے ایمان بالغیب کی طرف لے جائیں تاکہ محدود سے غیر محدود تک اور ظاہر سے باطن و غیب تک پہنچا دیں۔
 — لیکن جہاں تک خدا کا سوال ہے اس کے لئے کوئی چیز غیب نہیں ہے پوری کائنات اس کے لئے منظرِ ثبوت میں ہے۔ ارشادِ خدا ہے :-

عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (المحشر ۲۶)

پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے۔ وہی بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بشری معنوعات ہمیشہ اپنے بننے والے کے علم و ذہانت سے پیدا ہوتی ہیں اور مصنوعِ فنی لفظ سے جتنا دقیق ہوگا وہ حائے کی عظمت پر اسکا قدم زیادہ دلالت کرے گا۔ اور اس صانع کے ہدف و مقصد پر بیشتر دال ہوگا۔

اگرچہ اس کائنات کی عظمت کا انسانی معنوعات سے کوئی تناسب نہیں ہے پھر بھی اس عالم کی عظمت اور اس کے مناسب موجودات کی صورتیں، اور اس عظیم نظام میں پائی جانے والی حکمت اور یہ خوبصورت و مجسم العقول مناظر یکے سب اس ناظم و خالق و مدبر کے غیر محدود علم و دلالت کرتے ہیں۔ بلکہ یہ مظاہر اس وجودِ قیامی کے علم و ارادہ و حکمت پر قوی ترین دلیلیں ہیں۔ اسی خالق کوئی نے ان مہمات کو ایک دقیق و منظم برنامه کی بنیاد پر ایجاد کیا ہے اور ہمارے لئے ممکن ہے کہ اس وجود کے ظاہر اجزاد میں سے ہر ہر جز میں اس کے وسیع علم کا مشاہدہ کریں۔

جو حضرات لیبارٹریوں کے تجربات اور علما کے نظریات کا نتیجہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ ممکن ہے کہ حیوانات، نباتات، معشرات کے اندر اس لامحدود علم کے مہمات کتب و مطالعہ کریں

ان وہ فضاے آسمانی میں سرستہ رنگ، اور بادلوں کے پر ٹوٹا عالم، کتبشؤن کی گردش کو ازل سے ہند تک کو جانتا ہے اور تمام اجرام بالا کے ایتھوں کی مجموعی تعداد، سطح زمین اور اعماق اوقیانوس کے میار و باجھوتے بڑے موجود، فطرت میں نافذ جاری سنن و قوانین، ہر شئی کے ظاہر و باطن کو بھی جانتا ہے، دلوں کے راز ہائے سرستہ سے صاحبان قلوب کے زیادہ عالم ہے۔ اور یہاں ہم کو پھر قرآن کی آواز سنائی دیتی ہے:-

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (الکک - ۱۳)

اسی طرح ارشاد ہے :

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (زل عمران - ۵)

بھلا جس نے پیدا کیا وہ بے خبر ہے۔ اور وہ تو بڑا باریک بین واقف کار ہے (مکک - ۱۳)

بے شک خدا پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے (نہ زمین میں اور نہ آسمان میں (زل عمران/۵)

نیوٹن - (۱۶۸۶-۱۷۲۷) - گوش و چشم کے لئے لکھتا ہے۔ کان کا بنانے والا آواز سے متعلق تمام قوانین کو مکمل طور سے جانتا ہے اور آنکھ کا بیدار کر بوالا ان پیچیدہ قوانین سے جو نور و رویت سے متعلق ہیں بخوبی مطلع ہے۔ اور نظام سمادات کو دیکھ کر ہم اس عظیم حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں کہ اس نظام کا مدبر کوئی حکیم خاص ہے (دائرة المعارف فرید و جدید ج ۵)

اسی لئے علمائے طبیعت جو اعماق وجود میں دقائق نظم کے بارے میں وسیع اطلاع رکھتے ہیں اور زندہ و مردہ وجود کے بارے میں اپنے وافر تجربات کی بنا پر ایسی اطلاعات رکھتے ہیں جو دقیق صاب پرست مل ہوتی ہے۔ اور صرف زندہ و مردہ وجود ہی کے بارے میں اطلاع نہیں رکھتے بلکہ غیہ اور خون کے بارے میں بھی مطلع ہیں اور فعل و انفعالات کی مختلف کیفیت، ظاہری و باطنی تحولات، اور مختلف مواد و عناصر کے تاثیرات کو اپنی علمی تحقیقات کے دائرے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور النفس و آفاق میں غیر محدود علم اور تعمیر خیریت کے آثار کا بہترین طریقہ سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور یہ حضرات دوسروں کے نسبت علم خدا کی

وصفت اور کمال اوصاف کو زیادہ جانتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ غیبر کی آواز کو نہ ٹھکرائیں تو وجود پروردگار کو روشن تر طریقہ سے لمس کرتے ہیں۔

ایک مفکر کہتا ہے: ہماری دنیا ایک عظیم تفکر کی وجہ سے ایک میکانیکی مشین سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ اور میں ایک نظریہ اور علمی تعریف کی بنا پر کہتا ہوں: ہماری دنیا ایک ایسے عظیم تفکر کی مخلوق ہے۔ جو ہمارے مظاہر فکر سے کہیں زیادہ بلند ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ علمی افکار اسی ہدف کی طرف رواں دواں ہیں۔

خدا کا علم صرف ماضی یا حال سے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ مستقبل کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح حال کو خدا کا علم ان فی علم سے — جو ہمیشہ وجود خارجی کا محتاج ہوتا ہے — کوئی مشابہت نہیں رکھتا اور نہ یہ بات درست ہے کہ کہا جائے خدا کا علم مخلوقات میں تحقیق کرنے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ اس کے علم کا قیاس انسانی علم پر کرنا قطعاً نامناسب ہے اور نہ ابھی تک ترقی یافتہ دنیا کے پاس کوئی ذریعہ ہاتھ آیا ہے جس سے یہ پتہ لگایا جاسکے کہ علم خدا کی کیفیت یا معرفت کا طریقہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ کیونکہ ان فی علم کے لئے ایک معلوم کا ہونا ضروری ہے جس سے علم کا تعلق ہو سکے اور خدا کے یہاں یہ بات نہیں ہے کیونکہ علمی اصطلاح میں خدا کا علم حضوری ہے یعنی اس کے لئے کسی معلوم کا ہونا ضروری نہیں ہے جس سے علم خدا کا تعلق ہو۔ بلکہ ہر شیء اس کے سامنے کھلی ہوئی کتاب ہے۔ ذات خدا اگرچہ غیر از موجودات ہے لیکن اس کے باوجود وہ موجودات سے خارج بھی نہیں ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: ماضی اور مستقبل بغیر کسی واسطہ کے اس کے سامنے حاضر ہیں۔

امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں: وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے لیکن وسائل و ذرائع کے ذریعہ نہیں کہ وہ وسائل ختم ہو جائیں تو علم خدا منتفی ہو جائے۔ اس کے اور اس کے معلوم میں کوئی چیز نام علم اور اید موجود نہیں ہے۔ صرف اس کی ذات ہے اور بس!۔

حضرت علیؑ اپنی اس حدیث میں علماء کی ایجاد کردہ اصطلاح کے مطابق علم حصولی کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کیونکہ حوادث کے علم میں ذہنی صورتوں کا حصول خدا کے لئے نہیں ہے جو علم حصولی کی اساس ہے۔ البتہ اگر خدا کا علم حصولی ہوتا تو وہ ان صورت ذہنیہ کا متعلق علم کے لئے محتاج ہونا حالانکہ وہ غنی مطلق ہے۔

جس خدا نے عالم اور عالین کو پیدا کیا، اور ہر حاجت کو پوری کرتا ہے اور ہر کمال و نعمت کمال کرنے والا ہے اور تمام کمالات و فضائل کا مجمع ہے اس کے بارے میں یہ کیوں کر سوچا جاسکتا ہے کہ وہ فاقی الحاجات ہونے کے ساتھ محتاج بھی ہے؟

صور ذہنیہ ہمارے اذہان میں ہمارے حسب خواہش باقی رہتی ہیں اور جب ان کو مہمل کر دیتے ہیں تو وہ غنی ہوجاتی ہیں کیونکہ صور ذہنیہ ہماری مخلوق ہیں، علم حصولی کی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ کسی واسطہ کے بغیر حاصل ہوجاتا ہے اور علم حصولی واسطہ کا محتاج ہوتا ہے اور درحقیقت علم حصولی انسان کے آئینہ حواس پنجگاہ میں طبیعت و فطرت کا انعکاس ہے۔

ہمارے اور خدا کے درمیان میں یہ فرق ہے کہ وہ غنی مطلق ہے صور ذہنیہ کا محتاج نہیں ہے اور ہماری ذات ہی اسکی محتاج ہے۔

حوادث گزشتہ و آئندہ کی ترسیم ہماری محدود ہستی و افق فکر میں ہے کہ شخصی زمان و مکان کا اشغال کرتے ہیں اور خارج میں اس زمان و مکان کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ ضرورت نہیں ہے۔ اور چونکہ ہم ایک مادی مخلوق ہیں اور قانون اضافت کی بنا پر وہ ہمیشہ اپنے مکمل تدبیر و تغیرات میں زمان و مکان کا محتاج ہے۔ لیکن ایسا وجود جو ازل سے ابد تک تمام ظروف زمان و مکان میں موجود نہ ہو اور مادہ و اس کے لوازم سے آزاد ہو اس کے لئے گزشتہ و آئندہ کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔

اور چونکہ ہر حادث اپنے وجود و ظہور میں اللہ کے وجود مطلق کا محتاج ہے لہذا خدا اور اس موجود کے درمیان کوئی حجاب و حائل فرض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ تمام چیزوں کے ظاہر

و باطن پر محیط ہے اسی طرح دور، نزدیک، فاصلہ مکانی کا مفہوم ہمارے وجود کی محدودیت سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے :-

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا سُقِطَ مِنْ ذَرَّةٍ ۚ أَلَا يَعْلَمُ مَا
الْأَرْضُ مِنْ قُلُوبٍ فَلَا يَأْتِيهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (الأنعام / ۵)

اور جو کچھ خشکی و تری میں (اس کی) کوئی چیز بھی نہیں گرتا
مگر وہ اسے ضرور جانتا ہے اور نہ زمین کی تار کیوں میں کوئی دانہ اور نہ کوئی ہری اور
ذخشب چیز ہے مگر یہ کہ وہ نورانی کتاب (سینہ معصومین) میں موجود ہے۔

فرما کیجئے ہم ایک ایسے کھڑے ہیں جو شاہراہ عام کی طرف ہے اور ایک چھوٹی سی
کھڑکی سے بسوں اور کاروں کے ایک انبوه کثیر کو دوڑتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ظاہری بات
یہ کہ تمام بسوں اور کاروں کو ایک مرتبہ میں نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ اس چھوٹی سی کھڑکی کے سامنے
بے پندہ دیگر کاریں گزریں گی۔ اور نظروں سے پوشیدہ ہوتی جائیں گی اب اگر ہم ان کاروں کی
حقیقت سے بے خبر ہوں تو بھی خیال ہوگا کہ یہ کاریں ایک ایک کر کے ایک طرف سے پیدا ہو رہی
ہیں اور دوسری طرف ختم ہو جا رہی ہیں۔

درحقیقت یہ چھوٹی سی محدود کھڑکی ہماری نظروں میں کاروں کی گزشتہ اور آئندہ تصور
پیش کرتی ہے لیکن جو لوگ شرک کے کنارے کھڑے ہیں وہ تمام کاروں کو ایک ساتھ حرکت کرتے
دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح دنیا کا ماضی و مستقبل ہمارے حسابے بالکل اسی طرح ہے جو چھوٹی سی
کھڑکی کے نیچے سے کاروں کو دیکھ رہا ہے۔

علامہ کا بیان ہے : ہم تو پوچھنی میں بیان کیا گیا ہے کہ عالم کی چار جہتیں ہیں لیکن دنیا میں بسے
بہت سے خواص ہندو ہیں جن کے صرف تین ہی البسا ہیں جو صورت عامہ کے مخالف ہیں۔

اگر کوئی ناظر ایک صفحہ سے باہر ہو تو تمام صفحہ اس کے سامنے ہوگا اور پیش دہن اس کے لئے
ایک بے معنی چیز ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی ناظر "بعد زمانی" - بعد چارہم جہاں کے ادھر ہوگا تو فقط

سہ بعد بجا جاں کو دیکھ سکتا ہے اور جہات اور بعد اس کے لئے بے معنی سی بات ہے۔ اگرچہ انیم کے ناظر کا تصور شکل ہے۔

لیکن اگر کوئی ناظر سرعت نور کے ساتھ حرکت کرے تو فاصلہ صفر رہے گا۔ گویا تمام نقاط فضا کی جو ممبر ناظر میں پڑتے ہیں وہ سب بجائیں گے، جلوہ گر ہوتے ہیں اور ناظر تمام حوادث کو بجھا دیکھ سکتا ہے اور اس قسم کے ناظر کے لئے زمانہ ٹھہرا ہوا ہوگا۔ یعنی حوادث اگرچہ شرفی ہیں مگر نظر ناظر میں ایک آنی میں ہوں گے۔ وہ طویل زمان کے ساتھ نظر ناظر میں مستمر نہیں ہو سینگے اور اس ناظر کے لئے ماضی، حال، مستقبل بے معنی چیز ہے۔ اس کی نظر میں سب ایک ہی آنی میں ہے اور جب ہم جانتے ہیں کہ خدا زمانہ و مکان سے مافوق ہے تو تمام موجودات اور تمام حوادث خواہ ماضیت ہوں یا مستقبل سب اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔

اور اس بنا پر ہم ہر وقت اس خالق کے سامنے ہیں جو ہر صغیر و کبیر کو جانتا ہے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے :- إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا قَعَلْتُمْ (احضار ۹)

لہذا ہمارے اوپر واجب ہے کہ ہم اپنی مسئولیت کا احساس کریں اور ہر اس نفس سے اجتناب کریں جو ہمارے انحطاط اور اَوْتَرَعْنَا عن اللہ کا سبب بنے اور خدا سے عین علی الاطلاق کے حضور میں سرنگوں رہیں جس نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر زندگی کے مختلف مراحل کو طے کرایا یہاں تک کہ ہم اس مرحلہ میں داخل ہو گئے جہاں ہمارے پاس طاقت و استعداد اتنی ہے۔ اور ہم کو ان امور کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے جو ہمارے لئے طریق سعادت کھولتے ہیں اور ان فی البند مقصد تک پہنچاتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اوصاف الہی سے خیرین ہو جائیں اور تقاضا خدا کے لئے زاوراہ اکتھا کر لیں تاکہ رجوع الی اللہ یعنی رجوع الی مبداء الوجود کا تحقق ہو سکے اور ہم ان مقامات تک تقویٰ کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ لہذا خدا کی معرفت اور اس کی توحید مسطورہ یَتَّعَلَّقُ ان کے گرد نہ ہر امانت الہی کے عنوان سے رکھتی ہے۔

مباحثِ عدل

نظریات دربارہ عدل

تمام الہی صفات کے اندر عدل کی ایک الگ خصوصیت ہے۔ مسلمانوں کے نظریات عدل الہی کے سلسلہ میں مختلف ہیں۔ اپنے اپنے نظریات و اجتہادات کو مختلف اشکال سے پیش کیا ہے۔

۱۔ اشعری حضرات — مذہب اہل سنت کی وہ جماعت جو ابو الحسن اشعری کے پیروکار ہیں۔ عدل الہی پر ہماری طرح کا ایمان نہیں رکھتے۔ اور خالص الہی میں عدل کا انکار کرتے ہیں۔ اسی کے نظریہ میں خدا جو کام بھی کرے وہ عدل ہے یہاں تک کہ اگر کسی عمل کے ذریعہ سزا یا ثواب یا عقاب کے بغیر کسی کو ثواب یا عقاب کرے تو یہ فعل حسن ہے اور خالص عدل و حق ہے۔ یہ حضرات عدل کا اختراع افعال خدا کے کرتے ہیں اور ہر اس چیز کو عدل کہتے ہیں جو خدا کی طرف مستند ہو اس بنا پر اگر خدا احسنین کو عقاب اور گنہگاروں کو ثواب عطا کرے تو یہ عین عدل ہوگا اور اگر اس کے برعکس کرے یعنی اچھوں کو ثواب اور بروں کو عقاب کرے تب بھی عدل ہے۔

یہ حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کے بارے میں عدل و شتم کی تعبیر غیر مفہوم ہے اس سے یہ لوگ بزرگ خود پروردگار عالم کی تقدیس کرتے ہیں جبکہ ہم لوگ کیا بلکہ کوئی بھی دانشمند اس قسم کی نسبت کو جو تعصب و نارسائی فکر کی پیداوار ہے اسکو کبھی بھی تقدیس نہیں شمار کرتا۔ اس حکم کی نگرانی نظم و ضبط و مصلحت و منکر و مسبب تشبہ نظام عالم و افکار بشر میں انکار ہے۔

یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ نور عقل اپنی تمام نورانیت و اشتراقت کے باوجود اولیٰ کات دینی اور مسانی و احکام اسلام کے سلسلہ میں سمجھ جاتا ہے۔ اور اس منزل پر پہنچا کر اس کی روشنی اتنی کم ہو جاتی ہے کہ پیش با اقدارہ چیزیں بھی نہیں دکھائی دیتیں۔ لہذا ان مسانی میں عقول کی ہدایت پر بھروسہ کرنا ناممکن مبادیات سے۔

لیکن یہ دعویٰ نہ تو قرآن کے مطابق ہے اور نہ سنت کے مطابق ہے کیونکہ قرآن مجید تعقل سے اعراض کو ضلال کہتا ہے۔ بلکہ معارف الٰہی اور عقائد الٰہی کی طرف تدبیر و غور و فکر کرنے کے لئے انسانوں کو دعوت دیتا ہے۔ اور جو لوگ اس چرائے سے — جو ذاتاً روشن ہے — استفادہ نہیں کرتے ان کی تشبیہ خدا نے جانوروں اور حیوانات سے دی ہے۔
ارشاد ہے :-

﴿إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الضَّمَمُ الْبُكْمُ — وَالضَّمَمُ (۲۱)﴾

اس میں تنک نہیں کہ زبیں پر چپنے والے تمام حیوانات سے بدتر وہ بہرے گونگے (گھام) ہیں۔

رسول خدا میں فرماتے ہیں : گونگوں کی بدایت کے لئے خداوند عالم نے دو راہا بھیجے گئے ہیں اول ظاہری ہوری جن کو انبیاء کہلاتا ہے دوم باطنی ہادی جس کو عقل کہا جاتا ہے۔ (کنز العمال)

اس فقرہ کے مقابلہ میں مسلمانوں کے دو فرقے اور ہیں مفسرہ اور شیعوہ۔

۶۔ مفسر فی حضرات :

یہ حضرات صفات الٰہی میں عدل کو مانتے ہیں اور عدل کو انھوں نے مستقلاً ایک خیال و اصل قرار دیا ہے۔ اور اعمال انسانی میں فضا و قدر کو جمہوری کی حد تک ماننے کو خلاف عدل قرار دیا ہے۔ ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ نظام کونی اور نظام شریعی دونوں میں افعال خدا مبنی بر عدل ہیں اور جس طرح انسانی اعمال کو حسن و قبح کے میناس پر تو لاجا تا ہے۔ افعال خدا بھی اسی معیار پر تو لے جاتے ہیں۔ اور چونکہ انہوں نے عقل منطقی عدل ایک پسندیدہ اور ظلم و ستم ذاتاً ناپسند افعال ہیں اس لئے معبود بڑا دیکھیم علی الاعلاق کسی ایسے فعل کو انجام نہیں دے گا جو عقلاً مذموم بلکہ ممنوع ہو۔

ہم جس وقت کہتے ہیں : اللہ عادل ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ خداوند عالم حکمت و مصلحت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ خدا کے سلسلے میں حکمت کا مطلب یہ نہیں ہے

کو وہ اپنی کیوں کو پورا کرنے اور اپنے مقاصد تک پہنچنے کے لئے بہترین وسیلہ انتخاب کرتا ہے کیونکہ یہ تو انسانی ہے کہ جس کی حرکت نقص سے کمال کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن خدا کا کلام تو موجودات کو نقص سے خارج کرنا اور ان کو ان کے یعنی موجودات کے ذاتی مقاصد و کمالات کی طرف پہنچانا ہے۔ اور ہر مخلوق میں حکمت کا مطلب وہ غایات و مقاصد ہیں جو اس میں خدا نے ودیعت کر دیے ہیں۔ اور خدا ان چیزوں کو فیض و وجود بخش کر دیا رہ ان کے استعداد کے تکمیل کی طرف لہجہ آتا ہے۔ بلند پایہ جان ایسا چاہے کہ عدل کا مفہوم تو بہت وسیع ہے لیکن اس کے واضح ترین مصداقی ظلم و عدوان سے دوسری ہیں۔

اہم جعفر صادق ؑ نے عدل کے معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا: خدا کے بارے میں عدل کا مطلب یہ ہے کہ تم خدا کی طرف کسی ایسی چیز کی نسبت نہ دو کہ اگر وہی چیز تم سے سرزد ہوتی تو باعث ملامت ہوتی۔ (کفایۃ الموحیدین - ج ۱ - ص ۴۴۲)

سلوک و عمل میں ہر ظلم و فساد اپنے اسباب و اسباب اور انسانی سے اس کے عباد ہونے کے صورتوں میں اختلاف تفاوت کے ساتھ ہمیشہ اس کا تعلق صرف یا تو جہالت و ناانگاہی یا ضرورت کی وجہ سے ہوتا ہے اور یا پھر کینہ و عداوت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بہت سے ایسے بھی لوگ ہیں جو ظلم و فساد سے اظہار خیراری کرتے ہیں لیکن عواقب امور کی جہالت کی وجہ سے کبھی ظلم و عدوان یا اعمال فاسدہ و مہیجہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

کبھی کبھی ان ایسی چیز کا محتاج ہو جاتا ہے کہ یہاں پر توانائی اور امکانات اس کے اختیار سے باہر ہو جاتے ہیں اور پھر ان اپنے حصول مقاصد کے لئے بہت سے فساد و تباہیوں پر آمادہ ہو جاتا ہے، ضرورت، حرص شدید، اہم و تکلیف، کینہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ان دوسروں پر ظلم کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی تو وہ اپنے ہمت سے اختیار سے بچتا ہے۔ اور وہ اپنی ساری کوششوں کو حصول مقاصد کے لئے بروئے کار لاتا ہے اور اس سلسلہ میں تمام اخلاقی و انسانی قید و بند کو توڑ دیتا۔

اور مظلوم کی گردن پر سوار ہوتا ہے۔

مگر ذاتِ احدیت ان خصائص و نقائص سے پاک و مبرا ہے کیونکہ اس کے وسیع علم کے سامنے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اور نہ اس کے لئے کسی قسم کی عاجزی یا ذلت کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ اور ظاہری بات ہے جو ذاتِ سبحانیہ صفاتِ اکمال ہوگی وہ کسی بھی شی کی طرف ابداً محتاج و فقیر نہیں ہو سکتی اس لئے کہ خدا کو یہ خطرہ نہیں ہے کہ کہیں وقت نہ نکل جائے اور جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرے تو بغیر کسی محدودیت کے وہ اپنے ارادہ کو پورا کرنے پر قادر ہے اس لئے وہ جاہد عدالت سے خارج ہو کر کسی پر ظلم نہیں کرے گا اور نہ نفسی خاطر کے لئے کسی سے انتقام لے گا اور نہ ہی کوئی ایسا کام کرے گا جو اس کے کمال کے معافی ہو۔

پس معلوم ہوا کہ اس قسم کے اعمال کے اسباب ذاتِ پروردگار میں متحقق ہی نہیں ہو سکتے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ظلم و ستم کا مصداق وہ ذاتِ حقیقی ہو جس کا فیض جوہر اور قدانت ذاتِ تمام جمہات و وجود پر مشتمل ہے۔ خود قرآن مجید ذاتِ پروردگارِ عالم سے ظلم اور ہر قسم کی نفی کرتا ہے جو اس کی ذاتِ مقدس کے مناسب نہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے :-

فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (روم ۶۱)

پس خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا مگر وہ لوگ (کفر و کبر) سے) آپ اپنے اوپر

ظلم کرتے تھے۔

اس آیت میں خدا نے اپنی ذات سے ظلم کی نفی کی ہے اور بندوں کی طرف نسبت دیا ہے۔

اور یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ خدا ایک طرف تو اپنے بندوں کو

اتمامِ عدل کا حکم دے اور فحشاء و منکر و بلی سے منع کرے اور خود ان چیزوں کا ارتکاب

کرے اور خلافِ عدل کرے ؟ ارشاد ہے :-

إِنَّ اللَّهَ بِأَمْرٍ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ قَائِمٌ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَتِمِّهِ عَنِ

الْمُعْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ - (نحلہ ۹۱)

اس میں شک نہیں کہ خدا انصاف اور دونوں کے ساتھ نیکی کرنے اور قزنداروں کو (کچھ) دینے کا حکم کرتا ہے۔ اور بدکاری اور ناشائستہ حرکتوں اور سرکشی کرنے کو منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔
 اسی آیت میں خدا بندوں کو عدل کا حکم دے رہا ہے تو خود اس کے خلاف کیونکر اقدام کر سکتا ہے۔ مترجم۔

قرآن کی نظریں عدالت کا مسئلہ بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے اور تمام عدالت کو اتنا اونچا کر دیتا ہے کہ بغتہ انبیاء کا مقصد ہی اقامہ عدل قرار دیدیتا ہے۔ ارشاد ہے:-
 اِنَّا اَمْرٌ مُّسْلِمًا مَّا يَلِيُنَا بِالْاِثْنَاتِ فَاَسْرَفْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ فَاَلْيُزَانُ بَيْنُقَوْمٍ لِّلنَّاسِ
 بِالْقِسْطِ (الحمدہ / ۱۶۷)

ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو وضع و روشن معمرے دیکر بھیجا اور ان کے ساتھ ساتھ کتاب اور انصاف کی ترن و نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

عدالت، اجتماعی کے سلسلہ میں حضرت علی کا نظریہ ملاحظہ فرمائیے۔ ابن عباس کا بیان ہے ایک دن میں حضرت علی کے پاس دی فارمیں گئیں تو دیکھا آپ اپنی جہتیوں کو ٹانگ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمایا: اس جوتی کی کیا قیمت ہوگی؟ میں نے عرض کیا اس کی کوئی بھی قیمت نہیں ہے اس پر فرمایا: اس پرانی جوتی کی قیمت میری نظر میں تمہاری اس حکومت سے زیادہ ہے لہذا یہ کہ میں اس حکومت کے ذریعہ عدالت قائم کر سکوں۔

اسلام عدالت اجتماعی کی اہمیت کا اتنا قائل ہے کہ اگر مسلمانوں کی ایک جماعت عدالت اجتماعی کے جادہ سے منحرف ہو جائے اور دوسروں پر ظلم و تعدی کرنے لگے تو ان کو اس اقدام سے روکنا ہوگا چاہے اس کے لئے جنگ کرنا پڑے۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

فَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاصْلِحْهُمَا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَاْتَاكَ النَّبِيُّ فَيَصْحَبْهُنَّ اِلٰى اَمْرِ الدِّلَّةِ فَاَنْتَ فَاَصْلِحْهُمَا

بِسْمِ اللَّهِ بِالْعَدْلِ ذَا قُسْطٍ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (المجرات ۱)
 اور اگر مومنین میں سے دو فرسے آپس میں لڑیں تو ان دونوں میں صلح کرادیں
 اگر ان میں سے ایک (فریق) دوسرے پر بے باقی کرے تو جو فرقہ زیادتی کرے (تم وہاں)
 اس سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے پھر جب رجوع کرے
 تو فریقین میں مساوات کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف سے کام لو۔ بیشک خدا
 انصاف کرنے والا کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت میں ایک خاص نقطہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو لوگ دونوں میں صلح کرادیں
 ہیں۔ ان کو بہت زیادہ دقت کرنی چاہئے تاکہ نزاع کا خاتمہ عدالت، امر پر جو اور کسی بہانہ حق و
 عدالت میں کمی نہ ہو۔ کیونکہ جہاں پر دو ایسے فریقوں میں جنگ ہوتی ہے کہ جہاں ایک کی طرف
 سے دوسرے پر زیادتی ہو تو اگر یہ بھولی حضرت مسالحت کے ذریعہ سے سنبھل کر ختم کرنا
 چاہتے ہیں تو اگر یہ معافی بخانی پر زیادتی کرنا کہ ایک پارٹی کو اس بات پر رضی کریں کہ وہ اپنے
 حق سے دستبردار ہو جائے تو اس بات کا احتمال ہے کہ یہی عذر و معذرت روج تیار
 و زیادتی کو ان افراد میں اور زیادہ تقویت پہونچا دے جنھوں نے جنگ و سبترہ جوئی میں کسب
 امتیاز کیا ہے اور بشری مسالحت میں زیادتی نہ ہو رہی ہو اسے کہ ظالم کو کچھ صدمہ نہ کر رہی
 کر لیا جاتا ہے۔

اور بعض حقوق سے چشم پوشی اگرچہ فی نفسہ ایک پسندیدہ چیز ضرور ہے مگر اس قسم کے
 سوانح میں ظالم کے دل میں اچھا اثر نہیں چھوڑتی۔ حالانکہ اسلام پر چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرہ
 میں ظلم و عدوان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اور لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ کوئی شخص
 ظلم و زیادتی سے کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتا۔

نظام وجود کو دیکھ کر ہم خود بھی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس میں ایک ایسا توازن و اعتدال
 ہے جو تمام ظلم و برکت پر حکومت کر رہا ہے۔ اور اس اعتدال کا ظہور فدا، انکسار و نیت،

اور تمام اجسام کی حرکت میں نمایاں ہے۔ الجھٹل وں کی رفتار، سیارات کے دھڑکے ساتھ عالم جماد و نبات میں بھی ایک مخصوص توازن و اعتدال موجود ہے۔ بلکہ ایک زندہ موجود کے اعضا میں مکمل اعتدال ہے۔ مختصر یہ کہ ایٹم کے اجزاء نے داخلی سے لیکر مینمارا سہانی کرات یہ سلسلہ موجود ہے۔ یہ ساری چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ تمام اجزاء عالم میں ایک انتظام تام موجود ہے۔ حضور سرور کائنات نے اس عدالت عویٰ اور توازن تام اور یہ بات کہ کوئی چیز بغیر حساب کے نہیں ہے اسکو اپنے ایک مختصر و طبع جلد میں بیان فرمایا، یہ عدل ہی ہے کہ جو آسمان و زمین کو اپنی جگہ پر روکے ہوئے ہے۔

قرآن مجید جناب موسیٰ کی زبان سے کھلوا رہا ہے :-

رَبَّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهُ فَشَمِّمْ هَدٰی (طہ ۵۰)

موسیٰ نے کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب

صورت عطا فرمائی۔ پھر آسمان نے زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔

جناب موسیٰ ایک مختصر سے جلد میں نظم و لطف و زیبائی سے سرشار کائنات و آفرینش

کو جو میں جملہ آیات خداوندی ہے۔ فرعون سے تباہ ہے جس تک اس کی فکری نجات پا جائے اور وہ الہی عادلانہ نظام کے وجود کو پوری کائنات میں محسوس کر سکے۔

نظام و اعتدال تو کائنات پر فطری طور سے نافذ ہے۔ فطرت کا ہر جزو سنسن و قوانین

طبیعت کے چمکے اندر اپنے کمال و وسیع غماص کی طرف رواں ہے۔ اور نظام عام اور اس

پر حاکم و اباط میں کسی بھی قسم کا انحراف نظام کو تو میں اختلاف و اضطراب کا سبب بن جاتا

ہے۔

فطری طور پر طوابع طبیعت میں کسی بھی قسم کی بے نظمی خود طوابع میں عکس العمل کی نشان

دہی کرتی ہے اور داخلی یا خارجی عوامل جو راہ تکامل میں مانع ہوں یہ طوابع ان کو ختم کر دیتے

ہیں اور رشتہ و کمال کے ادا کے لئے راستہ کو باز کر دیتے ہیں اور دوبارہ نظم کو برقرار

کر دیتے ہیں۔

جس وقت بدن پر بیماریوں کا حمل ہوتا ہے یا میکروبات کا حمل ہوتا ہے سفید رومی خلیا (۵-۱۰) ان میکروبات کے حمل کو روکنے پر جبری طور سے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور طبی علاج و معالجہ ان کے لئے خارجی مدد ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ بدن کو پھر اعتدال پر لانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن انسانی برحون نظام عدل لاگو ہے اس کا حال اس سے الگ ہوتا ہے کیونکہ ان کی قدرت اختیار عطا کی گئی ہے۔

لیکن وہ خدا جو رحمان و رحیم، منعم و کریم ہے اس کے لئے محال ہے کہ کوئی ایسا کام کرے جو عدل مطلق کے خلاف ہو۔ اور یہی قرآن کی آواز ہے :-

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَ السَّمَاءَ بِنَآءٍ اَوْصَوْنَاکُمْ فَاَحْسِنَ
مُوَزَّکُمْ وَ رَزَقَکُمْ مِنْ الطَّیِّبَاتِ ذَلِکُمْ اللّٰهُ رَبُّکُمْ (سورہ اعراف/ ۶۴)

اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے واسطے زمین کو بچھرنے کی جگہ اور آسمان کو بچھتہ بنایا اور اسی نے تمہاری صورتیں بنائیں تو ابھی صورتیں بنائیں اور اسی نے تمہیں صاف ستھری چیزیں کھانے کو دیں۔ یہی اللہ تو تمہارا پروردگار ہے۔

عالم پر شر و فساد کی حکمرانی کیوں؟

خدا کی عدالت سے لوگوں کے ذہنوں میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً جب خدا عادل ہے تو نظام عالم میں یہ بلائیں، خسائر، شر و رکاوٹوں کا وجود کیوں ہے؟ معاشرہ کے طبقات میں نفاق کیوں ہے؟ بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اس قسم کے سوالات و اعتراضات پیدا ہوتے ہیں جس سے وہ ہنسکا رہا نہیں حاصل کر پاتے اور اس کو عقیدہ لایعنی سمجھنے لگتے ہیں۔

وہ لوگ کہتے ہیں: یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جب عالم ایک حکمت کے پیش نظر پیدا کیا گیا تو پھر اس میں آلام و شرور کی حکومت کیوں ہے؟ اور شقاوت و بدبختی کا دور دورہ کیوں ہے؟ اور چاروں طرف خرابیاں اور نقائص کیوں موجود ہیں؟

آخر دنیا کے گوشہ و کنار میں وحشتناک حوادث ہستی بستر کیوں مورد حملہ قرار دیتے ہیں؟ اور ہزاروں ویرانیاں، تلفات، نقصانات کیوں ہوتے ہیں؟

کیوں یہ خوبصورت ہے اور یہ بدصورت ہے؟ یہ صحیح ہے یا بیمار ہے؟ یہ سب بڑے کیوں نہیں خلق کئے گئے؟ کیا یہ اختلافات اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ سر زمین حیات پر کوئی خدا کا فرمان نہیں ہے؟

جب تک دنیا سے ظلم، تبعیض، آفت، مصیبت، نقص، ضعف، فقری، بیماری کا خاتمہ نہ ہو جائے نظام عدالت کا تحقق ناممکن ہے:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم کو یہ قبول کر لینا چاہئے کہ ماضی وجود میں ہماری تحقیقات ہم کو ان ظاہر وجود کے گہرائی کی انتہا تک نہیں پہنچا تیں اور نہ ان کی نہایتوں اور غایتوں کی توجیہ و تفسیل کے لئے کافی ہیں۔

یہ درست ہے کہ پہلی نظر میں تلخ حوادث اور بلایا ان کی حقائق کی معرفت کے بغیر ہم کو یہ تصور عطا کرتی ہیں کہ نظام عالم میں عدل کا وجود نہیں ہے اور جب انسان اس بات کو شدت سے سوچتا ہے تو اس کے فکری تاثرات میں عظیم انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور اسی تاثر کے عالم میں وہ مسلسل غیر منطقی تحلیل کرنے لگتا ہے۔

لیکن اگر ذرا گہرائی اور بنیادی طور پر غور و فکر کریں تو ہم کو یہ چہل چالیکہا کہ ہمارے اس تصور کی بنیاد صرف اس بات پر قائم ہے کہ ہم ان موجودات پر حکم لگانے کے سلسلہ میں نبی اور ان لوگوں کی ذات کو جو ہم سے ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ مربوط ہیں اور اپنے اور ان لوگوں کے مصالح کو معیار بناتے ہیں کہ جو چیز ہمارے لئے نفع بخش ہے وہی حسن اور جو ہمارے لئے مضر ہے وہی قبیح ہے پس حسن و قبیح کا معیار وہ ہے جس کو ہماری قاصر نظر میں سنت ہوئے حاکم پر مبنی پر دقیق معرفت کے بغیر حسن و قبیح دیکھتی ہیں۔ پس کیا حوادث کا ارتباط صرف ہم سے ہے تاکہ ہم اپنی ہی ذات کو حسن و قبیح کا معیار قرار دیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔

ہماری مادی دنیا تغیر پذیر ہے جو حوادث آج نہیں ہیں وہ کل ہو سکتے ہیں۔ کچھ چیزیں مومن ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ دوسری چیزیں آجاتی ہیں۔ آج جو چیز بعض لوگوں کے لئے مفید ہے کل ہو سکتا ہے اس کا خارجی وجود ہی نہ رہے۔ لیکن چونکہ ہم انسان ہیں اور اپنے سے اور کائنات سے ایک لگاؤ اور علاقہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ہاتھوں سے چیزوں کا نکل جانا برا اور ہمارے ہاتھوں میں آ جانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ انسانوں اور اشیاء سے اس کی وابستگی کو چھوڑ کر بھی عالم کے تغیر پذیر ہونے کی وجہ سے مختلف حوادث پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اگر امکان تغیر ہی ختم ہو جائے تو کوئی حادثہ نہ ہوگا اور پھر ایسی صورت میں خوب و بد کا بھی وجود نہ ہوگا۔ (یعنی یہ تمام چیزیں تو تغیر عالم کے لوازم سے ہیں ان سے عالم کے نظام کا خلافت عدل ہونا لازم نہیں آتا۔ مترجم)

اور پھر اس خیالی دنیا میں نہ نقص ہوگا نہ کمی ہوگی نہ نظروں کے سامنے رشد و نمو کا وجود

ہوگا۔ اسی طرح اس خیالی دنیا میں تضاد و تباین، انفرادیت و تفاوت، حرکات و ترکیبات میں تنوع رکھے بھی تو نہ ہوگا۔ اور جس خیالی دنیا میں کمی نہ ہوگی۔ ضابطہ و قانون نہ ہوگا۔ انسانی، اخلاقی، اجتماعی تبدیلی نہ ہوگی وہ بھی تو تغیر پذیر ہوگا اور حرکات و سیارات کا مولود ہوگا اور ہر تحرک و تفاوت کا خاتمہ ہو جائیگا تو زمین، سورج، چاند، دن، رات، مہینہ، سال کچھ بھی باقی نہ ہوگا جس دنیا میں رنج و مصیبت نہ ہوگی، حرکت و سعی نہ ہوگی اور جس وقت خطرات کا احسا نہ ہوگا اس میں امن و مسرت و سرور بھی حاصل نہ ہوگا۔

جس دنیا میں امیدوں اور آرزوؤں کا ہجوم نہ ہو اور جانداروں میں عطف و محبت و مودت کا اثر ختم ہو جائے وہاں پر انسانوں کے روابط یا یہ محبت پر استوار ہی نہیں ہو سکتے اور جس جگہ کمال کا جذبہ انسان کے وجود کے گہرائیوں میں ڈوب جائے گا۔

ایک جہاں بنی وسیع کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مکمل ہے آج جو چیز ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔ وہ حالی یا مستقبل میں دوسرے کے لئے فائدہ مند ہو۔ کیونکہ کائنات کی تلاش و حرکت برائے تحقیق ہدف عالم ہے اور تمام موجود کے سود مندی کے لئے ہے۔ اور بہت سے افراد اس سلسلہ میں نقصان اٹھاتے ہیں اور یا پھر وہ تمام افراد انسانی کے لئے مفید بنی ہے۔

البتہ اگر ہمارے اسکان میں یہ بات ہوئی کہ معارف الہیہ کے سمندروں میں غوطہ لگا کر علوم کی انگلیوں سے اسرار و رموز کے محائف کے اوراق کو تلاش کرتے تو یقیناً حوادث کے عواقب و فلسفہ جاری نظروں میں واضح و روشن ہو جاتا۔ لیکن جب ہم یہ جانتے ہیں کہ آج کے عوامل عمل و بقا کے سلسلہ کا نتیجہ ہیں اور یہی بعد والے حوادث کے اسباب اور آنے والے معلومات کی علل ہیں تو پھر ہم کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ ہم جو کچھ بھی دیکھ رہے ہیں اور اس پر خیر و شر کا حکم لگا رہے ہیں یہ حکم جامع اور عمیق نہیں ہے۔

ان اگر ہمارے لئے چمکن ہوتا کہ اوپر سے مجموعہ عالم کے ہر جانب کو۔ غولہ یکا بنی ہو یا سیلی۔ دیکھ سکتے اور نظام سرسبز شہادت عالم کو دیکھ سکتے اور ایک طرف کے اثر و تار و پیر انسان کی طول تاریکی زشتہ و آئندہ اور تمام موجودات کی نسبت اودان کے حکمت اور تمام سائنس ہستی میں، شعاع ازلیت و ابدیت تک مطلع ہو سکتے اور یہ دیکھ سکتے کہ اس حادثہ کے نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں۔ تب ہمارے لئے حکم گنا ممکن ہوتا کہ یہ حادثہ خیر ہے لیکن کیا ان کے پس میں ہے کہ تمام اسرار عالم کا اتنا کامل و ممکن احاطہ کر سکے؟

لیکن جب ہمارے پاس اس تحقیق کی طاقت نہیں ہے اور اس سلسلہ میں ہمارا اقدام بہت ہی ناقص ہے اور اس عالم کے اسرار و رموز معقدہ کے چہرے سے نقاب کشائی ہمارے لئے ناممکن ہے تو پھر ہمارے اوپر واجب ہے کہ جلد بازی سے کام نہ لیں اور ایسا ناقص فیصلہ کرنے سے توقف کریں۔ اور ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس بات کو بھی سمجھ لیں کہ اپنے مخصوص منافع و مصالح کو اس وسیع عالم کے نظام عام کے لئے مقیاس نظر نہ قرار دیکر فیصلہ کریں: ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے خانی نظریات کو۔ جو ظروف خاص کے تابع ہوتے ہیں۔ آخری حکم کا مدرک قرار دیں۔

بسا اوقات تحقیق مقصد کے لئے خود فطرت کا عمل ایسا ہوتا ہے کہ عادتہ اس کے تصور انسان کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ ہم کیوں یہ تصور نہ کریں کہ یہ غیر متوازن و غیر متناسب حادثہ ایسی زمین چھوڑ کر سننے کے لئے کوشش کر رہے ہیں تاکہ اس سے جدید مولود پیدا ہو سکے جو زمین میں خدا کا جانشین ہو۔ ہو سکتا ہے زمانہ اور جگہ کے اوضاع و احوال اس بات کے متقاضی ہوں۔

اگر مشتاک تحولات و انقباضات مقصود حذف کے پیش نظر جاری و ساری نہ ہوتے اور ادوار مختلف زمین و آسمان ہوتے تو آج زمین پر مختلف النوع حیوان و انسان کا وجود نہ ہوتا۔

آخرچہ حوادث و ظواهر استثنائیہ کو دیکھ کر ہم عالم وجود کو بے علتی ہرج و مرج

وہ بے پائیگی سے کیوں متہم کریں؟ اور چند محدود و چھوٹے غیر موزون حوادث کو دیکھ کر گشتِ اعتراض کیوں دہرا کر لیں؟ اور ان تمام معقول مظاہر و عجیب و دقیق ظرائف کو بھول جائیں جو لامتناہی حکمت اور ارادہ مطلقہ تامہ کے آثار ہیں؟

بشری علوم اپنے تمام فریبندگی کے باوجود بہت تھوڑے سے اور محدود و ناماصر ہیں۔ اور انسان تو ابھی معلومات کی ابتدا میں ہے اور یہ غروبِ علمی صرف الفاظ کی بازیگری ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ جو انسان ابھی صرف اپنے بدن کے اسرار سے کامل طور پر واقفیت نہیں رکھتا وہ نظامِ ہستی کے بیکراں اسرار کو حل کرنے کی کوشش کرنے لگے تو بے ایک حماقت کے سوئی کیا ہے؟

کارل — (۱۸۴۷ء) — کہتا ہے ہم سے ہمارے جسم سے زیادہ کوئی شئی قریب نہیں ہے اس کے باوجود بھی ہم اپنے جسم کے اسرارِ کثیر سے واقف نہیں ہیں۔

انسان جب تمام جوانبِ ہستی میں تدبیر کو دیکھتا ہے تو اس کا فریضہ ہے کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ کائنات ایک روندِ تکاملی هدفدار کا مجموعہ ہے۔ اور اس کی ہر چیز ایک معین میزان کے تابع ہے اور اگر کسی چیز کو وہ معقول و منوجہ نہ دیکھے تو اس کو اپنی کوتاہ نظر سمجھے۔ اور یہ احساس کرے کہ اس کا محدود وجود کائنات کے تمام اسرار و احوال کو نہیں جان سکتا۔ لیکن نفسِ عالم وجود میں کوئی نقص نہیں ہے۔

کائنات میں تلخ حوادث کا ہونا ہماری نظر میں اس دیہاتی کے قصہ کے مانند ہے کہ ایک دیہاتی شہر میں گیا تو اس نے دیکھا بڑے بڑے بلند و زرد قدیم عمارتوں کے گرانے میں مشغول ہیں تو اس نے خیال کیا یہ عمارتوں کا گرانا اور اس کو ویران کر دینا یو قوفی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن کیا یہ تخریب اور قدیم عمارتوں کا گرانا کسی پروگرام اور کسی ہدف و مقصد کے بغیر تھا؟ اور کیا دیہاتی کا فیصلہ منطقی ہے؟ ہرگز نہیں وہ تو صرف عمارت کا گرانا دیکھ رہا ہے اسے کیا معلوم یہ انجنیروں کے نئے پلان کے مطابق یہ کام انجام دیا جا رہا ہے؟

ایک دانشمند کا کہنا ہے کہ: جو لوگ ظاہر و جواد پر نفس و مکی و شر کا حکم لگاتے ہیں انکی مثال ان بچوں کی طرح ہے جو ایک ایسے ٹھیکر کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جس کو اپنے پر و گروم کے مطابق ایک جگہ دکھا کر دوسری جگہ دکھایا جائیگا۔ مگر بچوں کے نزدیک طنابوں کا اکھاڑنا، جھوپیاں کھانسی کرنا انسانوں اور حیوانوں کی وہاں آمد و رفت کا ہونا یہ سب باتیں ٹھیکر کے ختم ہو جانے کا اعلان ہوتا ہے۔ — حالانکہ وہ دوسری جگہ دکھایا جائیگا۔

اگر ہم حقیقی و وسیع نظر سے مصائب و بلاؤں کے وقوع کو دیکھیں اور ان سے صحیح استفادہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ واقع میں یہ نعمت ہیں مصائب و بلا نہیں ہیں۔ بلکہ نعمت کا نعمت ہونا یا مصائب کا مصائب ہونا اس کے سامنے ان کے رد عمل سے مرتبط ہو کر رہتا ہے۔ اور ایک ہی شے دو مختلف شخصوں کے لئے اس سے دو صفتوں سے متصف ہوتی ہے۔

انسان کے لئے مصیبت و تکلیف ایک قسم کی خطرے کی گھنٹی ہے جس کے ذریعہ ان اپنی کمی اور نقائص و غلطیوں کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اور درحقیقت یہ الم و تکلیف ایک فطرین نعمت و کنٹرول ہے۔

اگر مالدار کی موجب عیاشی و تن پروری کا ہوتا تو کمیت و بد بختی ہے۔ اور تنگ دستی و قیصر اگر سبب تربیت و پرورش اور تکامل روح ہوتا تو نعمت ہے۔ اس لئے مطلقاً ثروت کو خوشبختی اور قیصر کو بد بختی نہیں کہا جاسکتا۔ اور یہ قانون تمام طبعی مواہب میں قابل اطلاق ہے۔

جو قومیں اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرتی ہیں اور اپنے وجود کے بقا کے لئے سعی و عمل کرتی ہیں وہ زندہ اور با اقتدار ہوتی ہیں۔ ہم جس وقت عمل کی صفت سعی اور مشقت کو کوشش سے کریں اس وقت ہم کو وہ شکل دور نہیں بھول جانا چاہئے جو انسان کو اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لئے ذاتی قوتوں کی تائید کے عمل میں آیا تھا۔ اور جو قوم سعی و کوشش نہیں کرتی اور مطمئن فضا میں زندگی بسر کرتی ہے وہ مادی سہولت اور شہوات و لذائذ

غرق ہونے کی وجہ سے بہت جلد شکست کھا جاتی ہے ۔

اور بہا اوقات انسان عظیم مقاصد کے حصول کے لئے ایسی ایسی بڑی سختیاں اور تکلیفیں برداشت کرتا ہے کہ اگر وہ سختیاں نہ ہوتیں تو مقصد کی بزرگی ظاہر نہ ہوتی ۔ اسی لئے گڑ گاہ تکامل میں جلدی راہ اور اندھی و میکا کی حرکت قابل قبول نہیں ہے ۔ اور ان کی کوششیں بغیر عزم محکم کے بغیر اس کی تک نہیں پہنچ سکتیں کیش کاش و تضا د جانور کو بھیج راستہ پر چلا یو لاد و نڈا ہے ۔ جماد فضا کے نتیجہ میں چور چور ہو جاتے ہیں لیکن انسان مشکل و صعوبات میں گھر کر مضبوط ہو جاتا ہے ۔ اور بشر کا بوج مشر و فر کے بغیر ہوتا بھی نہیں ۔

لذت مطلقہ اور عشق دنیا اور دنیا کو صدف بنالینا گمراہی و ابتذال ہے ۔ بد بخت ترین لوگ وہی ہوتے ہیں جن کی تربیت نعمت نامہ میں حیات کی سختیوں سے دور رکھ کر زمانہ کے گرم و سرد کو چٹکے بغیر کر جائے ۔

خواہشات کی بیرونی بار آور حرکت عزم محکم ، سعی مسلسل کے ساتھ جمع نہیں ہوتی کیونکہ نفس و استقامت کی طاقت لذت بال نفسا و کی ضد ہے ۔

لیکن جس طرح دونوں کا جمع ہونا محال ہے ویسے ہی دونوں کی نفی بھی محال ہے لہذا انسان کا فریضہ ہے کہ سعی مسلسل کرتا رہے تاکہ ذاتی طور پر قوت ارادہ و ثبات نمود پاتا رہے اور لذت و عیش کی طلب اسی حساب سے کم ہوتی رہے ۔

دینکے شیرینی و تلخ حقائق سے سبے خبر نازوں کے پروردہ حضرات جن کو کہے اندازہ و فاضل و آسائش میں رہے ہیں بھوک کی سختی کبھی برداشت نہیں کی ہے اس لئے نہ وہ لذیذ ترین غذا کی لذت سے آشنا ہیں اور نہ لذت حیات کا اور اک کر سکتے ہیں اور نہ زیبا یوں کا احساس کر سکتے ہیں کیونکہ مشکلات سے آشنا ہی نہ کیا یوں اور غموں کا مزہ چکنا ۔ دشواریوں کی برداشت کی صفا رکھنا ، رنجوں اور مصیبتوں کا تحمل کرنا ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو قدم بہ قدم انسان کے ساتھ ہیں ۔ لہذا یہ حیات سے فائدہ اٹھانے کی شرط ہے ۔

جب انسان ناگوار حوادث کے نیچے پست ہے اور دنیا کی بلندی و پستی کو لمس کرتا ہے تب اسکی نظر میں گرفتہ زندگی کی معنوی و مادی مشرطہ آتے ہیں۔

حیات مادی میں سرگرم ہونے کی وجہ سے انسان دنیا کا غلام بن جاتا ہے۔ اور آزادی مضیر کو کھو بیٹھتا ہے، حیات ابدی سے غافل ہو جاتا ہے یا تغافل کرنے لگتا ہے۔ اور جب خواہشات کے پردے اس پر سایہ مغلن ہیں اور اس کی روح نایکیوں میں اسیر ہے وہ مادی مواقع میں یک نعلے کی طرح ادھر ادھر مارا پھرے گا۔ اور خدا کے علاوہ سب ہی کا اسیر ہوگا۔ اس لئے وہ ایک ایسے بیداری کے وسیلہ جو عقلی افکار کا باعث ہو اور نفس مثبت رکھتا ہو محتاج ہے تاکہ اس کو جہان فانی کی یاد دلائے اور آزادی نفس — جو آسمانی تربیت کا مطلوب نہائی ہے — تک پہنچائے۔ اور ان تمام موانع سے آزاد کرے جو بشریت کو کمال و رفعت سے روکتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ تہذیب نفس بہت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے لئے خواہشات سے چشم پوشی کرنا ہوگا اور یہ بہت ہی کڑوا گھونٹ ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ اس قسم کی تہذیب سے نفس استعداد روحانی کے لئے آمادہ ہو جائیگا۔ مگر یہ بھی مسلم ہے کہ گناہوں اور لذتوں سے اقتنا بطلوس سے زیادہ تلخ ہے اور ہچکھوکے ڈنک اور سانپ کے کاٹنے سے زیادہ سخت ہے۔ انسان اپنے حل مشکلات کے لئے اور رفع موانع کے لئے اتنی قدرت آسانی سے نہیں رکھتا۔ اور شدید محاورت کے بغیر بلند یوں تک نہیں پہنچ سکتا۔

مصائبِ عامل بیداری و حرکت ہیں

جو لوگ کامیابیوں اور قدرت کے نشہ میں مست ہیں اور ان کی اروع و مغول پر غواہی کے غلبہ نے ان سے انسانی اقدار چھین لئے ہیں، گوشہ و کنارِ عالم میں واقع ہونے والے تلخ حوادث کبھی ان کے افکار و بیداری کے لئے زینہ ہوا کر دیتے ہیں اور ان کی عقلوں پر پڑے ہوئے غفلت کے پردے اٹھا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کمالِ انسانیت کی طرف سیدھی راہ پر گامزن ہو جائیں اور مستقبل میں ایک نیک اور ثروتمند نوجو کے حامل ہو جائیں۔ اور بہت سے ایسے لوگ نکلتے ہیں جنہوں نے ان حوادث و آلام کے تجربہ میں شاندار مستقبل کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

نقصان دہ اثرات، وحشتناک غرور و غفلت اور ان ترقی و درکس کے نتائج میں جن کو بشرانِ حوادث سے سیکھنا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حوادث و آفات — اگرچہ ان میں نسبی شرمی ہوتا ہے — بہت سی نعمتوں اور پوشیدہ الطاف پر مشتمل ہوتے ہیں جو انسان کو بیداری اور عزمِ محکم عطا کرتے ہیں۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ دشواریاں و تکامل کی مقدمات ہیں اور اقدارِ انسانی کے لئے زمین ہوا کر کے والی ہیں۔ اور انہیں دشواریوں سے درجِ خلوص و بلند ی یا انحطاط کا انسان میں تبدیل جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے :-

وَلْيَسِّرْ لَكُمْ بَشْرًا مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَفْسٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ
وَالثَّمَرَاتِ وَلْيَسِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمْ مَسْئَةٌ قَالُوا:
إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ - أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ

وَرَحْمَةً وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (البقرہ - ۱۷۰-۱۵۲)

اور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے ضرور آنا نہیں گے اور (اے رسولؐ) ایسے صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آچری تو وہ ڈرنا نہ سستہ بول لکھتے ہم تو خدا ہی کے ہیں اور ہم اسی طرف لوٹ کر جائیں گے۔ خوشخبری دید کہ انھیں لوگوں پر ان کے پروردگار کی طرف سے نصابتیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

مشہور فلسفی امرسن (EMERSON) کہتا ہے: وہ تغیرات جو کبھی لوگوں کی سعادت کو چکنا چور کر دیتے ہیں۔ وہ اسی طبیعت کی طرف سے انتباہ ہے جس کی خلقت نور اور نکال کے لئے کی گئی ہے۔ کیونکہ جب روح انسان میں عبادت خالق کا شوق پیدا ہو جاتا ہے تو پھر رو میں اپنا وہ نظام جو مال و دولت اور دوستوں پر مبنی تھا چھوڑ دیتی ہیں جس طرح چھوٹی پھلیاں اپنی پہلی جگہ ترک کر دیتی ہیں تاکہ اپنے لئے ایک لائق دور کا انتخاب کر سکیں۔ مصیبت کے نتائج ذہن بشر پر اس وقت واضح ہوتے ہیں جب مصیبت کو گزرنے والے زمانہ ہو جاتا ہے، امراض، نقص اعضاء، فقدان ثروت، دوستوں کی موت، ضرورت سے زیادہ مصائب کی وجہ سے مایوسی یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا بھرن فوراً نہیں ہوتا لیکن جب زمانہ گزرتا ہے تو ان حوادث میں چھپی ہوئی طاقتوں کا اظہار ہوتا ہے۔

رشتہ داروں کی موت ابتداً سوائے مصیبت اور محرومیت کے کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن خود ہی دنوں کے بعد ہدایت و ارشاد کا سبب بن جاتی ہے۔ کیونکہ یہ حادثات ہماری زندگی میں انقلابات لاتے ہیں، بچپن اور جوانی جن کو بہر حال ایک دن ختم ہونا ہے ان کو خاتمہ تک پہنچاتے ہیں۔ زندگی اور اس کے کاموں سے مانوسیت کو ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن اسکی جگہ آدمی کے اندر ایک ایسی محبت مردانہ پیدا کر دیتے ہیں جس میں مژدہ کمال کی استعداد نہیں زیادہ ہوتی ہے۔

جو شخص آفتاب کی حرارت کی پرواہ کئے بغیر، اور کسی نگرانی کے بغیر اگر مثلاً شگاب اچھی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کو انجیر کے درخت کی طرح ہو جانا چاہئے جس کو یاغبان نے لاپرواہی کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے اور بے اعتنائی کی وجہ سے یاغی کی دیواریں بھی گر چکی ہوں کہ وہ درخت کتنا قوی اور طاقت ور ہوتا ہے جس کے پھلوں سے لوگ استفادہ کرتے ہیں اور اس کے سایہ میں آکر پناہ لیتے ہیں۔

یقیناً خدا ایسے عالم کو خلق کر سکتا ہے جس میں نہ بد بخمتی ہو نہ رنج و تکلیف لیکن اگر ایسا عالم پیدا کر کے انسان سے اسکی قدرت و آزادی و اختیار کو سلب کرے اور دیگر موجودات کی طرح اس کو بھی اس کائنات و وسیع کے اندر بے ارادہ و اختیار، بے شعور موجود بنا دیتا جو فطرت کے تحت تاثیر کوئی شکل و صورت اختیار کر لینا تو کیا ایسے موجود کو انسان کہنا مناسب ہوتا؟ کیا انسان اپنی تمام استعداد کو کو اور گران بہا ترین سرمایہ دیکر — یعنی حریت و آزادی — اپنا کمال حاصل کر لیتا؟ اور کیا اس کا انجام انحطاط و سقوط کی صورت میں ظاہر نہ ہوتا؟ اور کیا کائنات سے اس کی خیر و زیبائی — یعنی ہر ایک کی اس کے عہد سے تشخیص نہ ہو جاتی؟ وہ خدا کو جو حکیم ہے اور جسکی حکمت پورے موجودات پر حاکم ہے اس نے یہ چاہا کہ خود کی تجدید و انقاس سے اور انسان کو حریت و اختیار — یہ اسکی ایسی نعمت ہے کہ جس کی قیمت لگا ہی نہیں جاسکتی — دیکر اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرے۔

انسان کے اندر اس نے اچھائی و برائی کی قدرت عطا کی۔ اور کسی بھی خبی — اچھائی یا برائی — پر مجبور کئے بغیر انسان سے ہمیشہ خیر کا منتظر رہا۔ کیونکہ شر اور فحش کو اس نے کبھی پسند نہیں کیا۔ ہاں اس نے فعل حسنِ جمیل کو ہمیشہ پسند کیا ہے اور اس کے فعل اور ترکِ بند

پرانا اجر معین کیا ہے جس کا شمار بھی ممکن نہیں ہے۔ اور بد طبیعتی اور جان بوجھ کر شر کرنے سے روکا ہے اور عذاب الیم سے ڈرایا ہے۔ اب یہ انسان کے اختیار کی چیز ہے کہ جی چاہے تو اس کی ہدایتوں پر اپنے ارادہ و اختیار سے عمل کر کے جہنم کو پہنچے یا اس کی ہدایت کی مخالفت کر کے جہنم سے بچے۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ جہارت و نور کی طرف پھٹنے کا راستہ کھلا رکھا ہے کہ اگر کبھی انسان سے لغزش ہو جائے تو دوبارہ خدا کے دامن لطف و رحمت میں پناہ لے سکتا ہے۔ یہ خدا کا بہت بڑا لطف و عدل اور عظیم رحمت ہے۔

نیک عمل کر نیوالے کو اگر خدا فوری جزا دیدے تو غیر صالح عمل اور بد سیرتی پر کوئی نصیحت نہ ہوگی جس طرح کہ اگر برے کام پر فوراً سزا دیدے تو فضیلت کو رذالت پر اور طہارت کو نجاست پر کوئی فضیلت نہ ہوگی۔

کائنات کی بنیاد خدا پر ہے اور مادہ کی بھی تحول پذیری والی صفت کے باعث فیض خدا دنیا میں جاری و ساری رہا ہے۔ اگر مادہ کائنات دیگر موجودات سے مل کر مختلف صورتیں اختیار نہ کرتا اور جدید صورت اختیار کرنے کی اس میں صلاحیت نہ ہوتی تو اس کائنات میں کبھی بھی نوع اور نسل کا وجود نہ پایا جاتا۔ متغیر ذرات کائنات، جامد سرمایہ کی طرح ہے جس سے کوئی سود حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ اصل گردش سرمایہ ہی سود و منافع کا سبب بنتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی خاص سرمایہ اپنے جریان میں نقصان دہ ہو۔ لیکن کائنات کے تمام مادے دنیا کے سرمایوں کی طرح ہیں جو یقیناً گردش سے سود آور ہوتے ہیں۔

مادہ کی صورتوں میں تضاد بھی قائم و محسوس ہے کیونکہ یہی چیز ہستی کو کمال کی طرف سے جاتی ہے۔ یہ بات تو ہم اس وقت کہہ رہے ہیں جبکہ لفظ شر کو دنیا میں جس طرح استعمال ہوتا ہے اسی معنی میں استعمال کریں۔ لیکن اگر غور و خوض کیا جائے تو یہ جمل جائے گا شر یعنی بدی یہ حقیقی صفت نہیں ہے بلکہ یہ بدی کے معنی اضافی ہیں۔ مثلاً اگر اگلنے والے اسلحے اگر دشمن کے ہاتھ میں ہوں تو ہمارے لئے شریں، لیکن اگر ہمارے ہاتھ میں ہوں تو خیر ہیں

شرعیہ میں اور اگر نہ ہم چوں نہ ہمارا دشمن تو یہ اس کے نہ اپنے ہیں نہ برے ہیں۔
 اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ کائنات کا نظام ایک مستقل بر ریاختی ہے اور دنیا کا ستم
 بنانے والے نے کچھ اس طرح بنایا ہے کہ ہماری خواہشات کا پوری ہونا ضروری نہیں ہے حالانکہ
 ہم چاہتے ہیں کہ ہماری لامحدود خواہشات بغیر کسی مزاہمت اور نفع کے پوری ہو جائیں لیکن طبعی دلائل
 ہمارے خواہشات کو پوری کرنے کے جوابدہ نہیں ہیں اور خواہشات بھی ایسے ہیں کہ جو بہت قلیل
 نہیں ہیں۔ لیکن جب ہماری خواہشیں پوری نہیں ہوتیں تو ہمارے لئے بے چارہ رنج کا سبب بنتی
 ہیں اور ہم اپنے عوامل ناراحتی کو شر سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ تعبیر ہم اس وجہ سے کرتے ہیں کہ
 شئون ہستی سے آگاہی نہیں رکھتے اور خود اپنے اندرونی اور بیرونی عوامل سے ناواقف ہیں۔
 اگر کسی کو معلوم ہو کہ چراغ میں تیل نہیں ہے اور چراغ جلانے اور وہ نہ بجے تو بجانے والا
 آہ و زاری نہیں کرے گا۔ زمین و آسمان کو گایاں نہیں دے گا۔

کائنات اپنی سعی مسلسل کے ساتھ شخص ہدف کی طرف سیر و حرکت کر رہی ہے اور اپنے بہت
 و عمل میں قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی ہے۔ انسانوں کی خواہشات اور اس کی ہوس کا کائنات کو اپنے
 پروگرام سے نہیں روک سکتی۔

اس لئے ہم کو یہ قبول کر لینا چاہئے کہ اس کائنات کے کچھ جزئیات ہماری خواہشوں کے
 مطابق نہیں ہیں اس لئے اپنے رنج و غم کو دنیا میں ظلم و ستم سے تعبیر نہیں کرنا چاہئے اور نہ نفسی
 ہی ماسے بے حد قہی سمجھنا چاہئے۔

ایک دانشمند کہتا ہے طبیعت زیادہ روی اور اسراف کو نہیں جانتی، طبیعت ہمیشہ
 راستگو اور بزرگ ہے۔ اس کے عمل میں نہ کوئی لغزش ہوتی ہے نہ خطا، جو کچھ غلطی اور
 لغزش ہوتی ہے وہ صرف ہماری وجہ سے طبیعت مجبور و ضعف سے جنگ کرتی ہے اور اپنے
 اسرار و رموز سوائے خود مند، پاک اور متقی کے کسی دوسرے پر نہیں کھولتی۔

حضرت علیؑ دنیا کی مذمت فرماتے ہیں لیکن جو لوگ دنیا کو خوب پہچان چکے ہیں ان کے لئے

دنیا کو اچھی جگہ فرماتے ہیں۔ اور آپ خود اگر چشہ داندہ و آلام سے پوری زندگی دوچار رہے ہیں تو گویا ہمیشہ خدا کی عدالت مطلقہ کی یاد دلاتے رہتے تھے۔

ایک اور حساس نکتہ کی طرف ہم کو توجہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ خوبی و بدی نفیام ہستی میں دو ایسی چیزیں ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ایک مستقل ردہ کو تشکیل دیتی ہے۔ بلکہ خوبیاں عین ہستی اور برائیاں عین ہستی ہیں۔ جہاں سے وجود پیدا ہوتے ہیں وہاں عدم بھی صدق کرتا ہے۔ فقر و ناداری، جہل و بیماری یہ چیزیں الگ الگ مستقل وجود نہیں رکھتی ہیں بلکہ فقر و ناداری ثروت اور نادانی عدم علم سے اور بیماریاں تندرستی کا نام ہے۔

البتہ علم ایک واقعیت و کمال رکھتا ہے۔ فقر کا مطلب۔ جیسا کہ گزرا۔ وہی مال و مال دینے والا اور جیب کا خالی ہونا ہے۔ پس نہ تو جہل واقعیت ملموس رکھتا ہے اور نہ ہی فقر ایک امر حقیقی کے سوا کچھ ہے۔

جسم، آفتوں، درندوں، معینوں کو بڑا اور ناہنجاریوں کا حشر و سحر سمجھتے ہیں تو ایک قسم کا فقدان و نیستی درمیان میں ہوتا ہے کیونکہ ان کے براہ ہونے کی وجہ دوسرے موجود میں مشا نیستی و نابودی کا ہونا ہے ورنہ ہر موجود اس ہی فلسفے کے دائرے میں ہستی ہے کسی بھی طرح اس کو نازیبا نہیں کہہ سکتے۔ اگر یہ چیزیں اپنے ساتھ بیماری و موت کو نہ رکھتیں اور سب اطفال و فقدان ایک رشتہ ہستی نہ ہوتیں یا رشد و استعداد کی پرورش سے مانع نہ ہوتیں تو ہری بھی نہ ہوتیں۔ جو چیز ذاتی طور سے بری ہے وہ وہ تلفات اور ضایعات میں جو ان کی وجہ سے ناشی ہوتے ہیں۔

پس دنیا میں جو بھی موجود ہے وہ خوبی ہے اور بدی از قسم نیستی و عدم ہے اور عدم وجود کی قسم نہیں ہے لہذا شر بھی وجود کی قسم سے نہیں ہے۔

وجود و عدم بمنزلہ سورج اور اس کے سایہ کی طرح سورج کسی جسم پر پڑتا ہے تو

اس جسم کا سایہ پڑتا ہے لیکن خود سایہ کیا ہے؟ اس کا خود کوئی ذاتی وجود نہیں ہے۔ اس کے موجود نہ ہونے کی علت سوائے سورج کے نہ چلنے اور اس کا اس پر نہ پڑنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ورنہ یہ خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔

تمام چیزوں سے چونکہ خلق کا تعلق ہوا ہے لہذا ان کا وجود خود ان کے لئے وجود ہے۔ اور ان کا وجود واقعی وجود ہے اور اس لحاظ سے یہ چیزیں شر نہیں ہیں۔ بلکہ فلسفہ الہی کے اندر وجود خیر و احسان کا مساوی ہے۔ ہر شے اپنے وجود میں خیر ہے۔ اور اپنے لئے خیر ہے۔ اور اگر یہ شر ہے تو اپنے لئے شر ہے۔ اپنے وجود اضافی کے لحاظ سے دوسری چیزوں کی نسبت سے شر ہے۔ اور وجود اضافی حقیقی وجود نہیں ہے بلکہ یہ وجود اعتباری ہے جس کے وجود بالذات متعلق نہیں ہوا ہے۔ پیرا کے پھرئی نفس اپنے لئے شر نہیں ہیں ان کو برا اور شر اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور اس کی موت و ہلاکت کا سبب بنتے ہیں اور جس کے وجود کا تعلق ہوتا ہے وہ وجود الہی نفس ہے اور وجود واقعی ہے۔ لیکن جن چیزوں کا وجود اعتباری ہے وہ چونکہ نظام ہستی میں مستقر نہیں ہیں اور واقعی و حقیقی نہیں ہیں اس لئے ان کے بارے میں یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ: خدا نے وجود ہائے اضافی و اعتباری کو کیوں پیدا کیا؟ کیونکہ امور اعتباری و انتزاعی اپنے ملزومات سے جدا ہو ہی نہیں سکتے۔ اور ان کا شمار امور حقیقی کے لوازم تہری میں ہوتا ہے اور خود یہ امور وجود سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اس لئے ان کی خلقت کے بارے میں بحث بھی نہیں کی جاسکتی۔

موجود واقعی کو خدا ایجاد کرتا ہے اور موجود واقعی اور اس کے صفات بھی حقیقی ہیں کیونکہ ان کا وجود خارج میں بھی ہے۔ ذہنی وجود سے قطع نظر کر کے۔ لیکن صفت نفسی و اضافی چونکہ ہمارے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے اس کے ذہن کے علاوہ خارج میں اس کا وجود نہیں ہوتا۔ لہذا اس کے بارے میں یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا خالق کون ہے؟ کائنات کا مطلب ان چیزوں کے علاوہ جن کا وجود امکان پذیر ہے۔ تمام وہ چیزیں ہیں

جو اپنے اوصاف و لوازم غیر تفکیک کے ساتھ ہیں۔ جو بذات خود ایک ایسا واحد ہے جو تجزیہ ناپذیر ہے۔ اور جو چیز حکمت الہی کے متقنی کے مطابق ہے۔ وہ یہ ہے کہ یا تو کائنات کا وجود ایک شخص نظام کے تحت ہو یا پھر اس کا وجود ہی نہ ہو۔

وہ کائنات جو بے نظام ہو یا اس میں اصول علت و معلول مفقود ہوں یا اس میں خیرات کی ضرورت برائیوں سے جدائی ہو۔ ایسی کائنات غیر ممکن ہے اور یہ صرف خیال محال ہے۔ کیونکہ یہ بات محل بحث سے خارج ہے کہ نظام کے ایک جزو سے بحث و کلام متعلق ہو اور دوسرے جزو سے نہ ہو! مجموعہ آفرینش اسی طرح ایک ہے جس طرح ایک انسان کا پیکر اور اس کے اجزاء ایک حکم میں ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے قابل انفکاک نہیں ہوتے۔

پروردگار غنی علی الاطلاق ہے جس کا لازمہ ایجاد اور مخلوق پر فیضان کرنا ہے جیسے کہ ایک بچی بخشش کرتا رہتا ہے جس کے بدلہ میں کوئی جزا یا شکریہ بھی نہیں چاہتا۔ یا جیسے ایک ماہر فن کار ہوتا ہے جو ہمیشہ کسی توقع کے بغیر اپنے فن پارہ کی تخلیق میں مشغول رہتا ہے۔ لہذا خلق و ایجاد پروردگار عالم کے اوصاف ذاتی ہیں۔

نابرابری

فرض کیجئے ایک کارخانہ کے مالک نے کارخانہ چلانے اور اس سے کسب معاش کے لئے کچھ توہمیر — مزدور — اور کچھ ماہرین ملائے رکھے۔ اور جب تنخواہ دینے کا وقت آیا تو اس نے بیروں کو تو کم تنخواہ دی اور جو فن کار اور ماہر تھے ان کو زیادہ دی تو یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے: کیا کارخانہ کے مالک نے اس طرح تنخواہ تقسیم کر کے مزدوروں پر ظلم کیا یا نہیں؟ ظاہر سی بات ہے اس قسم کا تفرقہ کرنا فیئر و جسٹ نہیں ہے۔ یہاں پر عدالت کا مقصد مرکز یہ نہیں ہے کہ ماہرین اور مزدوروں کو برابر برابر تنخواہ دی جائے۔ بلکہ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے استحقاق کے لحاظ سے تنخواہ دی جائے۔ اور اسی طریقہ کار سے کارخانہ ترقی کر سکے، ورنہ ترقی کرنا ممکن نہیں ہے! اور اسی قسم کے مواقع پر تفریق عین عدالت ہے اور مساوات ظلم ہے۔

اسی طرح اگر ہم کائنات کو منظر دقیق مطالعہ کریں اور اس کے تمام اطراف و جوانب کو بدقت نظر مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ اس کے ہر جز کی ایک خاص وضع ہے اور خاص مقام ہے اور پھر تحقیق عین کے بعد ہم خود ہی احساس کریں گے کہ اس کائنات رنگ و بوسے نور کے ساتھ تاریکی، ظفر و کامیابی کے ساتھ ناکامیابی توازن عام کے لئے ضروری ہے۔ اور جب تک یہ صورت نہیں ہوگی نظام عام کا تحقق نہیں ہو سکتا۔

اگر کہیں ایسا ہوتا کہ جہاں تفاوت و اختلاف سے خالی ہوتا تو اس میں تنوع اور کثرت موجودات کا اثر بھی نہ ہوتا۔ حالانکہ عالم کی عظمت اسی اختلاف اور تنوع ہی کے اندر ہے۔ جب تک ہم توازن مجموعہ اور اس کے متقابل رابطہ کو جو تکامل بخشش اور منفعت خیز ہے اپنی نظریں نہ رکھیں اس وقت تک ہمارا فیصلہ صحیح و منطقی اور موجب وقابل قبول نہ ہوگا۔ صرف

ایک پیکر کے ایک جزئی کو جو ایک مجموعے سے جدا ہوا ہو دیکھ کر صحیح فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔
 نظام آفرینش تو اذن اور استحقاق و قابلیت کی بنیاد پر رکھا گیا ہے اور اس نظام ہستی
 میں جو چیز متعلق و ثابت ہے وہ تفاوت ہے نہ تبیض۔ اور اس ترتیب سے مسئلہ یعنی تراویح و شکی
 تر ہو جائیگا کیونکہ تبیض کا مطلب "مساوی استحقاق اور یکساں شرائط کے مواقع پر فرق کیا جائے"
 اور تفاوت کا مطلب غیر مساوی اور غیر یکساں شرائط میں فرق قرار دینا ہے۔

یہ خیال بالکل غلط و فاسد ہے کہ کہا جائے: اگر دنیا میں تمام چیزیں یکساں ہوتیں اور ہر قسم
 کے اختلاف و تفاوت سے دور ہوتیں تو بہت اچھا تھا؛ کیونکہ حرکت، تکامل، جوش، اخلاقی
 عطا، گرفت وغیرہ سب کے سب تفاوت ہی کے زیر سایہ متجلی ہوا کرتی ہیں۔

ہم جس قدر حسن و جمال کا ادراک کر رہے ہیں یہ ناممکن ہو جاتا اگر اس کے مقابل میں قبح و بد
 صورتی نہ ہوتی۔ اسی طرح اگر زندگی میں قریب، بدکاری وغیرہ نہ ہوتی تو فضیلت و تقویٰ کی
 اہمیت نہ ہوتی۔ اور ضبط نفس و تہذیب نفس لفظ بے معنی بنکر رہ جاتے۔ اسی طرح اگر فنکار
 صرف ایک ہی رنگ اپنے فن پاروں میں دیتا تو پھر اسکی قد و قیمت نہ ہوتی۔ فنکار کی مہارت
 کا اظہار ہی لون و رنگ کے تنوع پر ہوا کرتا ہے۔

کسی بھی چیز کے تشخیص کے لئے اس کا دوسری چیزوں سے مختلف ہونا ضروری ہے۔
 کیونکہ اشیاء اور خود انسانوں کی معرفت ظاہری یا باطنی اختلاف ہی کی بنا پر ہوا کرتی ہے۔

•
 خلقت کے دلچسپ ترین باتوں میں مواہب زندگی اور استعداد میں اختلاف کا پایا
 جاتا ہے۔ نظام خلقت نے معاشرہ کے افراد کو ایک مخصوص ذوق دیا ہے جو حیات اجتماعی
 کے استمرار کے لئے مناسب ہے۔ معاشرہ کی ہر فرد ایک ایک حاجت کو پوری کرتی ہے اور ایک ایک
 مشکل کا حل نکالتی ہے۔

افراد کی طاقتوں میں فطری تفاوت سب کو سب کا محتاج بنا دیتا ہے۔ اور ہر شخص اپنی

استعداد اور اپنے ذوق کے مطابق معاشرہ کے کاموں میں مصروف ہے۔ اور یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ انسان کی ترقی اور اس کا تکامل صرف اجتماعی زندگی کے سایہ ہی میں ممکن ہو سکتا ہے۔ بطور مثال ہوائی جہاز کو لے لیجئے جس میں بچیدہ آلات بکثرت ہیں اور بڑی باریک بینی سے اسکو ایجاد کیا گیا ہے اس ہوائی جہاز کے اجزا باہم حجم و شکل کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں اور یہ اختلاف اس ہوائی جہاز کے اجزا کے سپرد مختلف اعمال کی وجہ سے ہے اگر ہوائی جہاز کے آلات و اجزاء میں یہ اختلاف نہ ہو تو وہ اڑ ہی نہیں سکتا اور پھر یہ ہوائی جہاز نہ ہوتا بلکہ مختلف دہاتوں کا بنا ہوا ایک ڈھانچہ ہوتا اور بس۔

پس اگر ہوائی جہاز کے اندر اختلاف عدل ہے ظلم نہیں ہے تو اس دنیا کے موجودات میں اختلاف خواہ انسانی ہو یا کچھ اور وہ بھی عدل باری کے مطابق ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیجئے کہ نظام وجود کے موجودات میں جو تفاوت ہے وہ ان کا ذاتی ہے۔ کیونکہ خدا ہر شے کو الگ الگ متعل و منفرد ارادہ سے بنیں خلق کرتا بلکہ پورا عالم ازل سے سیکرا پر تک۔ ایک ارادہ سے پیدا کیا گیا ہے پس جب خدا نے موجودات پر فیض وجود کیا تو اسی فیضان نے غیر متماہی اشیاء کو ایک ارادہ سے عرصہ کائنات میں ظاہر کر دیا۔ اس نظریہ کی بنیاد پر موجودات کی آفرینش کے لئے ایک شخص نظام و قانون ہے جو موجودات کے تمام ابعاد و وجود پر سایہ نکلن ہے اور کارگاہ نظام علت و معلول میں ہر چیز کا ایک مقام و معین جگہ ہے۔ آفرینش اشیاء اور تدبیر جہاں کے سلسلہ میں ارادہ الہی عین ارادہ نظام سے تعین فرماتا ہے۔ قاطع اس نظریہ کو ثابت کرتے ہیں۔ اور قرآن مجید بھی اس واقعیت کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ مَّا مَرَّاهَا مَوْزَانًا الزَّادِجِدَةِ كُلِّجٍ بِالْبَصْرِ (الفرقان)

ہر شے ہم نے ہر چیز ایک مقرر انداز سے پیدا کی ہے اور ہمارا حکم تو بس آنکھ کے چمکنے کی طرح ایک بات ہوتی ہے۔

دستگاہ الہی کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ یہ معاشرہ کے دستگاہ و روابط قرار داد کے

ماند ہے بالکل غلط تصور ہے۔ کیونکہ موجودات کا علاقہ اپنے خالق سے حادث و وضعی علاقہ نہیں ہے بلکہ یہ ایکاد و خلق کر نیکا علاقہ ہے اور تخلیق کے سلسلہ میں امر الہی امر تکوینی حقیقی ہے اور ہر موجود حقیقی ذیلی و کمال کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خدا کی طرف سے اتنا عطا ہوتا ہے۔

اگر موجودات عالم کے لئے کوئی معین نظام نہ ہوتا تو ہر موجود کے امکان میں یہ بات تھی کہ اس سے ہر شئی صادر ہو۔ اور معلول علت کی جگہ لے لیتی۔ لیکن ہم کو بطور حتم و جزم موجودات کے درمیان روابط ذاتی کا ادراک کرنا چاہئے اور یہ ادراک کرنا چاہئے کہ اس کے لوازم ذاتی وجود کے کس رتبہ میں ہیں۔ اور کس خصوصیت پر تھے۔ کسی بھی حادث کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے مخصوص رتبہ سے تجاوز کر جائے اور دوسرے موجود کے رتبہ میں مشغول ہو جائے۔ اور تعاقبات و اختلاف مراتب ہستی کا لازمہ ہے جو ان کے درمیان شدت و ضعف، نقص و کمال کے لحاظ سے مکمل فرما ہے۔

خلاف حق تمیزان دو چیزوں میں تحقق پذیر ہو سکتی ہے جبکہ دونوں میں ایک مخصوص درجہ کمال کے قبول کرنے کی صلاحیت ہو مگر اضافہ کمال ایک پر ہو اور ایک پر نہ ہو۔

نظام ہستی میں مراتب موجودات کو انسانی معاشرہ میں مراتب اعتباری سے تشبیہ دینا بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ مراتب موجودات امور واقعہ ہیں جو قابل انتقال نہیں ہیں مثلاً یون کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے وجود کو انسان کے رتبہ میں کر لے جس طرح ہمارے لئے ممکن ہے کہ ہم اشخاص کو ان کے مقامات و سائبے منتقل کر کے دوسرے مراتب و مقامات پر منتقل کر دیں۔

اندر اسکی وجہ یہ ہے کہ علت کا تعلق جو معلول سے ہوتا ہے یا معلول کا علت ہے وہ

ذات علت و معلول سے پیدا ہوتا ہے اب اگر کوئی شئی علت ہے تو کسی ایسی خصوصیت کی بنا پر ہوگی جو اس ذات سے منفک ہی نہ ہو سکتی ہو۔ اور معلول بھی کسی خاص وجہ سے

معلول ہوتا ہے جو اسکی ذات میں پوشیدہ ہوتی ہے اور یہ خصوصیت مولئے اسی کیفیت و جو کے اور کچھ نہیں ہے۔

اس بنا پر تمام موجودات ہستی کے اندر ایک عقیق و ذاتی نظام موجود ہے اور ہر مرتبہ وجود یہ اس موجود کا معین ہے اور جب تک تفاوت و اختلاف قصور ذاتی تک محدود ہو کر تبعیض نہیں کہتے۔ کیونکہ کسی بھی امر کے تحقق کے لئے صرف فیض خدا کا فی نہیں ہو کرنا بلکہ اسکی ایک بنیادی شرط متعلق میں قابلیت کا ہونا بھی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض موجودات جس مرتبہ پر ہیں اس سے بلند تر درجہ تک نہیں پہنچ سکتے لیکن یہ بات بہر حال محال ہے کہ کوئی موجود قابلیت یا دوسرے کمال کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن خدا اس کمال یا وجود کو درک دے۔

اس کی مثال اعداد و جیسی ہے کہ ہر عدد مخصوص جگہ رکھتا ہے۔ دو کا وجود ہمیشہ ایک کے بعد ہی ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ اسکی جگہ بدل دی جائے اور دو کو ایک کے پہلے قرار دیا جائے۔ اور اگر ہم ایک عدد کی جگہ دوسٹر کے بعد بدلنا چاہیں تو درحقیقت وہ عدد معدوم ہو جائیگا۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ تمام حوادث کے لئے معین اسلوب ہیں اور یہ ایک ایسے قوانین کے محکوم ہیں جو ثابت ہیں اور غیر متغیر ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ آفرینش کے لئے خدا نے کوئی مخصوص قوانین وضع کر دیے ہیں بلکہ یہ وہی قوانین ہیں جو ہمارے ذہنوں میں مفہوم ہیں اور جو موجودات کے کیفیت واقعی سے منترع ہوتے ہیں۔ کیفیت واقعی سے مراد وجود کے مراتب و درجات اور نظام علت و معلول ہے اور وہ شئی مراد ہے کہ امور اس نظام کے باہر نہیں جریاں پیدا کر سکتے اور یہی سنت اللہ ہے۔ قرآن نے کہا ہے:-

وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلنَّاسِ عَلَى النَّاسِ مَقَرًّا

(نملہ ۲۳)

پس نتیجہ یہ تھا کہ قوانین ذاتیہ کا ایک سلسلہ ہے جس پر نظام ہستی کی بنیاد رکھی گئی ہے جس میں ہر موجود کی جگہ اور موقعیت مشخص ہے اور ہستی کے لئے وجود و درجات و مراتب گونا گوں و نظام وجود کے بقا کے لوازم میں سے ہے۔ اور یہ قہری طور پر موجودات کے

درمیان تفاوت و اختلاف کے ظہور کا موجب ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اختلاف و تفاوت بذاتہ مخلوق نہیں ہیں بلکہ حادثات کے لوازم میں سے ہیں۔ اور اس دنیا کے ہر جزائے جس جگہ کے لائق تھا وہ اس نے لے لیا اور اس مجبور وجود کے کمال کے لئے جو ایک جدول ضرب کی طرح ہے بعض اجزاء کے ساتھ بے عدالتی و تبعیض روا نہیں رکھی گئی۔

یہ شخص مادی عقل رکھتا ہے اور نظام طبیعت میں اختلاف و تفاوت کو مستم و بے عدالتی خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ پوری کائنات پر عدالت کی حکمرانی نہیں ہے۔ اس کے لئے زندگی بڑی تلخ و ناگوار ہے اور اس کا یہ جلد بازی کا فیصلہ اس بچہ کے فیصلہ کی طرح ہے جو موسم بہار میں باغیان کو ہرے بھرے درختوں کی شاخوں کو کاٹتے ہوئے دیکھ کر فوراً فیصلہ کر دیتا ہے کہ یہ باغیان نادان و ویران گر ہے کیونکہ اس کی نظر میں اس کی حکمت نہیں ہے۔

اگر ایسے شخص کے اختیار میں تمام مواب دینا دیشیے جائیں جب بھی یہ راہی نہیں ہوگا کیونکہ اس کی نظر میں دنیا بے مقصد ہے اور آفرینش کی بنیاد سنگمری پر رکھی گئی ہے پھر ان کی خواہش عدالت پھر بے معنی ہے کیونکہ ایک ایسی دنیا میں جو بے مقصد ہو کوئی حقد رکھنا یہودہ ہی بات ہے اگر بقول مادیوں کے انسان کی بازگشت مثل گھاس بھوس کے ہے جو خود بخود کائنات میں اگتی ہے اور پھر فنا ہو جاتی ہے تو ان سے زیادہ ذلیل کوئی مخلوق نہیں ہے کیونکہ وہ ایک ایسے عالم میں رہ رہے جو ان کے مناسب ہے و موافق بلکہ قوت فکر و احساس اس کے لئے پریشانی کی ابتدا ہے اور اس کے ساتھ یہ فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ بدلتی درجہ اس کے لئے اضافہ کرتے ہیں اور باعث زیادتی عذاب بھی ہے۔

اگر ان نثری محنت و محنت سے بشریت کی کوئی خدمت انجام دے اور بڑی مخلصانہ خدمت نوع انسانی کے لئے کرے تو اس کو کیا فائدہ؟ کیونکہ اس کی یاد چاہے خفی احترام و تقدیر سے مٹائی جائے یا اس کی قبر پر کوئی یادگار بنا دی جائے یا اس کے نام پر کچھ مہریم لیا جائے تو اس کو تو قدر برابر بھی فائدہ نہ ملے گا اور ایک پوچھ و پھر افسانے سے زیادہ اس کی خدمت

نہ ہوگی کیونکہ۔ مادی حضرت کی نظر میں۔ حضرت نے ایک پیکر بنایا تھا۔ چند دنوں اس سے بازی کی اور اس کو نچاتی رہی اور پھر دوبارہ اس کو ایک نشت خاک بنادیا۔

اگر ہم بیشتر ایسے لوگوں کے انجام پر غور کریں جنہوں نے بڑے بڑے رنج و غم برداشت کئے ہیں پریشانیوں اور دُردانِ نفسی سے دوچار ہوئے ہیں تو پھر ہمارے سامنے ایک بڑا دردناک اور تکلیف دہ منظر ہوگا۔

انسانوں کا یہ حشر دیکھ کر کیا مادیوں کی جنت عذابِ محم کے علاوہ اور کچھ ہوگی؟

اور انسانیت کی بدنامی اس وقت اوجِ کمال پر پہنچ جاتی ہے جب ہم مادیوں کا یہ نظریہ پڑھتے ہیں کہ انسان تو مجبورِ محض ہے اس کا پاس نہ ارادہ ہے نہ اختیار۔ اس نظریہ کی بنا پر انسان ایک آئوٹینکٹ مشین کی طرح ہے کہ فطرت ازمدی میکانیزم و ڈائنامیزم اس کے خلیا میں بھی عمل کرتی ہے۔ اب بتائیے کیا عقل و فطرت اور حقائقِ حیات انسانیت اور اس کے انجام کی یہ تفسیر قبول کریں گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔

اور اگر قبول کریں تو پھر انسان اس گڑباز سے زیادہ نیک نخت نہیں ہے جو بچوں کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔ آیا انسان کے لئے یہ بہتر نہ ہوگا کہ انسانی و اخلاقی اصول اور ملاءک ازمنش کو صرف شخصی سود و زبایاں اور اپنے جسمی رجحانات سے توجیہ نہ کرے؟ اور امکانی حد تک ہر گناہ کو دور کرے اور پائے ہوئیں سے ہرگز بچ کر کو توڑ کر الگ نہ کر دے؟۔ یقیناً مادی نظریہ سے تو یہ بہتری ہوگا۔ اور اگر اس کے علاوہ عمل کرے تو بے عقل و نادان و پسماندہ نہیں ہے؟ بھلا جو شخص بھی بصیرت و نیشِ صمیم کا دارا ہوگا اور غیر طرفدار ہو کر، اغراض و بہت سے ہٹ کر دقتِ نظر کے ساتھ فیصلہ کے لئے بیٹھے گا وہ اس قسم کی کوتاہ نظری و تخیلِ پیٹے وہ کتنا ہی سطحِ آمیز فلسفی و علمی دلائل سے آراستہ ہو۔ کی ازمنش و اعتبار کا قائل ہوگا؟

نہ مادی ساختہ چیز سے ترکیبِ چیز سے۔

نہ وہ آئین جو عناصرِ مادی میں فقط ناہل بقوہ ہیں۔

لیکن مذہبی اعتبار سے شخص مومن عالم کو ایک نظام خود آگاہ و وادارای ارادہ و احساس و با مقصد سمجھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ وہی حکمت غیظہ اور علولہ تمام ذرات و وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس کے اعمال و افعال کی بھی ناظر ہے۔ لہذا وہ سمجھتا ہے کہ اس حکیم حاکم کے سامنے جو پوری کائنات پر محیط ہے ہم کو جو ابیدہ ہوتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے۔ جہاں انجمن، جہاں وحدت و ہم آہنگی وغیرہ ہے اور تضاد و شرک و وجود ضمنی و تبہی ہے۔

اور دوسری طرف مذہبی نظریہ انسانی حیات کے لئے ایک وسیع افق کا تصور پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ حیات انسانی کا انحصار صرف دنیا ہی میں نہیں ہے اور نہ زندگی دنیا کا مطلب ہے کہ انسان عیش و آرام میں ہر رنج و غم سے دور ہو کر زندگی بسر کرے۔ وہ تو یہ بتاتا ہے کہ دنیا ایک گزر گاہ ہے اور آخرت کی زندگی تک پہنچنے کا ایک پل ہے۔ یہ دنیا تو امتحان، سعی و سلیقہ عمل، پیہم کا ایک میدان ہے جس میں ایمان کی درستگی اور کردار کی درستگی کی آزمائش ہوتی ہے لیکن آخرت کی ابتدائی زندگی ہی میں دقیق ترین میزان موجود ہے جس پر انسان کے افکار و اعمال کا عمل کی اچھائی و برائی تولی جاتی ہے۔ اور وہ بلان پر عدالت الہی کی حقیقی صورت منجلی ہوتی ہے اور دنیا میں مادی و معنوی عقوبت و مانگی اور قسم کی محرومیت کا بہترین طریقہ سے جبران کیا جاتا ہے۔

منابع مادی و دنیوی کی ماہیت کی یہ بد صورتی اور ابتذال دیکھ کر انسان کی آگاہانہ حرکت صرف خدا کی طرف ہوتی ہے۔ اور پھر اس کا پورا وجود و مقصد خدا کے لئے زندہ رہنا اور اسی مزا ہو جاتا ہے۔ اور پھر تو اس کے بعد دنیا کی پستی و بلندی کی اسکی نظریں کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔ تمام امور کو واقعت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ اور کسی بھی جمال سے وابستگی نہیں پیدا ہوتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر اس جمال کے سامنے رنگوں ہو گیا تو یہ جمال اس کے منہ انشت کے سوتوں کو خشک کر دے گا اور اس کو حسیں گمراہی کے کنویں میں ڈھکیل دے گا۔

ایک دوسری بات بھی سمجھ لیجئے کہ اگر مسند استغناء و معطر ہے نہیں ہے تو تفاوت و اختلاف

کی وجہ سے کوئی ظلم متحقق نہیں ہوگا۔ کیونکہ ظلم کا متحقق اس صورت میں ہوا کرتا ہے جب کسی کے لئے تبعیض ہو رہی ہو حالانکہ وہ استحقاق میں برابر ہے۔ لیکن موجودات عالم کبھی بھی خدا پر کوئی حق نہیں رکھتے اور نہ کسی دن کسی چیز کے مستحق تھے اگر ایسا ہوتا تو بعض کو بعض پر برتری دینے میں ظلم ہوتا۔

ہم تو اپنے نفس کے کسی بھی چیز کے مالک نہیں ہیں، ہماری سانس کی آمد و رفت، دل کی دھڑکنیں، غور و فکر ایک ایسے سرمایہ سے حاصل ہوتے ہیں جس کے ہم مالک نہیں ہیں اور اس کے ہیکر کرنے میں کوئی ذمت نہیں کی ہے اور وہ سرمایہ پروردگار عالم کا وہ ہدیہ ہے جو اس نے ابتداء و لاوت سے ہم کو بخشا ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہمارے پاس جو بھی ہے وہ سب عطیہ اللہ ہے تو ایسے مقام پر تفاوت جو پائیدار حکمت پر ہے نہ ظلم ہے نہ عدل ہے کیونکہ اس کے پچھ کوئی استحقاق ہی نہیں تھا۔ یہ محدود و موقت زندگی فنا کی طرف سے ایک عطیہ ہے وہ اس ہدیہ کے میزان اور نوز کو معین کرنے میں کاملاً اختیار رکھتا ہے اور آزاد ہے۔ ہمارا اس پر کوئی حق نہیں ہے لہذا ہم کو حق اعتراض بھی نہیں ہے چاہے وہ معفت دیا ہو یا عطیہ کتنا ہی تھوڑا اور مختصر ہو۔

مسئله جبر و اختیار

اصل موضوع پر ایک نظر

مسئلہ جبر و اختیار ان مسائل میں سے ہے جس نے طبیعت و مشن انسان سے سروکار رکھنے والے مفکرین کی نظر کو اپنی طرف ہمیشہ متوجہ کیا ہے۔ اور یہ مختلف عقائد و نظریات کے، جن ایک معرکہ آثار و مسئلہ ہمیشہ سے بنا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ: کیا انسان اپنے امور و حیات، اور دنیا و دعوٰی میں، اختیار، مقاصد و اہداف میں اپنے سماجی اور اعمال میں آزاد و خود مختار ہے اس کے شخصی ارادہ کے علاوہ ان چیزوں میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہے؟ یا انسان اپنے سلوک و عمل میں مجبور ہے اور کسی بھی عمل کے کرنے اور غم و محکم میں وہ مثل آلہ کے دوسرے عوامل کا محتاج ہے، اور اسکو اس پر عوامل دیگر نے مجبور کر دیا ہے؟

اس مسئلہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ علوم اقتصادى، حقوقى، مذہبى، روحانى اور دیگر وہ تمام علوم جو موضوع انسان سے مربوط ہیں۔ ان سے جتنا فائدہ اٹھایا جائیگا اس قدر اس مسئلہ کے چہرے سے نقاب اتنی ہی اٹھتی چلی جائے گی۔

مسئلہ حریت و اختیار کو موضوع بحث بنانا محض علمی و فلسفہء مباحث میں منحصر نہیں۔ بلکہ عملاً یہ مسئلہ ان لوگوں سے بھی متعلق ہے جو انسانی وظیفہ کو بیان کرتے ہیں اور انسان کے اسی بات کا مسئلہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس وظیفہ کا اجراء کریں، اور لوگوں کو عمل کی دعوٰی دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر حریت و آزادی کے ضمنی طور پر بھی معتقد نہ ہوں گے تو ثواب و عقاب کا مسئلہ بے معنی ہو جائے گا۔

ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں کے نزدیک اس مسئلہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ کیونکہ اسلامی فکر کا بھی تقاضا یہی تھا کہ اس مسئلہ میں بہت ہی دقت نظر سے کام لیا جائے۔

اور توحید کے بعد علماء نے اسی مسئلہ کو مورد توجہ قرار دیا۔ اس کی بنیادی باتوں، گہرے مسائل، مبہم و تاریک نقاط کو روشنی کیا۔ کیونکہ یہ مسئلہ جہاں ایک طرف توحید سے مرتبط ہے وہاں دوسری طرف عدالت اور قدرت الہی سے بھی اس کا رابطہ ہے۔

متکلمین کے — خواہ ماضی کے ہوں یا دور حاضر کے — اس مسئلہ میں دو گروہ ہیں :-

۱۔ ایک گروہ ان کی اعمال کے اندر آزادی کو بالکل تسلیم نہیں کرتا۔ اور اس کا کہنا ہے کہ جو اعمال و مساعی بظاہر ہمارے ارادہ و اختیار کے تحت نظر آتے ہیں اس میں انسان کے ادراک کا نقص اور اس کے سمجھ کی کوتاہی ہے۔

۲۔ دوسرا گروہ کہتا ہے: انسان با اختیار ہے اس گروہ کا کہنا ہے کہ ان اپنے امور و اعمال میں حریت کا ملہ رکھتا ہے اور اس کے ارادہ کی شعاع بہت وسیع ہے نہ اس کا کوئی مانع ہے نہ رادع۔

ایک طرف انسان خود اپنے وجود میں اپنی پیدائش سے پہلے ان عوامل کے پیش نظر جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں جبر کو محسوس کرتا ہے۔ اور اسی طرح جب وہ بعض حوادث حیات سے دوچار ہوتا ہے تب بھی جبر کو محسوس کرتا ہے۔ بلکہ انسان یہاں تک سوچنے لگتا ہے کہ اس کو تو کسی بھی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ کسی قسم کی آزادی حاصل ہے۔ کیونکہ وہ اس زندگی میں جب داخل ہوتا ہے تو اس میں اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اور وہ اس دنیا میں اگر ایک جبری نظام کے ماتحت ہوتا ہے۔ بلکہ وہ دنیا میں ایک ایسے کاغذ کے ورق کی طرح ہوتا ہے جو ہوا کے رحم و کرم پر ہو۔ اور پھر اس دنیا سے نفرت ہونے میں بھی جبر محسوس کرتا ہے۔

اور دوسری طرف بھی انسان بہت سے امور میں اپنی حریت و استقلال کو محسوس کرتا ہے۔ جہاں نہ کوئی جبر ہوتا ہے نہ اکراہ — وہ خشکات اور موانع کا مقابلہ کرتا ہے۔

اپنے سابق تجربات کی روشنی میں اپنے تسلط کو فطرت پر وسیع کر سکتا ہے۔ کسی بھی مسلک آدمی اس واقعیت عمل و عین کا انکار نہیں کر سکتا کہ ہاتھوں اور پاؤں کی حرکت انسان کے اپنے ارادہ کے تابع ہے مگر دل کی وصہ کن اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اسی طرح جگر و پھیپھڑ کے عمل میں تفاوت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

پس انسان اپنے ارادہ و اختیار اور اس کے لغو ذمہ میں جو رمز انسانیت بھی ہے اور اس میں مسکویت بھی۔ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے کچھ اعمال و افعال میں آزاد و خود مختار ہے اور اپنے ارادہ و اختیار کے استعمال میں دور دور تک جبر محسوس نہیں کرتا۔ اور یہی انسان بعض دوسرے مادی اور غریزی امور میں اپنے کو دست بستہ اور مجبور پاتا ہے اور اس کی زندگی میں اس قسم کے مسائل کی کمی نہیں ہے۔

جبر کے قائل حضرات

جبری لوگ انسان کو اپنے اعمال میں مجبور محض سمجھتے ہیں۔ اشعری حضرات — مسلمان جو ابو الحسن اشعری کی رائے کے پابند ہیں — اسی قول کو تسلیم کرتے ہیں تمام آیات و احادیث میں خود و منکر کئے بغیر بعض آیات کے ظاہری معنی کو اپنا مددک و مستند قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ اشیاء کی تاثیر کا انکار کرتے ہیں اور کائنات رنگ و بو میں کسی علت و سبب کے قائل نہیں ہیں ان کے عقیدہ میں تمام حوادث و اسٹریکیٹ بغیر کسی واسطہ کے خدا کے معلول ہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ انسان کے پاس اگرچہ قدرت و ارادہ دونوں ہیں۔ مگر انسانی افعال میں ان دونوں کا کوئی اثر یا دخل نہیں ہے۔ کیونکہ ارادہ و قدرت معلول میں کی علت نہیں ہیں بلکہ موثر وہ حقیقت ارادہ الہی ہے۔ انسان تو اس عمل کو اپنے قصد و ارادہ سے ایک رنگ دے سکتا ہے اور پس۔ اور یہی ارادہ اس عمل کو یا تو عمل صالح یا عمل غیر صالح کی فہرست میں درج کرتا ہے۔ اس بنا پر انسان صرف ایک آلہ و تمہید ہے جس کو قدرت جس طرح چاہتی ہے استعمال کرتی ہے۔

یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہم انسان کو صاحب قدرت و اختیار مان لیں تو خدا کی حکومت و قدرت کا دائرہ محدود و ناتمام پڑے گا۔ حالانکہ خدا کی حاکمیت مطلقہ ہم کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم اس کے مقابلہ میں کسی بھی فرد انسان کے لئے قدرت کے قائل نہ ہو خدا کی حاکمیت مطلقہ اور توحید کا تقاضا یہی ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ تمام حوادث و وجود یہاں تک کہ خود انسان کے اعمال خدا کی مرضی کے بغیر موجود ہو ہی نہیں سکتے۔ اور اگر ہم یہ قائل ہو جائیں کہ انسان اپنے اعمال کا خالق ہے تو گویا ہم نے تمام عالم وجود پر خدا کی حاکمیت مطلقہ

کا انکار کر دیا۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ حریت ارادہ کا عقیدہ مشرک بالشد تک منجر ہوتا ہے۔
یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام حوادث عالم کا ظہور اصل مقدمہ کی بنا پر ہوتا ہے اور یہ مسلسل متعلقات
ایک اصلی اور انتہائی علت تک پہنچتی ہیں اور وہ علت اصلی خدا ہے۔

اور انسان جو اپنے کو بظاہر حر اور آزاد سمجھتا ہے اس کی حیثیت ایک بے ارادہ آدمی
نیا رہ نہیں ہے۔ اور عقل و غرائز و عواطف و احساسات سے سیکر غیر مرئی امواج اور کمیاب و سی
عناصر کے تاثیرات، اور پانی، ہوا، خاک کا اثر، معاشرہ، تربیت، وراثت کے عوامل اور ان کے
علاقہ دوست و عداوت کے سبب انسان کے حدود اختیار سے خارج ہیں۔ اور درحقیقت انسان
بیرونی اور اندرونی عوامل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے جن سے اس کو آزادی ملنی ناممکن ہے۔

کچھ لوگوں نے — دانستہ یا نادانستہ — دین و اخلاق کے خلاف اعمال بجالانے کی وجہ
سے عذر تراشی اور اپنی برادرت کے لئے مسئلہ جبر کو قبول کر کے عقیدہ و عمل میں انحراف کئے
ایک راہ تلاش کی ہے اور اپنے فساد و تباہ کاریوں کے لئے اس مسئلہ کو بطور دستاویز استعمال
کیا ہے۔ کچھ ایسے شعراء بھی گزر رہے ہیں کہ عقیدہ جبر کو قبول کر کے اپنے گناہوں کے لئے جواز
مہیا کر رہے ہیں۔ اور بزم خود و جہان فی فساد اور بدنامی سے پکے گئے ہیں۔

جبر یوں کا یہ طرز فکر عدالت الہی اور عدالت اجتماعی دونوں کے خلاف ہے۔ جبکہ ہم
عدل الہی کو اپنے تمام ابعاد کے ساتھ نظام وجود میں وسیع صورت میں موجود پاتے ہیں
اور خدا کی اسی صفت سے توصیف کرتے ہیں چنانچہ قرآن کہتا ہے :-

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ذَا الْوَلَدِ الْأَعْلَمُ يُظَاهِرُ
بِالْقَبْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (ان عین ۱۸)

خدا نے خود اس بات کی شہادت دے رکھی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور تمام
فرشتوں نے اور صاحبان علم و انبیاء و ائمہ جو عدل پر قائم ہیں وہی شہادت دے

کو اس زبردست حکمت و اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی (ہر چیز پر)

غالب اور دانا ہے۔

اسی طرح خدا نے استقرارِ عدل کو ان فی معاشرہ میں بقتِ رسل اور سالِ کتب کی غایت قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحمدہ / ۶۴)

ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح اور روشن معجزے دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ساتھ کتاب اور (انصاف کی) ترازو نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

اسی طرح قیامت کے دن خدا اپنے بندوں کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

وَنُفِخُ الصُّورَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَلَا تُفْلَمُ كَفْسٌ شَيْئًا (نملہ / ۲۷)

اور قیامت کے دن تو ہم (بندوں کے بھلے برے اعمال تو لٹنے کے لئے) انصاف کی ترازو نہیں

ٹھہری کر دیں گے۔ اور پھر تو کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔

خدا سوچنے تو کیا یہ انصاف ہے کہ ہم کسی شخص کو جرم پر مجبور کر کے سزا دیں؟ یقیناً ایسا

کرنا صریحی ظلم ہے اور اصولِ عدالت سے بعید ہے اور اگر ہم اصل آزادی کا انکار کر دیں

اور کسی بھی مثبت نقش کو انسانی ارادہ کے لئے ثابت نہ مانیں تو ان اور دیگر موجودات

میں کوئی فرق ہی باقی نہیں رہے گا۔ جس طرح دیگر موجودات کی دائمی حرکتیں ایک غیر متناہ

سلسلہ عمل کی معلول ہیں۔ عقیدہ جبر کی بنا پر ہمارے اعمال و حرکات بھی اسی عنوان کے

موجو جائیں گے۔

اور اگر خدا ہی انسان کے اختیاری اعمال کا خالق ہے اور وہی ان کے اندر ظلم

و فساد بھی خلق کرتا ہے یہاں تک کہ اپنے ساتھ شرک بھی وہی کرتا ہے تو پھر اس ذاتِ مقدسہ

کی تشریح کیونکر کریں گے ؟

جس کا قول ماننے سے نبوت، وحی، الحام، اوامر، نواہی، احکام شرعیہ، بیانات عقائدیہ، ثواب، عقاب کا لغو ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ جب ہم یہ مایں گے کہ لوگوں کے افعال ان کے ارادوں کے بغیر آئینک طریقے سے ہو جاتے ہیں تو پھر انبیاء و مرسلین کو جو عقول بشر کی مدد کے لئے بھیجا گیا ہے وہ کیا ہے ؟ — جیسا کہ حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ انبیاء و رسل کی بعثت عقول بشر کی مدد کے لئے کی گئی ہے۔

اور جب تک ایف شرعیہ اور دستور آسمانی انسان کے ارادہ و اختیار سے باہر کی چیزیں ہیں تو پھر ان کو مکلف بنانے کی کیا توجیہ ہوگی ؟ اور اسی طرح جب جبری کارفرمے تو انسان کا سلوک جگہ اسکی روحیات جو آئینک طریقے سے انسان سے سرزد ہوتی ہیں، اور معاشرہ و افراد کو فضیلت و اخلاق و غیرہ پر آمادہ کرنے کی ساری کوششیں رائیگاں ہو جائیں گی تو پھر ان کوششوں اور زحماتوں سے کیا حاصل ؟ کیونکہ اس مقصد کی کوشش بے نتیجہ رہے گی اور ایک مجبور سے تربیت و تغیر کا انتظار بھی بیکار ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اخطا و سقوط کے بارے میں خود انسان سکول ہے اور اپنے کو اور دوسروں کو نجات دلانے کا مکلف بھی ہے۔ اور اس کا اختیار ہی اس کے معبر کو مقرر کرتا ہے اور وہ بڑی ہی دقت نظر سے اپنے طریقہ کار کا انتخاب کرتا ہے اور خدا کے لطف و کرم پر بھروسہ کرتا ہے تب خدا اپنی قدرت و نور کے ذریعہ اس کو توفیق بخشتا ہے۔

مشہور فلسفی سینٹ ہیلر — *SAINT HELLER* — کہتا ہے : جس ذات نے ان عوام اور قوانین وجود کو خلق کیا ہے اس نے عظمت و حریت کے لحاظ سے قلب میسیٰ جنیر نہیں خلق کیا ہے۔ یہ قلب — بہت چھوٹا ہونے کے باوجود — تمام طبیعت سے بڑا ہے بلکہ جس نے اپنے نفس کی معرفت حاصل کر لی وہ عالم طبیعت و فطرت کے کسی بھی چیز سے اس کا قیاس نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تعابیر بہت ہی رکیک ہے۔ کیونکہ تمام معنوی کی عظمت کسی بھی

دوسری عظمت سے قابل قیاس نہیں ہے۔

عالم طبیعت کے حوادث سے زیادہ واضح اور روشن خدا کی قدرت ہمارے نفوس کے اندر ہے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں اور اندرونی سسٹم سے ایک دوسرا قیجہ اخذ کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ انسان جب خود باطنی طور سے عقل کی اطاعت یا معصیت کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اپنے اندر یہ احساس بھی پاتا ہے کہ ایک قادر مطلق کے سامنے اپنے کرداروں کی جوابدہی بھی کرنی ہے۔

انسان کے لئے یہ سزاوار ہے کہ جب وہ قانون خداوندی کی مخالفت کرے جس کی عدالت کا اعتراف بھی رکھتا ہے تو اس کے غضب کے ڈرنا ہے۔ اگر انسان خود اپنی خطا پر غضبناک ہے تو اس کو یہ بھی عقیدہ رکھنا چاہئے کہ جس نے قانون بنایا ہے وہ بھی اجتناب کے امکان کے باوجود خطا کر نیو اسے پر غضبناک ہوگا۔

جو شخص اس زندگی میں قانون اخلاق سے لذت محسوس کرتا ہو۔ اسے خود چاہئے کہ اس لذت کا حساب میثاق کرے۔ کیونکہ معاشرہ افراد کا محاسبہ اس لئے نہیں کر سکتا کہ وہ صرف ان گن ہوں پر تعاقب کرتا ہے جو معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہوں۔ اور معاشرہ کے افراد بھی گنہگار کی طرح داوری نہیں کر سکتے کیونکہ انسان کی نیت اور دلوں کے بھید سے نہ معاشرہ واقف ہے نہ افراد معاشرہ لیکن نیت، مقصد یا جو چیز بھی عدالت اجتماعی سے مخفی ہو وہ بہر حال مورد حکم تو ہے اس لئے فرد ہی کو چاہئے کہ میثاق کرے۔

اب یہاں پر دو ہی صورتیں ہیں - ۱۔ قانون اخلاق کی برتری، انسان کی حریت اور مسئولیت کا انکار کر دیں - ۲۔ اس زندگی کے علاوہ ایک دوسری زندگی کو مابین جہاں خدا اپنی عدالت کے مطابق لازمی طور پر فیصلہ کرے گا۔ اور اگر قانون اخلاق اس بات کو تسلیم کرے کہ عالم آخرت میں ایک آخری عدالت کا وجود بہر حال ہے تو اس نے اپنے حدود سے تجاوز نہیں کیا۔

اعترض و جواب

جبری حضرت یہ بھی کہتے ہیں : خدا ازل سے سیکر ابد تک کے سارے

واقع ہونے والے واقعات و حوادث کا خواہ وہ کئی ہوں یا جزئی علم

رکھتا ہے اور یہ بھی متفق علیہ ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی کوئی حادثہ ہو۔ خواہ وہ جزئی ہو یا

کلی۔ اس کا علم خدا کو ازل ہی سے ہے۔ لہذا ان تمام سیئات اور گناہوں کا متعلق افراد سے

معمولی تغیر کے بغیر سرزد ہونا ضروری ہے اور انسان کسی بھی طرح ان کے ترک پر قادر نہیں ہے۔

و رتہ مسلم خدا جن ہو جائیگا۔ بقولے خیام گرسے مخورم علم خدا جہل شود، حرم،

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات یقیناً درست ہے کائنات کے اندر ہونے والے تمام واقعات کا

علم خدا کو پہلے سے ہے۔ لیکن اس علم کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں مجبور ہے کیونکہ

علم خدا علت و معلول کے بنیادی نظام پر قائم ہے حوادث سے اس کا تعلق نہیں اور لوگوں کے اعمال

سبب و سبب دائرے سے خارج نہیں ہیں۔ اور جو علم علت و معلول کے بیماری سے متعلق

ہوتا ہے وہ جبر و کرہ کا موجب نہیں ہو کرتا۔ کیونکہ جو خدا عالم میں آئندہ ہونے والے

جریان سے واقف ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ افراد انسان اپنے ارادہ و اختیار سے اعمال بجا لائیں گے

اور افراد بشر کا اپنے ارادہ و اختیار میں آزاد ہونا سلسلہ اسباب و مسببات اور علل و معلولات کا ایک

جز ہے اور خود انسان نیک و بد عمل کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنے سوا اختیار کی وجہ سے فساد و

گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ اب اگر کسی معاشرہ میں باطل اور ظلم کا دور دورہ ہو جائے تو یہ خود گونا

گونا کی وجہ سے ہوگا۔ اس میں خدا کا ارادہ دخل نہیں ہوگا اور علم بھی بندوں کے فعل خیر یا شر

کے اختیار کرتے ہیں موثر نہیں ہوتا۔

۱) یہ بات صحیح ہے کہ انسان کی آزادی و انتخاب میں احوال محیط، کشش ہائے فطری، اپنی

اپنی بطور عوامل تھوڑا بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے اثر انداز ہونے کا مطلب صرف

ایجاد تھامیل اور راہ کشی ہے۔ اور ارادہ ان کے لئے شوق انگیز ہے۔ لیکن ایجاد جبر و

اکراہ نہیں کرتے اور ان امور کے وجود کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان ان امور کے چنگل میں گرفتار

ہے۔ بلکہ وہ ان تعلیمات کی پیروی یا مخالفت میں اور ان کے محدود کرنے اور تغیر میں کسی کا علم نہ ہے۔ اور خود انسان اپنی بصیرت و روشن بینی سے اس کی ہدایت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ان کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ آدمی کے طبعی جوش و خروش مارتے ہوئے جذبات کے چشموں کو نہ بالکل خشک کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کو بے مہار چھوڑا جاسکتا ہے۔

فرض کیجئے ایک ماہر ٹینک ایک کار کو دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ یہ فنی خرابی کی بنا پر چند کیلو میٹر چلنے کے بعد رک جائے گی۔ اور واقعاً وہ کار چند کیلو میٹر کے بعد رک جائے تو کار کے رکے کا سبب فنی نقص ہے یا ٹینک کا علم؟ یعنی چونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ کار چند کیلو میٹر کا صلہ کرے کے بعد رک جائے گی اس کے اس علم کی وجہ سے کار رک گئی۔ ظاہر ہے کہ جواب یہی ملے گا کہ فنی نقص کی وجہ سے رک گیا ہے۔ ٹینک کا خبر دینا یا اس کا علم سابق اس کی علت ہرگز نہیں ہے اور نہ کوئی عقیدہ ٹینک کے علم سابق کو علت بنا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک مدرس جو اپنے درجہ کے تمام طلباء سے واقف ہے وہ ایک طالب علم کے بارے میں جانتا ہے کہ پڑھتا نہیں ہے۔ کام چھوڑ ہے، کامل ہے سالانہ امتحان میں فیل ہو جائیگا۔ جب سالانہ امتحان کا نتیجہ آیا تو وہ طالب علم فیل تھا تو کیا اس کے فیل ہونے کی علت استاد کا علم تھا یا اس کا نہ پڑھنا محنت نہ کرنا تھا؟ ظاہر ہے علم مدرس کو علت نہیں کہا جاسکتا اس کی علت تو صرف طالب علم کی کاہلی اور نہ پڑھنا ہے۔ اسی طرح اگر خدا بندوں کے افعال کو جانتا ہے تو اس کا علم افعال عباد کی علت نہیں ہے۔ اور اتنی بات اس موضوع کے لئے کافی ہے۔

عقیدہ جبر کا معاشرہ پر ایک منحوس اثر یہ بھی ہوا ہے کہ اس عقیدہ نے سرکش و ظالم لوگوں کو مظلوموں پر ظلم کرنے کا جواز پیش کر دیا ہے اور مظلوموں کے ہاتھوں کو اپنا دفاع کرنے سے بھی روک دیا ہے!

مسند جبر کو بہانہ بنا کر ظالم اپنے بے رحمانہ اور ظالمانہ افعال کی مسؤلیت سے اپنے کو بے

کچھ بڑی کرپا ہے کہ ظلم میں نے نہیں کیا یہ تو خدا نے کیا ہے وہ اپنے ہاتھ کو خدا کا ہاتھ اور اپنے ظلم کو خدا کی طرف نسبت دیتا ہے کہ میں ہرگز ہرگز سزاوارفین و اعتراض نہیں ہوں یہ سب خدا نے کیا ہے۔ اور مظلوم کو ظالم کا ظلم برداشت ہی کرنا پڑیگا کیونکہ ظلم و بیدادگری کا مقابلہ کیا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ جس نے اس پر ظلم کیا ہے۔ یعنی خدا۔ وہ مظلوم کو مل نہیں سکتا کہ اس سے انتقام لے لہذا، ظلم کو خاموشی سے برداشت کرے۔

البتہ مکتبہ مادی کے پیروکار اس مسئلہ سے جس قدر اختیار۔ میں فکری تناقض کے اندر مبتلا ہیں۔ یہ لوگ ایک طرف تو انسان کو موجود مادی مانتے ہیں اور تعلقات ذہنیاتی کا محکم مانتے ہیں۔ یعنی انسان عوامل محیط و جبر تارنخ اور پہلے سے معین شدہ اوضاع کے سامنے ایک غیر موثر عامل ہے اور فاقد الحریۃ ہے اپنے اعمال کے اختیار کیا بلکہ اپنے انکار و نفع حیات میں بھی مقہور طبیعت و فطرت ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے: کوئی بھی حرکت و تطور یا اجتماعی اقتدار ہو وہ محیط و ماحول کے اوضاع مادیہ کا طبعی نتیجہ ہوا کرتا ہے اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا کیونکہ انسان کا۔ کوئی ذاتی ارادہ نہیں ہے۔ ارادہ معاشرہ و ماحول کے اقتصادی و مادی اوضاع کا تابع ہوتا ہے، بلکہ ارادہ تو دکنار انسان کا ذہن حرکت تارنخ کے جبری مسیر کے تھری تو ایں کا تابع و محکوم ہوتا ہے۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ وہی طریقہ اختیار کرے جس کو معاشرہ کے مقتضیات اور فکری تصورات نے اس کے لئے معین کر دیا ہے۔ لہذا انسان کے سامنے اپنے ارادہ و اختیار کے اظہار کا راستہ بالکل بند ہے۔ اور نہ ہی اس کے اپنی مسئولیات کی معرفت کا کوئی دور ہے۔

— یعنی خلاصہ یہ ہوا کہ انسان معاشرہ و ماحول سے مجبور ہے فاقد الارادہ، مہترم اور دوسری طرف یہ لوگ کہتے ہیں: نظام معاشرہ میں افراد انسانی کی شخصیت بہت ہی موثر ہے اور اسی نے یہ لوگ انضباط مسلکی و حزبی پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور استعمار زندہ تنظیموں کو بغاوت مسلحہ نہ پر تادہ کرتے ہیں۔ اور لوگوں کے اختیار و حریت کا فائدہ اٹھا کر ظلم انسان

کے عقائد میں تغیر پیدا کرنا چاہتے ہیں اور خود تو جو کرنے میں وہ کرتے ہیں۔ اور ان کا انسان کے لئے بلکہ فرد کے لئے اعتراف کرنا مادیہ ڈیالیکٹیک کے ساتھ صریحاً ناقض ہے۔ یہ گویا اعتراف و اقرار ہے کہ قوت و اختیار افراد انسانی تک کے پاس موجود ہے معاشرہ میں تو مکمل بحث ہوتی ہے۔

اگر یہ لوگ یہ کہیں کہ منسلو جمہور کو حرکت میں لانا اور ان کی انقلابی تحریکوں کو تقویت پہنچانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ رجعت پسند و کہنہ عہد قدیم کے بطن سے نظام جدید کے سورج کو نکال دیا جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کام غیر منطقی ہے کیونکہ تحول کیفی اور انقلاب اپنے حدود و خارج و بے موقع نہیں ہو سکتا اور طبیعت ہر شخص سے بہتر اپنے کام کو ڈیالیکٹیک رول کے مطابق انجام دے لے گی۔ اور افکار کی تخلیق و تحریک درحقیقت طبیعت کے کاموں میں ہے چارہ اعلیٰ ہے۔

یہ کہنا کہ آزادی کا مطلب اور اک ضرورت و قوانین طبیعت کی شناخت اور اہداف و مقاصد معینہ کے حصول کے لئے ان چیزوں سے امکان استفادہ ہے۔ نہ یہ کہ قوانین طبیعت سے مقابلہ و مقاومت ہے۔ تو اس سے بھی آشکارا و ابہام دور نہیں ہوتا۔ کیونکہ شناخت قوانین اور ان کے اہداف معینہ میں استفادہ کے بعد بھی یہ آشکارا باقی رہتا ہے کہ مادہ و طبیعت ان مقاصد کو معینہ کرتی ہے یا تو انسان اس کا معمم ہوتا ہے؟ اور اگر یہ انسان ہے جو تعمیم کرتا ہے تو کیا اس کے تعینات اس کی خواہشات و شرائط طبیعت کی تصویریں یا ان کے جریان کے برخلاف بھی امکان پذیر ہیں؟ مادی حضرات کا خیال ہے کہ ان ایک موجود مادی ہے بلکہ اس کے عقائد و افکار بھی تحولات اقتصادی و مادی کا نتیجہ ہوتے ہیں، مواضع طبقاتی کے تابع اور معاشرہ کے روابط تولیدی کے مخلوق ہوتے ہیں اور حیات بشری مادی ضرورتوں اور مخصوص اوضاع کے رد عمل کے طور پر جڑے ہیں۔

ان گروہ مادی مخلوق ہے اور معاشرہ کے مادی روابط، اور طبیعی و جغرافیائی احوال

فیزیاوی علاقے کا اس پر اثر بھی ہوتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسرے وہ عوامل بھی ہیں جو کہ چشم خود کو اپنی باطن اور فطرت ہے وہ بھی طول تاریخ میں ان باتوں کی سرنوشت میں موثر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی عقلی و فکری حیات صرف مادہ اور علاقائی مادہ ہی کا نتیجہ ہو یہ ناممکن ہی بات ہے۔ مگر عوامل مذہبی و معنوی اور عواطف روحی کا ان کے انتخاب راہ میں جو اہمیت رکھتے ہیں ان سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔ نیز اس کا ارادہ تعلقات عمل و اسباب فعل یا ترک کے زنجیر کی ایک آخری کڑی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ان طبعی فعل و انفعالات کے تحت تاثیر ہے اور تاریخ و عامل تولید نمود حوادث کے لئے زمین ہوا کرتے ہیں لیکن نہایت عامل نہ تو تاریخی حوادث کے عامل ہیں اور نہ ہی سرنوشت ان کی نقش اصلی رکھتے ہیں اور نہ ان سے اس کے ارادہ و حریت کو سلب کر سکتے ہیں کیونکہ یہ عامل کمال کے اس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ اپنی قیمت فوق طبیعت کو پہچان پاس ہے اور اس کے زیر سایہ سئویت و آگاہی کو پہنچ گیا ہے۔

اس لئے وہ مادہ کا اسیر و محکوم نہیں ہے بلکہ اس کے پاس ایسی طاقت و قوت ہے جس سے طبیعت پر حکومت کر سکے اور وہ باطن مادی کو دیگر گون کر سکے۔

کارل مارکس (۱۸۱۸ء - ۱۸۸۳ء) نے نقش نہایتی کو اپنے نظریات میں اقتصادیات بنیاد قرار دیا ہے اور اس کا ایک معین کنندہ عامل سے تعارف کرایا ہے۔ لیکن مارکس کا دوست اس کے حکام پر حاشیہ لگاتے ہوئے کہتا ہے: مادی تاریخ کے پیش کے مطابق، آخری نظریہ واقعی زندگی کی تجدید ہے۔ جس نے اور مارکس نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا۔

لوگوں نے مارکس کے نظریہ کو مسخ کر دیا اور اس کا مطلب یہ کر دیا کہ عامل اقتصادیات ہی تنہا عامل تعیین کنندہ ہے اور اسی طرح اس کی بات کو ایک بے معنی بنا دیا۔

ان وضع اقتصادیات ہی بنیاد ہے۔ لیکن وہاں کچھ ایسے عوامل بھی ہیں جو اوپر ہی صہ کو مکمل کرتے ہیں۔ مثلاً طبقاتی جنگ اور اسی کے نتائج کے لئے سیاسی کیفیت، تشکیلات حاکم جو

پیر ذمہ داری کے بعد ظاہر ہوتے ہیں، حقوقی صورتیں، یہاں تک کہ مقابلہ کر نیوالوں کے افکار میں اس جنگ کا رد عمل، سیاسی و حقوقی و فلسفی نظریات، دینی ثقافتیں، اور ان امور کا اس ثقافت کی طرف پلٹ جانا جو اس میدان میں مسیطر ہے اور جو پیکار تاریخی کے جریان میں موثر ہوتی ہے اور جو بہت سے حالات میں واقعی طور پر اسکی شکل و صورت کو معین کرتے ہیں۔

یہ تمام عوامل مسلسل عمل و رد عمل میں رہتے ہیں اور بطور استمرار اقتصادیاں ممکن ہیں ایسے راستے کھنٹی رہتی ہیں جو ایک متحرک ضرورت کی طرح کبھی ختم نہ ہونے والے منافقات کو جنم دیتی رہتی ہیں۔

اب ہم کہتے ہیں: اگر اوپری حصہ کو مکمل کر نیوالے عوامل ہی پیکار کے تاریخی کی شکل و صورت معین کر نیوالے ہیں تو آپ یک طرفہ طور سے اقتصاد کی تعیین کنندگی پر کیوں بھروسہ کرتے ہیں؟ اور اگر اوپری حصہ کو مکمل کر نیوالے عوامل ہی تعیین کنندہ ہیں تب تو یہ ہمارے مفروضہ کی بنیاد یہ وہی بنیاد ہیں:

اس کے علاوہ اگر دو چیزیں ایک دوسرے کے وجود کی شرط ہیں اور باہم وابستہ ہیں تو بنیاد ہی کو اولیت دینے کا کیا مطلب ہے؟

جس طرح تغیرات طبیعت عمل و عوامل خارجی کے تابع ہیں اسی طرح بشری معاشرہ میں بھی کچھ سنسن و توانیں ہیں جنکی بنیاد پر امتوں کا زوال و انحطاط یا ترقی و آقدا رہا کرتا، اس بنا پر تاریخی حوادث تو اندھے جبر کے تابع ہیں نہ تعادف و اتفاق کے۔ بلکہ یہ تمام عوامل و تغیرات کمون و خلق کے قوانین و سنسن کے تابع ہیں اور ان سنسن میں انسانی ارادہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات اس بات کو واضح و روشن کرتی ہیں کہ امتوں کی تاریخ بننے

میں ظلم و جور، عدوان و طغیان کا بہت بڑا ہتھیار ہے اور یہ وہ سنت الہی ہے جو تمام بشری معاشرہ میں جاری و ساری رہی ہے۔ ارشاد رب العزت ہوتا ہے :-

۱۔ كَاِذَا ارْسَدْنَا اَنْ مَّجٰلِكَ ذُنٰبُكَ اَمْوَنًا مِّنْ رَّيْبِهَا فَنَقْصُوْا فِیْهَا فَحَقَّ عَلَیْهَا اَنْقَوْلٌ فَاَدْمَسُوْا فَاَهَا اَنْتُمْ مِّمَّنْ (الشّٰرۃ ۶۶)

اور ہم کو جب کسی بستی کا ویران کرنا منظور ہوتا ہے تو ہم وہاں کے خوشحالوں کو طاقت کا حکم دیتے ہیں تو وہ لوگ اس میں نافرمانیاں کرنے لگے تب وہ بستی عذاب کی مستحق ہو گئی۔ اس وقت ہم نے اس کو اپنی طرح تباہ و برباد کر دیا۔

۲۔ اَلَمْ تَكُنْ فَعْلٰنَ رَبَّنَا بِاَعْدَاۤءِۤ اٰیْمَ ذٰلِ الْاٰیَادِۙ اَلَمْ یَخْلُقْ یُّمْلِكْ فِی الْبِلَادِۙ وَتَمُوتُ الْبَیِّنٰتُ حَاۡلُوْا الصُّخُوْرَ بِالْوَادِۙ وَیَرْجِعُوْنَ فِی الْاَوْدَادِۙ اَلَّذِیْنَ طَفَّوْا فِی الْاُبُلَادِۙ فَاَلْکَرُوْا فِیْهَا الْفُسَادَۙ فَصَبَّ عَلَیْہِمْ رُبُّکَ سُوْۤءَ الْعَذَابِۙ اِنَّ رُبَّکَ لَیْلَیۡمٌۭ صَادِدٌ (الہٰجِرہ ۵-۱۳)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے غار کے ساتھ کیا کیا یعنی ارم و لے وراز قہر و کاش تمام دنیا کے شہروں میں کوئی پیدا ہی نہیں کیا گیا اور نمود کے ساتھ دیکھا گیا جو اودیا (قریٰ) میں پھر تراش دیا گھر بنا رہے تھے۔ اور فرعون کے ساتھ دیکھا گیا جو سند کے لئے بنیں رکھا تھا یہ لوگ (مختلف) شہروں میں سرکش ہو رہے تھے اور ان میں بہت سے فساد پیدا ہوئے تھے تو تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا لگا دیا۔ جیسک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔

اس آیت میں بھی عذاب کی قلت طغیان و عدوان کو قرار دیا گیا ہے۔
ترجمہ

قرآن اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ جو ظالم اپنے خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ تاریخ میں تکفید و معاصات کے ظہور کا سبب بنتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :-

۳۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلٰى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلًا شَيْعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسْرِئِيْنَ

(القصص / ۳)

بینک فرعون نے مصر میں بہت سرائع کیا تھا اور اس نے وہاں کے رہنے والوں کو کئی گروہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو عاجز کر رکھا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا اور ان کی عورتوں (بیویوں) کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ بینک وہ بھی مسندوں میں تھا۔

۴۔ فَاسْتَضَفَ قَوْمَهُ فَاَطَاعُوْهُ لَا اِذْنًا لَّهِمْ كَا لَوْ اَفْوَصًا فَاِمْسِيْنَ (الزمر / ۵۳)
فرعون نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) کی عقل مار دی اور وہ لوگ اس کے تابع رہ گئے۔ یہ تاک وہ لوگ بدکار نہ تھے ہی۔

ان چاروں آیات میں فوج کیجئے تو جبکہ آپ کے سامنے آجائیں گے۔

چونکہ افراد انسان سے معاشرہ بنتا ہے اور انسان جزء معاشرہ ہونے کی وجہ سے کل سے پہلے جاتا ہے۔ انسانی فرد اپنی عقل و حکمت و ارادہ فطری کے ساتھ اپنے ذاتی وجود میں انجمن وجود سے منقسم ہوتا ہے اور فرد کی روح معاشرہ کی روح کے مقابلہ میں مجبور و بے اختیار نہیں ہے۔ قائلین جبر نے یہ خیال کیا کہ افراد مجتمع — معاشرہ — میں اس طرح گھس جاتے ہیں جیسے جڑ لگی ہیں اور پھر وہ ایک جدید حقیقت بن کر نکلتے ہیں۔ "شمار کرد پانی مل کر شربت بن جاتا ہے۔" یعنی بطور مرکب حقیقی مانتے ہیں تو ایسی صورت میں یا تو ہم معاشرہ کے ترکیب حقیقی کا انکار کر کے افراد کی آزادی و استقلال کو قبول کریں اور یا مرکب حقیقی مان کر فرد کی آزادی و استقلال سے دست برداری کا اعلان کریں۔ ان دونوں باتوں — معاشرہ مرکب حقیقی ہو

اور افراد آزاد و مستقل ہوں — کو ناممکن و محال ہے۔

معاشرہ اگرچہ افراد سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے مگر درعین حال امور جمعی مسائل انسانی میں افراد، معاشرہ کے زیر دست اور مجبور نہیں ہیں۔ کیونکہ فطرت بشر کی اصالت — جو اصل طبیعت انسانی سے مایہ حاصل کرتی ہے — ہی انسان کو حریت، اختیار و آزادی بخشی ہے اور اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ معاشرہ اس پر جو کچھ لادنا چاہتا ہے اسی سے انکار کر دے۔ اسلام اگرچہ معاشرہ کے لئے حیات موت، قدرت و طاقت کا قائل ہے اور گویا اس کو ایک مستقل شخصیت سمجھتا ہے مگر اس کے باوجود معاشرہ کے اندر اصلاح اور فساد کا مقابلہ کرنے کے لئے افراد ہی کو مرکز و اصل مانتا ہے اور طبقاتی و منع کو کسی مگر یا معین عقیدہ کے لئے جبری عامل کی طرح تسلیم نہیں کرتا۔

امر معروف و نہی از مکر معاشرہ کے فرمان سے کشتی کا دستور ہے اور محیط کے فلو و تباہ کاری کے خلاف ایک نافذی ہے۔ قرآن مجید تصریح کرتا ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا تَقْرِضُوا لَكُمْ مِنْ نَفْسٍ إِذَا هُمْ يَدْعُوكُمْ (آل عمران ۱۰۴)
اے ایمان والو تم اپنی خبر لو جب تم راہ راست پر ہو تو کوئی گمراہ چو کرے نہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

إِنَّ الشَّيْطَانَ لِفَقَاهُمْ الْمَلَأَ بَيْنَهُمُ الْغِلَافَ طَائِفًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ أَلَمْ تَكُنْ أَرْضَ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتَمَاجِرُوا فِيهَا قَالُوا لَكَ مَا فَادَهُمُ جَمْعُكُمْ كَمَا سَاءَتْ مَسِيرُوا (اسرار ۱۱)
بے شک جن لوگوں کی قبضہ روح فرشتوں نے اس وقت کہے کہ درالہرب میں پڑے، اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے تو فرشتے قبضہ روح کے بعد حیرت سے کہتے ہیں ہم کس حالت و غفلت میں تھے تو وہ دعوٰت کے بھیجیں، کہتے ہیں ہم تو روئے زمین پر کیسے تھے تو فرشتے کہتے ہیں کہ خدا کی ایسی بس چو و می زمین میں تھی بھی

گہنی نشنہ تھی کہ تم دیکھیں ہجرت کر کے چلے جاتے۔ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔

یہ آیت ان لوگوں کی باتوں کو ناپسند کر رہی ہے جو یہ عذر کرتے ہیں اے بھائی ہم اپنے ماحول و حالات سے مجبور ہیں! آیت ان کا عذر قابلِ سماعت نہیں سمجھتی۔

جب تک انسان با اختیار نہیں ہے، اس وقت تک تعویذ بے معنی لفظ ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کی آزادی کا لازمہ ہے۔ کسی بھی شخص کے استقلال اور شخصی قدر و قیمت کا اقرار اسی وقت کیا جاتا ہے جب معلوم ہو جائے کہ یہ سالک حق ہے نفس کا مخالف ہے۔ لیکن اگر فطری ذہن کے سامنے سرگرم ہو جائیں تو پھر ہماری کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

پس معلوم ہوا کہ کوئی ایسا عامل نہیں ہے جو انسان کو معین راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دے اور نہ ایسی کوئی طاقت ہے جو انسان کو کسی فعل کے ترک پر مجبور کر دے تو اسی وقت انسان خود کا دعوئی کر سکتا ہے۔

اگر انسان ضمنی طور سے — نہ کہ شعوری طور سے — اپنے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنی وضع فاسد کے بدلے کا راہہ کرنے تو وہ متقی کہلانے کا استغناء نہیں رکھتا۔ البتہ اگر اس کے تمام اعمال و افعال صمیم قلب سے شعوری طور پر قصد و اختیار کے ساتھ ہوں تب وہ متقی کہلانے کا مستحق ہے۔

قائمین اختیار

اس منتخب خیال کے لوگ کہتے ہیں: انسان خود ہی اس بات کا احساس کرتا ہے کہ وہ اپنے عمل میں آزاد ہے اپنے سب دل خواہ جو چاہے کر سکتے ہیں۔ اپنے سب خواہش جو قدم چاہے اپنی زندگی میں اٹھا سکتے ہیں۔ ایسے قوانین کا وجود جو انسان کو یہ شعور عطا کرتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے جواب دہ ہے، بعض اعمال پر ندامت و پشیمانی، وہ سزا میں جو قانون نے مجرمی کے لئے معین کر دی ہیں، انسان کے وہ اقدامات جنہوں نے تاریخ کا دھارا بدل دیا ہے، علوم و کائنات کی کئی میدان میں انسانی ایجادات یہ ساری چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان اپنے فضل میں آزاد ہے۔

اسی طرح مسند تحف، بغتہ، انبیاء، الہی قوانین کا انسانوں کے لئے پیش کرنا، معاویہ ساری چیزیں بھی انسان کے افعال و اعمال میں اس کی حریت و اختیار پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ ایک بے معنی سی بات ہے کہ خدا اپنے بندوں کو تکلف بنا کے بلکہ ان کو اعمال پر مجبور کر کے ثواب یا عقاب دے۔

اسی طرح یہ بات خلاف انصاف ہے کہ خالق کائنات اپنے قدرت و ارادہ سے ہم کو جس قدر پرے جانا چاہتا ہے اسے جانے اور پھر اس فعل کی خاطر جو ہم سے بے اختیار سرزد ہوا ہے ہم کو سزا دے!

اگر واقعا لوگوں کے تمام افعال خدا کا فعل ہے۔ — بندوں کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ — تو تمام تباہ کاریاں، ظلم و ستم، خدا کی طرف سے ہوئے ہیں حالانکہ ذات اقدس الہی ہر دم کے ظلم و تباہ کاری سے منسوب ہے۔

اگر کسی بھی کام میں ہمارے انتخاب و اختیار کو دخل ہی نہیں ہے تو تکلیف ایک غیر عادلانہ فعل ہوگا اور نہ جبارانہ و ہر مستحقِ محبت ہوں گے اور نہ انصاف کے نواسے مستحقِ تعریف ہوں گے۔ کیونکہ سلوک تو صرف امکانات اور اختیاری چیزوں میں ہوا کرتا ہے۔ انسان اسی وقت محبت یا مستحقِ ستائش و تعریف ہوتا ہے جب اپنے مزاج و افعال میں مختار ہو ورنہ نہ محبت ہو سکتی ہے نہ تحقیر۔ آزاد ہی انسان کے مسئلہ میں یہ گروہ نہ اذرا میں داخل ہو گیا ہے اس گروہ کا عقیدہ ہے کہ ان کی بلا کسی سارے کے تدارکِ مطلق ہے۔ گویا ہر لوگ فیال کرتے ہیں کہ خدا ان امور کے احکام نہیں دے سکتا جو بندوں کے افعال سے متعلق ہیں اور نہ ہی بندوں کے اختیاری افعال سے خدا کی قدرت کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر خدا عاجز ہے کہ بندے کے فعل و اختیار کے مسئلہ میں کوئی اپنا حکم نافذ کر سکے۔

یہ حضرات جو عقیدہ رکھتے ہیں اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ خداوند عالم نے کائنات اور اس میں ہونے والے حوادث کو ایک فطری نظم کے تحت بنا کر اپنا کام ختم کر دیا۔ کائنات کی تخلیق کے بعد اس میں ہونے والے واقعات و حوادث کا ڈائریکٹ خدا سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور بندوں کے افعال بھی یہاں حتیٰ کے واقعات و حوادث میں سے ہی لہذا ان کا بھی خدا سے ڈائریکٹ کوئی رابطہ واسطہ نہیں ہے اور خدا بندوں کے افعال میں کسی بھی قسم کی مداخلت یا تعارف نہیں کرتا۔

تائین الاختیار کے عقائد کا یہ خلاصہ ہے جس کو ہم نے آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ موجودات کائنات کو تو ایسی طبیعت اور انسانی ارادہ وجود میں لاتا ہے اور دورانِ عالم و اعمال بشر کا خداوند عالم سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہے۔ وہ شخص درحقیقت کون میں تاثیر کو ایک دوسرے مرکز کی طرف منسوب کرتا ہے جو خود مخلوقات سے ہے پس ایسا شخص مخلوقات کو خدا کے ساتھ خالقیت میں شریک جانتا ہے اور خدا کے مقابل میں ایک دوسرے پروردگار کا قائل ہو گیا ہے اور شعوری یا لاشعوری طور پر ذاتِ خدا کے ساتھ ذاتِ موجودات کے استقلال کا قائل ہو گیا ہے۔

اور کسی بھی موجود کے لئے — خواہ وہ بشر ہو یا غیر بشر — حریت نامہ کا عقیدہ مستلزم شرک ہے یعنی اس موجود کو خدا کے ساتھ فاعلیت و استقلال میں شریک ماننا ہے۔ اللہ ہے شک یہ بات خود دو گانہ پرستی کی ایک قسم ہے۔ جو ان کو توحید کی بلندی سے گرا کر شرک کی تاریک کھائی میں ڈھکیں دیتی ہے۔ کیونکہ اس عقیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ خداوند عالم سے اسکی قرآنِ روانی کی قلمرو سے 'جو تمام نظام ہستی پر محیط ہے' سلب اختیار کر لیا جائے اور بشر کو اس کے قلمرو اختیار میں بلا شرک غیر ایک مطلق العنان حاکم مان لیا جائے جس کو کوئی معارض نہ ہو۔ اور کوئی بھی واقعی توحید پرست اس قسم کی ناقصیت کو چاہے وہ کتنی ہی محدود ہو — عالم ہستی اور اعمال بشر — کبھی بھی قبول نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہر توحید پرست پر — عین اس عالم میں کہ وہ عقل و اسبابِ طبیعت کا قائل بھی ہو — واجب ہے کہ حوادث و ظواہر میں صرف خدا ہی کو مؤثرِ حقیقی تسلیم کرے۔ اور ہر موجد کو یہ بھی عقیدہ رکھنا چاہئے کہ اگر خدا انسان کے افعال و اعمال میں انسان کے ارادہ و اختیار کو سلب کرنا چاہے تو سلب کر سکتا ہے۔

موجودات جہاں جس طرح اپنی ذات میں استقلال نہیں رکھتے بلکہ ذاتِ خدا سے وابستہ ہیں اسی طرح یہ موجودات علت و تاثیر میں بھی استقلال نہیں رکھتے اور اسی عقیدہ کو توحیدِ افعالی کہا جاتا ہے۔ یعنی بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہم اس بات کا یقین رکھیں کہ نظامِ ہستی اپنے تمام علل و معلولات و سنن کے ساتھ خدا کا فعل ہے اور اسی کے ارادہ سے ان چیزوں کا وجود ہوا ہے اور اسی طرح عامل و سبب کا درحقیقت وجود اور اسکی فاعلیت و تاثیر بھی خدا ہی کا عطیہ ہے۔

اس تفسیر کی بنا پر توحیدِ افعالی کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ ہم جہاں ہستی کے نظامِ سبب و مسبب کا انکار کر دیں اور یہ کہتے لگیں کہ ڈائریکٹ ہر اثر خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے اور عامل کا وجود عدم برابر ہے۔ بلکہ ہم خدا کے ساتھ عالمِ اسباب کے بھی قائل ہیں (منزہم) البتہ اگر یہ تصور کیا جائے کہ نظامِ ہستی سے خدا کی نسبت اسی طرح ہے جس طرح

ہنرمندی نسبت ہنر کی طرف ہوتی ہے۔ بیخیا من باب انشاں جیسے اسپنجو اور اس کا بنانے والا اسپنجو اپنے وجود میں بنانے والے کا محتاج ہے۔ لیکن جب فنکار نے اسپنجو بنا دیا تو پھر اب فنکار کی ضرورت نہیں ہے وہ حسین و جمیل اسپنجو لوگوں کو دعوتِ نظارہ دیتا رہے گا چاہے اس کا بننے والا سر جائے۔ اگر کوئی اس قسم کا تصور خدا اور اس کی مخلوقات کے لئے کرے تو یقیناً شرک ہے۔ اور عقیدہ توحید کے منافی ہے۔

علاوہ اس کے جو شخص موجودات اور اہل انوں کے اعمال میں نقشِ خداوندِ عالم کا انکار کرتا ہے وہ قہری طور پر خدا کی قدرت کو محض دکر مٹا ہے اور یہ — متحدہ قدرت — عقل و مطلق کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس سے دو خرمیاں پیدا ہوتی ہیں پہلی تو یہ کہ یہ ذات جہاں عمومیت قدرت پروردگارِ عالم کے انکار کو مستلزم ہے۔ وہاں اس ذات غیر محدود و لامتناہی کی محدودیت کو بھی مستلزم ہے۔ اور دوسری یہ ہے کہ اس سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ مخلوقِ خالق سے مستغنی ہے اور یہ احساس انسان کو مغیان و کشرش پر آمادہ کرتا ہے۔ درآن حالیکہ خالق کے حضور میں تسلیمِ مطلق اور اس سے تعلق اور اس پر بھروسہ کرنے کا ممکن اثر انسان کی شخصیت و اخلاق اور اس کے سلوک و دعائیت پر پڑتا ہے اور چونکہ اس کے ظاہر و باطن میں خدا کے سوا کوئی حاکم فرماندہ نہیں ہوتا اسی لئے نہ خواہشات نفسانی اس کو اپنی گرفت میں لے پاتی ہیں اور نہ کوئی انسان اس کو اپنی غلامی میں لے سکتا ہے۔

خداوندِ عالم قرآن مجید میں کائنات کے ادارہ کرنے میں کسی بھی مخلوق کی شرکت کو بالکل ختم کر دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے :-

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا قَلِمٌ لِّہٖ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَ لَمْ یَلِدْ وَلَدًا فِی الْمَدَنِ وَ کُنْزٌ کَلِیْمًا (الاسراء/ ۱۰)

اور کہو کہ ہر طرح کی تعریف اس خدا کو (سزاوار) ہے۔ جو نہ تو کوئی اولاد رکھتا ہے اور نہ (سارے جہاں کی سلطنت میں) کوئی اس کا سا ججہ دار ہے

اور نہ اسے کسی طرح کی کمزوری ہے کہ کوئی اس کا سر بہارت ہو اور اسی کی بڑائی اچھی طرح کرتے رہا کرو۔

قرآن مجید نے بہت سی آیتوں میں خدا کی قدرت مطلقہ کو صراحت سے بیان کیا ہے مثلاً :-
 ۱۔ **بِذَلِكَ مَلَكَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَكُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ**

(المائدہ — ۱۶)

میرے آسمان و زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب خدا ہی کی سلطنت ہے

اور وہ ہر چیز پر قادر (دکوانا) ہے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ
 رَافِعُهُ كَانَ عَلَيْهِ قَدْرٌ مِثْرًا (فاطر ۶۴)

اور خدا ایسا (گیا گزرا) نہیں ہے کہ اسے کوئی چیز عاجز کر سکے (نہ آسمانوں

میں اور نہ زمین میں بے شک وہ بڑا خیر و برادر (مزی وقابو) قدرت والا ہے۔

یاد رکھیے موجودات عالم بس طرح انچی تعداد میں خدا کی محتاج میں اسی طرح کا ملا اپنے حدود — صفت — میں بھی محتاج ہیں۔ اور مجموعہ کائنات کو ہر وقت خداوند قدوس سے فیض وجود کا استفادہ کرتے رہنا چاہئے۔ ورنہ یہ نظام و برہم ہو سکتا ہے کیونکہ عالمی قوتوں سے جو بھی صادر ہوتا ہے وہ خدا کی خالقیت و خالقیت کے فیض ہی میں ہوتا ہے۔ اور ماہیت موجودات کا ارادہ خداوندی سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔ اس بنا پر کسی ماہیت کو بھی ذاتی استقلال حاصل نہیں ہے اور یہ اسی طرح ہے کہ جیسے بجلی کے بھپ کے سہے ضروری ہے کہ ابتدا وہ خزانہ سے بجلی لے اور پھر اسے روشنی کے سہے بھی خزانہ سے طاقت حاصل کرتا ہے۔ قرآن مجید صراحت سے کہتا ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ

(سورہ فاطر ۱۵)

لوگوں تک سب خدا کے (مہرقت) محتاج ہو اور (صرف) خدا ہی (سب سے) بے پرواہ سزاوار حمد (دستا ہے۔

اس طرح تمام حقائق اس کے ارادہ سے پیدا ہیں اور اس سے وابستہ ہیں اور ہر وجود علی الدوام اس سے استمداد کرتا ہے اور پورا نظام وجود صرف ایک لمحہ کے گرد گھومتا ہے امام جعفر صادق فرماتے ہیں :-

خدا لوگوں کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اور خدا کی سلطنت میں وہ چیز نہیں ہو سکتی جس کو وہ نہ چاہے (امول کافی ج ۱ ص ۱۶۰)

اگر پروردگار عالم ہر وقت ہم پر حریت ارادہ، امکانات، قوتیں، حیات کا فیضان نہ کرتا رہے تو ہم کئی بھی عمل کے کرنے پر قادر نہ ہوں۔ کیونکہ اس کے نا تفریق پذیر ارادہ سے ہم سے یہ چاہا ہے کہ ہم اپنے ارادی افعال کو اپنے اختیار سے انجام دیا کریں۔ اور جو چیز اس نے ہم سے چاہی ہے اس کا ایفا کریں اور اس نے یہ چاہا ہے کہ انسان اپنے حب خواہش و تشخص مستقل نیک و بد یا روشن و تاریک خود تعمیر کرے۔

جس اس پر دی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے ارادی افعال کا تعلق خدا سے بھی ہوتا ہے اور ہم سے بھی اور یہی نہ بے دریغی و شہادت مشرک کا عقیدہ ہے۔ (مترجم) — جو سوا یہ طاقت خداوند عالم نے ہم کو بخشا ہے اور ہمارے اختیار میں دیا ہے اس کو ہم جانی بوجھ کر خود سازی اور نیک کاموں میں کسی طرح خرچ کر سکتے ہیں جس طرح فساد و تباہ کاری و برائی کے لئے خرچ کر سکتے ہیں اگرچہ یہ خدا کی طرف سے ایک مخصوص چوکٹے کے اندر ہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح سمجھئے کہ طاقت خدا کی دی ہوئی ہے اور اس کا استعمال اور اس سے فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہے۔

ایک مثال سے اور بات واضح کروں۔ فرض کیجئے ایک آدمی کے سینہ میں مصنوعی قلب لگا دیا گیا ہے اور ایک شری کے ذریعہ — جریٹری اس قلب مصنوعی سے متصل ہے —

اس معنی قلب میں حرکت بخشی گئی ہے اور اس بشری کے کنٹرول کرنا اسے گمراہ کرے گا ہمارے اختیار میں دیدیا گیا ہے اور اس بشری کی چابی ہمارے پاس ہے۔ ہم جس وقت چاہیں چابی لگا کر قلب متحرک ساکن کر دیں۔ یعنی یہاں پر جو چیز ہمارے اختیار میں ہے وہ ایک طاقت ہے جو بشری کے ذریعہ ہر وقت دل کو متحرک رکھے ہوئے ہے لیکن اس طاقت کا کنٹرول ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہم جب تک چاہیں بشری کے ذریعہ اس طاقت سے دل کو متحرک رکھیں اور جب چاہیں اس کی حرکت کو ختم کر دیں اور دل کو جب تک متحرک رکھیں اسکو اختیار و بدیہی جو چاہے کرے تو اب اگر دل اچھا یا برا کام کرے تو یہ اسکی خواہش اور اس کے اختیار کی بات ہے وہ اس طاقت کے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے وہ جانے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن وہ طاقت ہمارے کنٹرول میں ہے۔

اسی طرح جاری طاقت خدا کی بخشی ہوئی ہے ہم جس طرح چاہیں اس طاقت کو استعمال کریں یعنی اس سے فائدہ یا نقصان حاصل کرنا بالکل ہمارے اختیار میں ہے لیکن وہ طاقت خدا کے کنٹرول میں ہے جب تک چاہے وہ طاقت ہمارے پاس رکھے اور جب چاہے ختم کر دے۔ اور یہ وہی مذہب اعتدال ہے جو مذہب جبر اور مذہب اختیار دونوں سے الگ ہے اور اب ہم اسی مذہب کی — یعنی مذہب اعتدال — مزید توضیح کرنا چاہتے ہیں —

درمیانی بات

موجودات جہاں کمال کے چاہے جس درجہ میں پہنچ جائیں۔ اس درجہ کی مخصوص ہدایت سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اور درجات گوناگون ہستی کے مناسبت سے ہدایت کی خصوصیت بھی مکمل طور سے متفاوت ہے۔

یہ بات ہمارے لئے ممکن ہے کہ اس کائنات کے مختلف موجودات کے درمیان ہم جہاں چاہیں اپنی جگہ معین کر لیں۔ ہم جانتے ہیں کہ نباتات فطرت کے جبری طاقتوں میں اسیر رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جمیعہ کے تغیرات کے سامنے اپنے تکامل کا مختصر سا اظہار ردعمل بھی کرتے ہیں۔

اور جب ہم حیوانی خصوصیات کی تحلیل و تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حیوان کے خصوصیات نباتات سے مکمل طور پر تفاوت رکھتے ہیں۔ حیوان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی غذا کی تلاش خود کرے۔ کیونکہ طبیعت حیوان کے لئے دسترخوان نہیں پہنچاتی۔ اور نہ اس کے لئے غذا تیار کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ تلاش غذا کے لئے وہ کافی وسائل کا محتاج ہوگا۔ لہذا خدا نے اس کو ان تمام وسائل سے مکمل کر کے پیدا کیا ہے۔

اگرچہ حیوان قوت غریزیہ کی شدید کشش اور جاذبہ کے ماتحت ہونے کی وجہ سے ایک فرمان بردار موجود ہے اور عین اس حالت میں ایک حد تک آزاد بھی ہے اور کسی حد تک فطرت کی سخت گیری اور قید سے بھی اپنے کو آزاد بنالیتا ہے۔

علمائے حیوانات کا قہقہہ ہے کہ جب تک حیوان اپنی فطری ساخت اور قوی و آلات کے لحاظ سے کمزور ہوتا ہے اس وقت تک انہیں غریزہ قوی تر اور فطرت کی بروہ راست

حمایت و سرپرستی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اور جتنا جتنا حسنی، نیکی اور عقلی طاقتوں سے مضبوط اور استقامت و قدرت سے محکم تر ہوتا جاتا ہے اتنا اتنا ہدایت و غور و فکر کی کم و کمزور و دور ہوتا ہے۔ جیسے بچہ اپنی ابتدائی زندگی میں ڈائریکٹ پدر و مادر کی تمام تر حمایت و توجہ کے ماتحت ہوتا ہے اور پھر جتنا جتنا مندرجہ شدہ سے قریب ہوتا جاتا ہے والدین کی ڈائریکٹ سرپرستی سے اتنا اتنا دور ہوتا جاتا ہے۔

انسان جو مرحلہ تکامل کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہے اور نہادہ موجود ہے جو قوت ارادی، قوت تیز و تشخصی، کامیابی سے وہ طریقہ کے لحاظ سے بہت تیز سطح پر ہے۔ حالانکہ تدریجی آزادی کے مرحلوں پر نسبت بنائے گئے اختیارات نام کی حد تک محدود رکھے ہیں۔ لیکن جمہوریت میں ضعف و نارسائی کے ساتھ ساتھ۔

بنائے گئے تمام ضرورتوں کو مختلف طریقہ سے طبیعت خود پورا کرتی ہے۔ اور حیوانات کی ضرورتوں کے سلسلہ میں ماں کی ذمہ داری اتنی ہوتی ہے کہ وہ حمل اور تغذیہ اور بچہ کی حفاظت کی پابند ہوتی ہے۔ لیکن حیوانوں میں غرائز زمانہ طفولیت ہی سے بیدار و پربار ہیں اور ماں ان کی حرکت اور تربیت کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ اور اس طرف سے وہ مطمئن ہے، لیکن انسان کو دیکھتے ہیں کہ وہ فطری طاقتوں کا مالک نہیں ہوتا، ناساعد حالات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے میں وہ حیوان سے بدرجہا کم تر ہے۔ اسی لئے وہ سالہا سال تک دوسروں کا خصوصاً والدین کا۔ جب تک خود کفالی اور مدد استقلال کو نہ پہنچ جائے اور اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جائے۔ محتاج رہتا ہے۔ قرآن مجید انسان کے ضعف کی صراحت کرتا ہے: **الْإِنْسَانُ ضَعِيفٌ** (النساء/۶۶) آدمی تو بہت کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

پس طبیعت انسان کو حیوان سے بہت پہلے آزاد کر دیتی ہے اور اس کے حوالہ کر دیتی ہے۔ اور مراحل تکامل کو طے کرنے کے ساتھ ایک طرف تو اس کے اختیارات، تفرکات اور اور گزادگی میں وسعت ہوتی چلی جاتی ہے اور دوسری طرف ضرورتیں، علاقے، ارتباطات

بھی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ انسان اپنی آزادی اور اختیار سے جتنا فائدہ اٹھاتا ہے اس کی ضرورت اور عاجزی بھی بڑھتی جاتی ہے۔

یہ مخصوص کیفیات جو موجودات ہستی کو گھیرے ہوئے ہیں مفکرین کی نظر میں اس بات کا مل ہیں اور موجود جس قدر بھی رشد حاصل کرتا جائے اور ترقی کی سیڑھی سے اوپر چڑھتا جائے آزادی کی طرف زیادہ سے زیادہ بڑھتا ہے۔ اور یہ پیش رفت و ترقی ضرورتوں اور عدم توازن کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے اور پھر ان حالات میں نکلنے کی مشین کام کرنے لگتی ہے۔

لیکن انسان میں حریت و آزادی کی جھلکی کسے غرائز طبیعت کے مقابلہ میں ایک مخالف قوت کا وجود ضروری ہے تاکہ انسان اپنے کو دو ایسی مخالف طاقتوں کے درمیان محسوس کرے جن میں کسی ہر ایک طاقت اس کو اپنی طرف کھینچ رہی ہو تاکہ انسان مجبور ہو کر اپنی حریت و اختیار سے سب دلخواہ بغیر کسی جبر و آکراہ کے کسی ایک کو اختیار کرے۔ اور پھر تمام اصول جبر و تحصیل و فنی پیش بندی کے اپنی برسانہ زندگی کا مخصوص اصول و ضوابط کی بنیاد پر آغاز کرے۔

اور پھر اس صراع و نزاع کے درمیان یا تو انسان موہیت رہا نہ اور امانت الہی کو سمجھ — امانت الہی کا جو جہ اتنا سنگین ہے کہ آسمانوں اور زمین نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا مگر انسان نے اٹھایا کیونکہ وہ ظالم و جاہل ہے۔ اٹھ کر اپنی خواہشات کی آندھیوں کا اسیر ہو جائے اور انحطاط و پستی میں جا کرے۔ اور پھر اپنی فکر پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے نافذ و انتخاب گراں دہ کے سہارے اور اپنی بھرپور استعداد سے استفادہ کرتے ہوئے رشد و تکامل کے راستہ پر چل پڑے اور سیراتِ تعالیٰ کو شروع کر دے۔

مگر انسان غرائز کی جبری طاقت سے آزاد ہو کر، انہوں اور بیروں میں پڑھا ہوئی غرائز کی زنجیروں کو توڑ کر، سرباویہ اور انسانی قوتوں کو بروئے کار لا کر ان سے استفادہ کرنے پر قادر ہو جائے تو پھر اس کے عواطف و احساسات کے مراکز ضعیف ہو جاتے ہیں اور وہ ان طبیعت کے چراغوں کی روشنی عقل کے سامنے مدھم پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ ہر زندہ موجود کی ہر وہ

طاقت یا عضو جس کو بغیر استعمال چھوڑ دیا جائے تو وہ طاقت ہوا عضو کمزور ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس جب کسی عضو یا طاقت کو بنیادی طور پر استعمال کیا جائے تو اس میں کمال پیدا ہو جاتا ہے۔
 بنا بریں جس وقت انسان کا آگاہانہ و عقلی ارادہ، عقل و تشخیص کی طاقت کے الہام کے ساتھ روشنیگیر راہ اور اس کا منظم حرکت بن جائے تو پھر آدمی کی بصیرت و تفکر، تحقیق و واقعیت کے پائے کا راہ گشت اور رہبر بن جاتی ہے۔

اس کے علاوہ دو مخالف قطب کے درمیان تخر و تردید کی حالت آدمی کو غور و فکر پر آمادہ کرتی ہے تاکہ وہ بلاشبہ عقل کی مدد سے صحیح راستہ اور غیر صحیح راستہ پہچان لے اور اسی خواہش و احتیاج کی بنیاد پر مرکز تفکر اپنا کام کرنے لگے ہیں اور انسان کی فکر و آگاہی کو تقویت ملتی ہے اور جوش و طاقت و حرکت زیادہ ہوتی ہے۔

حریت ارادہ، سرگردانی و میرت سے نکلنے کی خواہش، زندگی سے محبت یہ چیزیں سبب پیدائش آرزو ہوتی ہیں۔ اور انسان کی خواہشات اور تکمیل مقاصد کا ذریعہ بنتی ہیں جو سلسلہ ارادہ کی طاقتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مقصد تک پہنچا دیتی ہیں۔ اسی لئے جو موجودات اپنی ذاتی سرشت کی پیروی پر مجبور ہیں۔ ان میں آرزو و ارادہ کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ کیونکہ آرزو اور ارادہ کا تحقق و ملل ہوتا ہے جہاں اختیار ہو۔

اسی طرح علم، تمدن، آزادی خواہی، ملکیت وغیرہ کا بھی تحقق وہی ہوتا ہے جہاں اختیار پایا جائے۔ اور انسان اپنی حریت و سعی سلسلہ کے ذریعہ کمال علمی و رشد بلکہ تمام اعیانہ فطرت و سرشت میں ترقی کر سکتا ہے۔ اور اپنی طاقتوں، استعداد اور بلند انسانی فطرت کا استعمال کر کے ایک ایسی منزل تک پہنچ سکتا ہے جہاں وہ فضائل کا منبع فیاض اور

معاشرہ کیلئے عامل ثمر دار بن جائے اور یہ سب چیزیں اختیار کے ثمرات میں سے ہیں اسی طرح اختیار کے ثمرات کو ہم ہر جگہ

ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

اودھر قدرانی اختیار و تکریم اختیار کے درمیان نزاع و کشمکش خود ہی شاہدین ہے کہ بشر میں غنمی طور سے اختیار کو سب ہی قبول کرتے ہیں۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں انسان میں اختیار کے حدود و شرائط کیا ہیں؟ اور انسان کس حد تک مختار ہے؟

اس مسئلہ — جبر و اختیار — میں شیعوں نے قرآن مجید اور مذہبی پیشواؤں کے جو عقیدہ حاصل کیا ہے وہ نہ مطلق جبر ہے اور نہ مطلق اختیار ہے بلکہ ایک تیسرا نظریہ ہے جس میں نہ تو مذہب جبر کی خامیاں ہیں، جو عقل و فکر، وجدان، اخلاقی اور اجتماعی معیار کے مخالف ہیں اور جو تمام فطریوں اور فحائض کی نسبت خدا کی طرف دیتا ہے اور آخر میں مدد الہی کا انکار کرتا ہے اور نہ ہی اس تیسرے نظریہ میں مذہب اختیار کی خرابیاں ہیں مثلاً قدرت خدا کے علوم کا انکار، افعال و اعمال و خلق و ایجاد میں توجید کا انکار وغیرہ اور وہ تیسرا نظریہ جبر مطلق و تفویض مطلق کے درمیان کا ایک راستہ ہے۔

مذہب اعتدال

یہ بات واضح ہے کہ ہماری آزادی حرکتوں اور سورج، چاند، زمین، حیوان کی حرکتوں میں بہت ہی روشن فرق ہے۔ ہمارے ہاں سے ایک ارادہ جوشن مارتا ہے جو فعل و ترک کے دورانہے ہمارے سامنے کھول دیتا ہے اور آزادی انتخاب کو، عین ہدیہ کرتا ہے۔

اعمال عامہ اور برے اعمال کے کرسکے لئے ہمارا اختیاری عزم، قوت تشخیص و تمیز اور ہماری مرضی سے جو کرتا ہے۔ اور اس عطیہ الہی سے استفادہ رشد و بصیرت و شعور سے ہونا چاہئے۔ پہلے تو اس کی تشخیص کرنی چاہئے، حساب کرنا چاہئے تب اختیار کرنا چاہئے اور ارادہ الہی ہی ہے کہ ہم اس کی حکومت میں اس آزادی سے فائدہ حاصل کریں۔

یاد رکھئے ہم جو بھی کام کرتے ہیں وہ اصلاح کے علم و سابق مشیت سے خارج نہیں ہوتا۔ اور تمام امور اور جزیئات زندگی، ان لوں کی میسر نوشت سب ہی اس کے علم سے مشروط و مقید ہوا کرتے ہیں اور محدود ہوتے ہیں جو بہت پہلے سے علم خدا میں ہوتے ہیں۔ اور ہم ایک سطح بھی اس سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اور ہمارے اندر چھپی ہوئی طاقت سے فائدہ اٹھانا خدا کے مسلسل و مستمرہ دے کے بغیر ناممکن ہے۔

خدا اپنی عظیم قدرت قاہرہ سے اور بصیرت نامہ سے ہمارا مراقب اور ہماری نیتوں اور کرداروں سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس کی حکومت و نظارت ہمارے تصور سے مافوق ہے اور وہ جس وقت چاہے اس رشتہ فیض کو قطع کر سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہماری آزادی اور ہمارا اختیار اس کے نظام عمومی سے خارج نہیں ہے اس لئے اس طرف سے مسئلہ توجہ میں کوئی مشکل درپیش نہیں ہے۔

وہ انسان جو اس کائنات میں اپنی طاقت و ارادہ کے زیر سایہ ٹوٹ رہے وہ خود بھی نظامِ ہستی کے طبعی قوانین کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ انسان بے اختیار پیدا ہوتا ہے اور بغیر کسی ارادہ و اختیار کے مر جاتا ہے۔ طبیعت اس کو ضرورتوں کی زنجیر میں جکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اور درمیانِ حال وہ اپنی استعداد اور اپنے امکانات سے فائدہ حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ اور آزادی و استغناء اس کے اندر غلاطیت اور ایک ایسی طاقت ایجا کرتی ہے کہ جس کے مہارے وہ طبیعت کو تسخیر اور عواملِ محیطہ پر مسلط ہو سکے۔

اسی لئے امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: نہ جبر ہے نہ اختیار ہے بلکہ امر واقعی ان دونوں — جبر و اختیار — کے درمیان ہے۔ (کافی ج ۱ ص ۶۰)

بس انسان کو اختیار تو ہے لیکن ہر طرح کا نہیں ہے۔ کیونکہ مخلوق کے لئے اختیار کی اور استقلال کی چاہ ہے وہ محدود دائرہ میں ہو۔ فاعلیتِ خدا میں شریک ہے۔ لیکن یہ حمد و اختیار جو خالقِ طبیعت کے مرضی کے مطابق ہے اور جس میں اوامرِ الہی بطور سننِ حاکمہ اس طبیعت پر جس میں بشر بھی ہے "متبعی" ہوتے ہیں وہ شریک نہیں ہے۔ اسلامی نظریہ میں انسان تو ایسی مخلوق ہے جو قدر کا جبری محکوم ہو اور نہ ایسی مخلوق ہے جو بے مقصد تاریک محیط میں آزاد چھوڑ دی گئی ہو۔ بلکہ وہ استعداد و مہارت و آگاہی اور مختلف خواہشات سے سرشار ہے اور ایک فطری ہدایت و باطنی رہبری کے ہمراہ ہے۔

مکتب جبر و اکراہ کے پیروکاروں کو دراصل اشتباہ اس طرح ہوا کہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ انسان کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں:

۱۔ افعالِ عبادہ کو خدا کی طرف منسوب کر دین تو انسان کے سلب آزادی اور جبر کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔

۲۔ افعالِ عبادہ کو صرف بندوں کی طرف منسوب کر دین تو خدا کی قدرت کی محدودیت لازم آتی ہے۔

حالانکہ ہمارے ارادہ کی حریت قدرت خدا کے علوم میں بے اثر ہے۔ کیونکہ یہ تو خدا سے ہی چاہا ہے کہ سنت الہی کی بنیاد پر آزادی کے ساتھ شخص ہر کام کو ہم کر سکیں۔

بندوں کے اعمال و افعال کو ایک طرف تو خود بندوں کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف خدا سے بھی منسوب کرنا صحیح ہے۔ پس فرق اتنا ہے کہ افعال کی نسبت بندوں کی طرف بغیر واسطہ ہے اور خدا کی طرف جو نسبت ہے وہ با واسطہ ہے اور دونوں نسبتیں حقیقی و واقعی ہیں۔ اس طرح نہ تو ان کا ارادہ خدا کے ارادہ سے ٹکراتا ہے اور نہ ہی انسان کا ارادہ خدا و ارادہ الہی کے برخلاف ہے۔

اسباب کا اپنے سببیت میں خیر انداز جو نیکا عقیدہ اور نظام عالم میں دو مخلوقات کا اعتراف نہ صرف یہ کہ خالقیت میں شرک نہیں ہے۔ بلکہ خالق کی خالقیت کے بارے میں گھماں عقیدت ہے کیونکہ اس سے احاطہ اور حاکمیت مطلق اور مرد و خیر مان الہی تمام کائنات پر جس میں انسان بھی شامل ہے۔ برقرار رہتا ہے۔

اگر ہم بطور مطلق (خدا کے علاوہ) نظام ہستی میں ہر موثر کا انکار کر دیں تو حرکت مادہ کے لئے کوئی قابل قبول تفسیر نہیں ملے گی۔ اور جب موجودات کا ایک دوسرے میں موثر ہونے کا انکار کر دیں تو علت و معلول کے اثبات کا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا۔

یہ قول : تمام حوادث مادہ کی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور خداوند عالم انچا مدائم و مستمر خالقیت سے دائمی طور پر مادہ میں ہر لحظہ حرکت پیدا کرتا رہتا ہے ؛ بھی غیر منطقی ہے کیونکہ حرکت حقیقت واحدہ ہے لہذا یہ خود بخود مادہ کے مختلف تحولات کا باعث نہیں بن سکتا بلکہ مادہ جو بوسیدہ حرکت مختلف اشکال اختیار کرتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لئے ان مختلف اشکال کا وجود قدرت خدا کے ہاتھوں ہوا ہو تاکہ تنوع موجودات کا تحقق ہو سکے۔ یہاں پر ایک سوال ہو سکتا ہے : حوادث و موجودات میں مادہ کا کوئی اثر ہوتا ہے کہ نہیں ؟ اگر مادہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو نظام وجود میں یہ آثار مشہور کہاں سے آئے ؟

اور اگر ارادہ کا اثر ہوتا ہے تو پھر یہ قبول کرنا پڑے گا کہ خدا تمام حوادث کو ڈائریکٹ نہیں پیدا کرتا جیسے کہ علت اپنے معلول مادی کو ڈائریکٹ پیدا کرتی ہے خدا ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ مادہ موثر ہوتا ہے لیکن وہ اپنی تمام طاقتوں اور استعداد کو خدا سے حاصل کرتا ہے۔ اور خدا نہ مادہ ہے نہ حرکت فی اللادہ ہے۔

بر اعتراف کر لیا کہ: خدا نے مادہ کے اندر ایسی طاقتیں اور استعداد بخشی ہیں کہ جس کے ذریعہ مادہ خود اپنے اندر اور دوسروں کے اندر تحولات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؛ خدا کی خالقیت مطلقہ میں کوئی اشکال پیدا نہیں کرتا۔ اور انسان کے لئے خالقیت محدودہ کا قبول کر لیا۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ انسان میں ایسا فقر و احتیاج موجود ہے جو اس کے تمام وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ خدا کے ارادہ و مشیت کے تابعی نہیں ہے اور نہ اس سے خدا کی خالقیت لاجہود و مل کوئی فتن پڑتا ہے۔ اور نہ ہی اس سے کوئی معقول سوال لازم آتا ہے۔

علامہ جعفر صادق ؑ سے کافی ج ۱ ص ۱۸۳ پر — ایک حدیث منقول ہے فرمایا: خدا چاہتا ہے کہ اشیاء اسباب کے ماتحت جاری ہوں۔ لہذا اس نے ہر شے کے لئے سبب قرار دیا ہے۔

خلق خدا کے اسباب میں ایک سبب انسان اور اس کا ارادہ ہے اور اس کائنات میں ہر موجود کی پیدائش کے لئے خدا کی طرف سے مخصوص اسباب و علل قرار دیے گئے ہیں کہ جب تک وہ اسباب نہ ہوں گے وہ مہیات نہ ہوں گے۔ اور یہ ایک عمومی قاعدہ ہے جو ہمارے افعال اختیار کی کو بھی شامل ہے۔ دیگر اسباب و علل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہمارے ارادہ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی ہونی چاہئے۔ تاکہ صدور فعل ہو سکے۔ قرآن مجید کی وہ آیتیں جن میں ہر شے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے وہ آیتیں دراصل ازل سے خالق عالم کے ارادہ ازل کو بیان کرنے کے سلسلہ میں ہیں اور ان کا مقصد جو

کی صورت عامہ کا بیان ہے اور اسکی قدرت کاملہ اور اعظمیہ تمامہ کائنات مقصود ہے اور یہ بھی مقصود ہے کہ اس کے امر کا نفاذ بلا استثناء تمام عالم کو مل ہے۔ لیکن یہ وسیع و شاسل اور عام تمام و کامل نفوذ بشری اختیارات کی آزادی کا معنی نہیں ہے کیونکہ اختیار بشری تو مخلوق ہے اور اسکی خدا سے یہ حریت انسانی کو بخشی ہے تاکہ وہ اپنی زندگی بسر کر نیک طریقہ اختیار کر سکے۔ اس نے کسی بھی فرد یا قوم کو دوسرے کی غلطی کا مسئول نہیں بنایا ہے۔

اور اگر یہی ضد ہے کہ بشر کو مجبور مانا جائے تو پھر ان کی اختیار پر بھی مجبور ماننا چاہئے اور انسان کی حریت لازمہ مشیت الہی ہے تاکہ اس کی محکومیت کا لازمہ ہے۔

بنابرین جس وقت ہم کسی اچھے کام کے کر نیک ارادہ کرتے ہیں تو وہی ہرئی طاقت تو خدا کی ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانا ہمارا عمل ہے خدا کا عمل نہیں ہے۔

خداوند عالم قرآن مجید میں انسان کے بارادہ ہونے کو اور عمل کی نسبت انسان کی طرف ہے اس کو بیان کر رہا ہے اور جبری حضرات کی رد کر رہا ہے اور وہ اس طرح کہ عذاب دنیا اور مصائب دنیا کو انسانی عمل کا نتیجہ بتا رہا ہے وہ تمام آیات جو ارادہ الہی سے متعلق ہیں ان میں ایک جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں پر افعال اختیار یہ کی نسبت ارادہ الہی کی طرف دی گئی ہو۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (الزلزال / ۷-۹)

تو جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اسے دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر بدی کی ہے وہ اسکو دیکھ لے گا۔

وَلَتَسْمَعُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (النحل / ۹۳)

اور جو کچھ تم لوگ دنیا میں کیا کرتے تھے اس کی باز پرس تم سے ضرور کی جائے گی۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا كَلَّا آبَاؤُنَا وَلَا
حَرُوفُنَا مِن نَّسَبٍ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا نَارَ سِنِّ
قُلُوبِهِمْ ۚ هَلْ جُنْدُكُم مِّنْ عِلمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۚ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ
فَمَا أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ (الاحقاف ۲۷)

غریب مشرکین کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم لوگ شرک کرتے اور نہ ہمارے
باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز (اپنے اوپر) حرام کرتے۔ اسی طرح (بائیں جانب کے)
جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں وہ (میں غیروں کو) جھٹلاتے رہے یہاں تک
کہ ان لوگوں نے ہمارے عذاب (کے مزے) کو چکھا (لے رسولی تم کہو کہ کیا
تمہارے پاس کوئی دلیل ہے (اگر ہے) تو ہمارے (دکھانے کے) واسطے
اس کو نکالو (دیں تو کیا پیش کر دے) تم لوگ تو صرف اپنے خیال خام کی
پیروی کرتے ہو اور صرف اٹکل بوجھائیں کرتے ہو۔
اگر ہدایت و گمراہی انسان میں مشیت الہی کی وجہ سے ہوتی تو روسے زمین پر فساد کا نام
و نشان بھی نہ ملتا۔

لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهْدَى النَّاسَ جَمِيعًا (الاحقاف ۲۸)

مگر خدا چاہتا تو سب لوگوں کی ہدایت کر دیتا۔
مخوفین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہر قسم کا فساد خدا کے ارادہ سے واقع ہوتا ہے
جیسا کہ خود قرآن نے حکایت کی ہے:-

وَإِذْ أَقْبَلُوا فَاخْتَلَفُوا ۚ وَحَدَّثُوا عَلَيْهَا آيَاتِنَا ۚ اللَّهُ آمَرَنَا بِهَا
قُلُوبُنَا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (التغوى ۱۷)

اور وہ لوگ جب کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اسی طریقہ پر اپنے
باپ داداؤں کو پایا اور خدا نے (مجھے) بھی حکم دیا ہے (لے رسولی تم صاف

کہہ دو کہ خدا ہرگز میرے کام کا حکم نہیں دیتا کیونکہ تم لوگ خدا پر رافضی کر کے (دو باتیں کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

خداوند عالم نے جس طرح عمل صالح کے لئے ثواب مقرر کیا ہے اسی طرح فساد و بخل کے لئے جزا اور عقاب بھی مقرر کیا ہے لیکن گناہوں پر سزا مقرر کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس نے گناہوں کے کرنے کو بھی کیا ہے۔ اگر کوئی مسجدِ ارادی مٹی کے تیل کے استنساخ میں مایوس کی تیلی جلا لے اور نیل کو آگ لگ جائے تو ممکن ہے خود جلانے والا بھی اس میں جل جائے۔ یہ ایک فطری قاعدہ ہے جو تمام عالم میں جاری و ساری ہے اور آگ جلانے والے نے اگرچہ اس قاعدہ کو جانتے ہوئے یہ اقدام کیا ہے۔ تو پھر اس کا یہ عمل نہ صرف یہ کہ فطری ضرورتوں کے تابع نہیں ہے بلکہ عقل و انسان کی طبیعت کے بھی خلاف ہے۔

مسئد جبر و اختیار میں انسان کی ہستی اور اس کے افعال کے طبعی آثار تو ارادۃ الہی کے ماتحت ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے اختیاری افعال خود ان کے ارادہ سے واقع ہوتے ہیں۔ پس شیعی نقطہ نظر سے اسلامی نظریہ یہ ہے کہ ان اس قسم کے ارادۃ مطلقہ کا حلقہ نہیں ہے کہ خدا کے اس ارادہ و مشیت کے برخلاف جو تواریخ و سنن ثابتہ کی صورت میں کائنات کے اندر پھیلے ہوئے ہیں ان کے چوکھٹے سے نچاؤ کر کے کوئی اقدام کرے۔ کیونکہ۔۔۔ معاذ اللہ۔۔۔ خدا تو اپنی مخلوق کے مقابلہ میں کمزور ہے نہ عاجز ہے نہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ اور نہ آدمی ہی اتنا مجبور ہے کہ وہ سب دلوخواہ اپنے لئے زندگی کا راستہ بھی منتخب نہ کر سکے اور حیوانات کی طرح دست بستہ غرایز کا اسیر ہو۔

قرآن مجید نہ صرف صحیح روایت کا ذخیرہ ہے بلکہ اس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن اس انسان کو نہ اس بات پر غور کیا کہ یہ کدیتِ فلاح کا راستہ اختیار کرے اور نہ اس پر مجبور کیا ہے کہ شک و گمان کی گارانتہ اختیار کرے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۚ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ (سجۃ ۱۵-۱۷)

پس ثابت ہوا کہ انسان کے اختیار کی افعال کی نسبت خدا کی طرف دینا قرآن کی تفہیم سے مرود ہے۔

پس ثابت ہوا کہ ان کے اختیار ہی افعال کی نسبت خدا کی طرف دینا قرآن کی تفسیر میں مردود ہے۔

مسئله قضا و قدر

تضا و قدر

مسدود قضا و قدر ان جنہالی مسائل میں سے ہے جس میں بہت سے مواقع میں مختلف اسباب کی وجہ سے تحریف ہو گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس مسدود کو لوگوں نے وقت نظر سے سمجھا ہی نہیں اور جن لوگوں نے سمجھا بھی اس میں ان کو ان کی بدینتی نے اکھا دیا۔ اسی لئے ہم یہاں پر مختصر طریقہ سے اس کے بارے میں بحث کریں گے اور کوشش بھر رکھیں گے سمجھانے کی سعی کریں گے۔

دیکھئے اس کائنات میں ہر چیز کو سبب و منفعی اور دقیق قانون کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ اور ہر چیز اپنے حدود و مشخصات کو ان علل و موجبات سے کب کرتی ہے جس سے وہ وابستہ ہے جس طرح ہر موجود اپنے وجود کو اپنی علت سے حاصل کرتا ہے اسی طرح ہر مظاهر و باطنی حقائق کو بھی علت ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اور اسی کی طرف اندازہ گیر کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ ہر علت و معلول میں ایک قسم کی ممانعت و سختی ہوتی ہے۔ اس لئے طبی طور سے ہر علت اپنے مناسب اثر کو اپنے معلول میں منتقل کرتی ہے۔

اسلام کی نظر میں قضا و قدر کا مطلب، خدا کا وہ قطعی حکم ہے جو کائنات کے امور کے جریان اور ان کے حدود و اندازہ کے بارے میں ہو۔ اور نظام آفرینش میں ہونے والی ہر چیز — اور اسی میں اعمال انسان بھی شامل ہیں — اپنی علت کی طرف سے حکم قطعی پاتی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ علت کا عام قاعدہ ہر چیز کو شامل ہے اور ہر چیز اس کے دائرہ میں ہے۔ یہ ہے کہ ان کے اختیار کی افعال بھی علت کے عام قاعدہ کے اندر آتے ہیں۔ یعنی ہر معلول کے لئے یا سبب علت ضرور کا ہے (مترجم)

قضا : یعنی وہ مضبوط و حتمی عمل جس میں رجوع نہ ہو ۔ اور یہ خدا کا فعل ہوتا ہے یعنی خالقیت ۔
 قدس : یعنی اندازہ ، یعنی نظام آفرینش کا ایک سسٹم تک ہوتا ہے ۔ اسی کو نظام آفرینش
 کے جزیان کی کیفیت و چگونگی کا بیان کرنا لایا بھی کہا جاتا ہے ۔ اس تفسیر کے مطابق یہ معنی
 ہوں گے کہ خدا نے ایک سسٹم تک اور حساب شدہ جہاں ہستی کو پیدا کیا اور قدر
 اس کی خالقیت کا محمول ہے جس کا اثر تمام موجودات میں ہے ۔

اور تقدیر سے مراد خارجی و عینی اندازہ گیری ہے ۔ یعنی علیٰ تحدید خارجی ہے ۔ مکمل نقشہ
 بنانے والے انجینئر جس طرح مکان کا نقشہ اور خاکہ ذہنی طور پر مکان تیار ہونے سے پہلے بناتیے
 ہیں وہ وہاں اندازہ مراد نہیں ہے اور قرآن مجید انھیں قالب ڈالے ثابت کہ تمام خصوصیات کے
 ساتھ اور ہر چیز کے اندازہ کو قدر کے نام سے یاد کرتا ہے :-

إِنَّا خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (الفرقان ۲۶)

بیشک ہم نے ہر چیز ایک مقررہ انداز سے پیدا کی ہے ۔

قَدْ جَعَلْنَا اللَّهُ رَبَّكِي شَيْئًا قَدَرًا (الطلاق ۲)

خدا اسے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے ۔

تمام عقلی اور طبعی ضرورتوں کو اور تمام ان اجزائے علت کو جو حوادث کی پیدائش کا موجب
 ہوتے ہیں خدا نے ان کو قضا سے تعبیر کیا ہے ۔ اور اپنے معین شروط کے ساتھ جب تک وہ
 انداز سے پورے نہ ہو جائیں اور مستغنیات مکمل نہ ہو جائیں قضا کا وجود نہیں ہوا کرتا ۔

خداوند عالم موقعیت زمانی و مکانی اور حوادث کے حدود کو نظر میں رکھ کر پھر اسی بنیاد پر
 قضا کا حکم نافذ کرتا ہے ۔ اور اس عالم میں جو بھی عامل ظاہر ہوتا ہے وہ علم و ارادہ حق کا مظہر
 ہوتا ہے اور قضا کے الہی کے نفاذ کا وسیلہ ہوتا ہے ۔

ہر چیز کے اندر تکامل کی استعداد ہو کر آتی ہے ۔ اور مادہ جو قانون حرکت کے ماتحت
 ہے اس میں مختلف صورتوں کے قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد ہوتی ہے اور عوامل کے

کے تحت تاثیر مختلف حالات و کیفیات کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی مادہ بعض مواصل سے ایسا ایندھن بن سکتا ہے جو اسکو حرکت پر آمادہ کر سکے بعض دوسرے مواصل سے ٹکرا کر ان کی موت میں آکر اپنا وجود ختم کر دیتا ہے۔ اور کبھی اپنی پیشروی کو باقی رکھتے ہوئے مختلف مراحل کو نیچے چھوڑتے ہوئے حد کمال تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی پیشروی کو باقی نہ رکھ کر ٹھہر جاتا ہے۔ کبھی تو بطور عجلت اپنی حرکت میں سرعت پیدا کرتا ہے اور کبھی تقدم کو طے کرنے کے لئے جس سرعت کی ضرورت ہوتی ہے اس کو ختم کر دیتا ہے اور بہت ہی سست رفتاری سے حرکت کرتا ہے۔ پس اس کی بازگشت ایک ہی قسم کے قضا و قدر سے مرعوب نہیں ہے۔ کیونکہ علت ہی معلول کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے، اور چونکہ مادی موجودات کو تعلقی مختلف علتوں سے ہوتا ہے اس لئے ایک دوسرے کے معیروں تفاوت ہوا کرتا ہے۔ اور ہر علت موجود معلول کو ایک مخصوص دھڑ پر لگا دیتی ہے۔

فرض کیجئے ایک شخص انت بڑھنے کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو یہ بیماری کسی مخصوص درجے سے ہوگی اور اس کا انجام دو طرح ہو سکتا ہے :

- ۱۔ آپریشن کر کے ٹھیک ہو جائے تو اس کا دھڑ اس علاج کی وجہ سے بدل گیا۔
- ۲۔ یہ آپریشن نہ کر کے مر جائے تو یہ دوسرا راستہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مریض کے راستے مختلف اور تغیر ہیں اور خود مریض کی مرضی کے تابع ہی لیکن مریض کی مرضی — چاہے جو بھی ہو — قضا کے الٹی کے دائرے سے خارج نہیں ہے۔

یہ بات قطعاً شرعاً و عقلاً غلط ہے بلکہ نیکو بنا بھی ناجائز ہے کہ مریض یہ ٹکڑے بیٹھے جائے کہ اب تو تقدیر کی بات ہے اگر قسمت میں زندگی لکھی ہے تو زندہ رہوں گا علاج کروں یا نہ کروں اور اگر میں موت لکھی ہے تو چاہے ہزار علاج کروں مر جاؤں گا — اب اگر مریض علاج کر کے اچھا ہو جاتا ہے تو یہی اس کی تقدیر و قسمت ہے اور اگر علاج نہ کر کے مر جاتا ہے تب بھی اس کی یہی تقدیر و قسمت ہے۔ دونوں صورتیں اس کا مقدر ہیں۔

جو لوگ سستی اور کاہلی کرتے ہیں اور کسی قسم کا کام نہیں کرتے۔ پہلے طے کر لیتے ہیں کہ کام نہ کریں گے، ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں اور جب جیب خالی ہو جاتی ہے اور فقیر چوٹنے میں تو اپنی نفیری کو مقدمہ کے سرخوپ دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہی لوگ کام کرنے محنت مزدور کرتے اور پیسے والے ہو جاتے جب بھی وہ تقدیر پر ہکا کر شرم ہوتا۔ لہذا چاہیے اس کا کرے یا نہ کرے بہر صورت وہ تقدیر ہے۔ خلاف تقدیر کچھ نہیں ہے۔

بنابرین سر نوشت میں تبدیلی و تفسیر قانون علت کے مخالف نہیں ہے۔ جو عامل بھی کائنات میں موثر ہے وہ علت عمومی کے قلمرو سے خارج نہیں ہے اور جو چیز سر نوشت کے بغیر و تبدیلی کا سبب بنتی ہے وہ خود بھی حلقہ ہائے علت میں سے ایک حلقہ ہے اور مظاہر قضا و قدر الہی کا ایک عامل ہے۔ مختصر یوں کہنے کے ایک قضا و قدر دوسرے قضا و قدر سے بدل جاتا ہے۔

ابتدائی قوانین میٹافیزیقی — حیات بعد الموت — کا تعلق حوادث سے ایک طرح کا نہیں ہوتا جیسے کہ قواعد علوم بھی اس سے زیادہ کے معاہدہ نہیں ہوتے۔ قوانین میٹافیزیقی ظاہر و حوارث پر حکومت کرتے ہیں ابتدائی بات میں بے تفاوت ہیں۔ اور وہ حقیقت حوادث و ظاہر اور ان کی جہت گیریوں سے سب ہی قوانین میٹافیزیقی کے محکوم ہیں۔ حوادث کا رخ چاہے بعد مر ہو وہ ان قوانین کے چوکھٹے سے باہر نہیں ہوتے یوں سمجھئے کہ حوادث ایک قسم کے زندہ موجودات ہیں جو ایک وسیع جنگل میں چر رہے ہیں چاہے بعد مر کا رخ کیسا نہ ہو گئے اسی جنگل میں۔ مثالاً مجوزہ شرق و مغرب بعد مر بھی جائیں اس جنگل سے خارج نہیں ہوں گے۔

اور قضا و قدر الہی وہی اصل علت کا ہر جگہ وجود ہے اور ایک امر میٹافیزیقی ہے جس کو احکام علم کے ساتھ یکساں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

اصل علت صرف اتنا بتاتی ہے کہ ہر حادثہ کے لئے ایک دلیل ضرور ہوتی ہے۔ اس کے بعد حوادث کے سلسلے میں اس سے زیادہ کوئی پیشگوئی نہیں کر سکتی۔ اور قانون میٹافیزیقی

ہیں اسلایہ صلاحیت نہیں ہے۔

قانون میٹا فیزقی کائنات کے مختلف حوادث کے لئے ایک زمین ہے۔ حادثات کے نفاذ سے کوئی فرق نہیں ہے یہ قانون۔ یوں سمجھئے۔ ایک سڑک کی طرح ہے جس پر لوگ چلتے ہیں اس کو اس سے کوئی فرض نہیں ہے کہ کون کس طرح جا رہا ہے؟ اور کون کس طرف؟ حضرت علیؑ ایک شکت دیوار کے پیچے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے دفعتاً وہاں سے اللہ کر دوسری دیوار کے سایہ میں آ بیٹھے؛ لوگوں نے کہا اے علیؑ تھکے الٹی سے فرار کرتے ہو؟ فرمایا تھا سب الٹی سے اس کی قدر کی پناہ دیتا ہوں۔ یعنی ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف گریز کرتا ہوں۔ بیٹھا اور فرار کرنا دو فعل تقدیر الٹی میں ہیں۔ اگر شکت دیوار گر جائے اور مجھے ضرر پہنچ جائے تو یہ بھی قضا و قدر ہے اور اگر مجھے خطر سے دور ہو جاؤں تو یہ بھی قضا و قدر ہے۔ قرآن مجید ان نظام و قوانین طبیعت کو جو کائنات پر حاکم ہیں اور حتی و ناقابل تغیر جبرائے رکھتے ہیں بطور سنت الہی یاد کرتا ہے:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (احزاب ۶۲)

اور تم سنت الہی کے اندر ہرگز تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔

اور اس کو بھی سنت الہی قرار دیتا ہے:-

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا إِنَّكَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّشِيرٌ كَوْنٌ فِي شَيْءٍ وَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدَ ذَلِكَ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (النور ۵۵)

وہ ایمانداروں! تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے

کام کئے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو (ایک ذائقہ والی) دین

کتاب محمدی

پر نائب مقرر کرے گا۔ جس طرح ان لوگوں کو نائب بنایا جو ان سے پہلے گزر چکے
ہیں اور جس دین کو اسی نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے (اسلام) اس پر انھیں
ضرور ضرور پوری قدرت دے گا اور ان کے مخالف ہونے کے بعد ان کے
ہر کسی کو، امن سے ضرور بدل دے گا کہ وہ (اطمینان) میری عبارت کریں گے
اور کسی کو ہمارا شریک نہ بنالیں گے اور جو شخص اس کے بعد بھی ناشکی کرے
تو ایسے ہی لوگ بدکار ہیں —

اسی طرح یہ بھی سنت الہی قرار دیا ہے :

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْيِرُ مَا يُقِيمُ حَتَّىٰ يَغْيِرَ مَا بَأْتَنَفْسِهِمْ (الروم ۴۱)

جب تک لوگ خود اپنی نفسی حالت میں تفسیر نہ ڈالیں خدا ہرگز نہیں ڈالے گا۔

اسلامی نظریہ میں واقعات کا انحصار صرف مادی علتوں میں نہیں ہے اور نہ ہی حسی
علاقات اور مادی الباءات تک نظر کو محدود رکھنا چاہئے۔ کیونکہ معنوی عوامل بھی اس
حد تک ہیں کہ جہاں عوامل مادی کے پہنچنے کا امکان نہیں ہے اور ان عوامل معنوی کا وقوع
حادثات میں مستقل ہاتھ ہے۔ کائنات کی ترازو میں نیکی و بدی میں فرق ہے انسان لہذا
میں احسان کے ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔ مثلاً جی نوع انسان کے ساتھ احسان، خیر
خدمت، محبت، مودت یہ وہ اسباب ہیں جو انسان کے انجام کو سعادت اور نعیم دائم میں
بدل دیتے ہیں۔ اور ستم، ظلم، تجاوز، سرکشی، خواہشات نفس کی پیروی، غیر مشروع خود
پرستی کا نتیجہ ہمیشہ غمی، برے اثرات، پر تمام ہوتا ہے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو اندازہ
ہوتا ہے کہ گویا کائنات خود مکافات میں دیتی ہے اور گویا یہ کائنات بنفسہ وسیع و بوسیر ہے
بلکہ اعمال کے انجام بھی مجملہ قضا و قدر ہیں کہ جس سے فرار ممکن نہیں ہے۔ تم جہاں بھی جاؤ گے

وہ تمہارا دامن گیر ہوگا۔

ایک دانشمند کہتا ہے: کائنات کو بے شعور نہ کہو ورنہ تم اپنی طرف بے شعوری کی دوگے کیونکہ تم کائنات سے پیدا ہوئے ہو۔ اگر کائنات میں شعور نہیں ہے تو تم میں کہاں آگیا؟

قرآن عوامل معنوی کے لئے کہتا ہے:-

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ النَّفْسِ الْأَمَّارِ وَالْقَوَّاسِمِ عَلِمُوا عَلَىٰ سِرِّكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ بِكُلِّ كَذِّبٍ لَوْ أَخَذْنَا هُم بِعَاقِبَتِهِمْ لَكُنَّا يَكْسِبُونَ (۱۰۷)

اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں (کے دروازے) کھول دیتے مگر (افسوس) ان لوگوں نے (ہمارے پیغمبروں کو) جھٹلایا تو ہم نے بھی ان کی کرتوتوں کی بدولت ان کو (عذاب میں) گرفتار کیا۔

وَمَا كُنَّا مُنْجِي الْقَرِي الْأَقْطَابِ ظَالِمُونَ (القص ۵۸)

اور ہم تو بستیوں کو بر باد کرتے ہی نہیں۔ جب تک وہ ان کے لوگ ظالم نہ ہوں۔

یہی مسئلہ قدر و قضا کتب جبر کے پیر و کاروں کے دیلوں میں سے ایک دیل ہے۔ وہ

سمجھتے ہیں: انسان سے مستقلاً کوئی کام سرزد نہیں ہوتا کیونکہ خداوند عالم نے انسان کے ہر کام کو خواہ وہ کئی ہو یا جزئی، پہلے ہی ایک مقدمہ کر دیا ہے لہذا انسان کے فعل اختیاری کا کوئی مورد باقی نہیں رہتا۔ لیکن جبر اور ختمی انجام میں یہ فرق ہے کہ ہر حادثہ کا خور و اس وقت لازمی ہو جاتا ہے جب اس کے تمام اسباب و علل متحقق ہو جائیں اور منجملہ اسباب و علل خود انسان کا ارادہ بھی ہے اور چونکہ انسان ایک موجود مختار ہے اس لئے اس کے اعمال اپنے ہدف معین کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور انسان باریش کے قطرہ کی طرح نہیں ہے کیونکہ باریش کا قطرہ ایک مخصوص جگہ سے چل کر قوت جاذبہ کے طفیل مخصوص جگہ ہی پر گرتا ہے لیکن انسان اپنے اعمال میں اپنے

قانون کے مطابق فطرت کا پابند نہیں ہے۔ اور اگر وہ قطعوں کی طرح پابند ہوتا تو اپنے ان مقاصد میں جس میں خود و فکر کرتا رہتا ہے اپنی مرضی سے اقدام نہیں کر سکتا تھا۔ بخلاف قانونِ مجرب کہ وہ ایک ایسا انسان موجود مانتا ہے جو آزاد تو ہے مگر اس کے ارادے مغلوب و معطل ہیں اپنے ارادہ کے مطابق کچھ کر نہیں سکتا اور وہ یہ بھی نظریہ رکھتا ہے کہ تمام عقلیں ذات انسان سے خارج ہیں اور تمام عقلوں کا تعلق صرف خدا سے ہے۔

پس قضاء و قدر اس وقت مستلزم جبر ہوں گے جب ہی قضا و قدر انسان کی طاقت اور ارادہ کے جانشین ہوں۔ اور انسان کے ارادہ و خواہش کا اس کے اعمال میں کوئی بھی عمل دخل نہ ہو۔ حالانکہ قضا و قدر الہی وہی نظامِ سبب و مسبب کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہماری تمام خواہشیں پوری نہیں ہو پاتیں کیلین یہ بات کے مجبور ہونے کی بھی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ بشر کے لئے اختیار کا قائل ہونا اور اسی کے ساتھ اس کے اختیار کو صرف اس کے اعمال میں محدود کر دینے میں کوئی منافات نہیں ہے۔ اور اثبات اختیار کی دلیلیں انسان کے لامحدود اختیار کو نہیں ثابت کرتیں۔

سرنیزہ وجود پر پروردگار عالم نے بہت سے عوامل خلق کئے ہیں۔ کبھی توبہ عوامل انسان پر واضح ہو جاتے ہیں مگر کبھی پوشیدہ و مخفی رہ جاتے ہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر انسان قضا و قدر کی واقعی اور دقیق تفسیر سمجھ سے تو پھر بھی انسان اپنی معلومات کے چوکھٹے کے اندر اپنی طاقتوں سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے پہلے سے زیادہ کوشش کرنے لگے گا۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ معرفت واقع حاصل ہو جائے اور اسی کے نتیجہ میں زیادہ کامیابی حاصل کر سکے۔ اور خواہشوں کا پورا نہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ انسان کی قوتیں محدود ہیں۔ حصول کامیابی کے عوامل تک رسائی نہیں ہو پاتی مگر اس کے نتیجہ میں خواہشیں نقشِ بر آب ہو جاتی ہیں۔

پس معلوم ہو کہ ہر موجود کا انجام اپنی سابقہ علتوں سے سرمروط ہوتا ہے۔ مگر وہ بھی

اصل صیت عمومی کے قبول کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ خواہ ہم مبدا الہی پر ایمان لائیں یا نہ لائیں کیونکہ انجام آزادی کے مسئلہ میں یہ موثر نہیں ہے۔ یعنی خواہ انسان کا نظریہ ہو کہ کائنات کا نظام اسباب و مسببات سب اللہ کے ارادہ و مشیت سے وابستہ ہے یا اس کا نظریہ ہو کہ یہ نظام کائنات مستقل ہے خدا سے اس کا کوئی ربط نہیں ہے دونوں صورت میں عقیدہ جبر و قضا و قدر کا نتیجہ نہیں ہے۔ خلاصہً مقصود یہ ہے کہ ہر حادثہ کا رابطہ اپنی علتوں سے آٹھ ہے۔ اور منجملہ علتوں کے حوادث ان کا اعتبار و ارادہ ہے نہ کہ سبب و مسبب کا انکار۔

قضا و تدبیر الہی ہر گز ہر ہونے والی چیز کو اس کے خاص مجرمت سے پیدا کرتا ہے اور ایک قانون عام کی طرح خدا کی مشیت پر اسے عالم پر چھائی ہوئی ہے اور ہر تغیر بھی سنت الہی کے بنیاد پر ہے اور اس کے علاوہ کسی صورت میں قضا و قدر کا تحقق نہیں ہوگا اور جو بھی علمی نظریہ اصل صیت عمومی کو قبول کرتا ہے وہ اس قسم کے روابط کو قبول کرنے پر مجبور ہے چاہے محکمہ الہی کا پیرو ہو یا محکمہ مادی کا پیرو ہو۔

اب اگر کسی بھی حادثہ کا نظور — اس میں افعال انسان بھی شامل ہیں — اصل و سبب کی بنا پر قطعی ہو جائے اور یہ محدث قطعی مفید جبر ہو تو پھر درزن مذہبوں کا نتیجہ جبر ہوگا اور اگر محدث حوادث کا قطعی ہونا مفید جبر نہیں ہے تو الہی محکمہ اور مادی محکمہ میں کیا فرق ہے؟

ان جو تفاوت ثابت ہے وہ یہ ہے کہ دینی تصور کا خیال ہے کہ یہاں پر معنوی امور کا ایک سلسلہ ہے جو ان عوامل کا جزو ہے جو بہت سے حوادث کی پیدائش میں بہت اثر ہیں۔ یہ دینی تصور یہ بھی کہتا ہے کہ وجود میں کچھ ایسے معنوی اسرار و رموز ہیں جو عوامل مادی سے کہیں زیادہ دقیق اور پیچیدہ ہیں۔ یہ دینی تصور زندگی کو روح، مقصد، معنی عطا کرتا ہے اور ان کو نشاط، قوت، فکر، بصیرت کی گہرائی افق میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ اور ان کو ہونا کھلت کے گھرے میں گرنے سے روکتا ہے اور

بغیر توقف و رکود کے انسانی سر کو کمال کی طرف پہنچاتا ہے۔ یہ باتیں مادی تصور میں نہیں پائی جاتیں۔

جنابریں ایک فرد الہی کہ جو بطور راسخ و قدمہ کا معتمد ہے اور اس بات کا ادراک رکھتا ہے کہ انسان و جہان کی خلقت میں حکیمانہ مقاصد مضمر ہیں اس اعتماد و توکل کے ساتھ جو صراطِ مستقیم طے کرنے میں خدا پر رکھتا ہے اور اپنے کاموں میں اسکی حمایت و پشتیبانی پر بھروسہ رکھتا ہے وہ شخص اپنے فعالیت کے ثمرات و نتائج کا زیادہ اور مطمئن تر ہو کر امیدوار رہتا ہے۔

لیکن جو شخص جہاں مادی کے تار و پود میں گرفتار ہے۔ اور مخصوص تشکر کے دائرے میں مادی قضا و قدر کی طرف میلان رکھتا ہے وہ اس عزت سے برخوردار نہیں ہے۔ کیونکہ اپنے ارفاق کی تکمیل پر اطمینان نہیں ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں نظریوں میں تربیتی، اجتماعی، روحانی لحاظ سے بہت عمیق فاصلہ موجود ہے۔

اناطول فرانس (ANATOLE FRANCE) کہتا ہے : یہ دنیا کی قدرت و نیکو کاری ہے جو انسان کو اعمال میں عواقب و اسباب کی تعلیم دیتی ہے۔ اور جس وقت ہم قضا الہی کے فلسفہ کے حوالے دستبردار ہو جائیں گے۔ جیسا کہ ہم آجکل عصرِ علم و حریت میں ہیں۔ تو ہمارے پاس کوئی دوسرا ایسا وسیلہ نہیں رہ جائیگا جس سے ہم کو معلوم ہو کہ ہم دنیا میں کیوں آئے ہیں؟ اور کس مقصد کے لئے اس جہان میں قدم رکھا ہے؟ رازِ سرِ نوشت ہم کو اپنے طاقتور سردار میں گھیرے ہوئے ہے۔ اور واقعی ہم کو کسی چیز میں خود شک نہیں کرنا چاہئے تاکہ ہم انگیزہ زندگی کے ابہام کا احساس ہی نہ کر سکیں اور ہمارے رنج و غم کی جڑیں ہمارے اس جہلِ مطلق کی وجہ سے یوں کہ ہم کو اس زندگی میں اپنے وجود کی حلت بھی معلوم نہیں ہے۔

اگر ہم جہانی و روحانی تکلیف اور روح و احساس کے شکنجوں کے فلسفہ کو سمجھیں

اور ایک شیت الہی کا اعتقاد کر لیں تو ان خداوند کو برداشت کر لیں گے۔
مومن مسکینوں اور اپنے روحانی عذاب سے بھی لذت کا احساس کرتا ہے۔ انتہا یہ
ہے کہ مومن سے جو گناہ و خطا سرزد ہو جاتی ہے اس کی وجہ سے مایوس نہیں ہوتا۔ لیکن
جس دنیا میں شعلہ ایمان بالکل بجھ چکا ہے وہاں درد، مرض حتیٰ کہ اپنے کو بھی مار بیٹھا
ہے اور سوائے بے تکلی شو خیروں اور مسخرہ پن کے وہاں کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔

قضا و قدر کی ناقص تفسیر

کچھ نوزائیدہ متقف حضرات قضا و قدر کے بارے میں غلط تصور کی وجہ سے کہتے ہیں، قدر کا عقیدہ انسان میں جمود و رکود پیدا کرتا ہے اور انسان کو زندگی میں کسی بھی کوشش اور عمل سے مانع ہوتا ہے۔

مغفل دنیا میں اس تخیل کے عام ہونے کی وجہ مسئلہ قضا و قدر کا صحیح مفہوم نہ جانتا ہے اور خصوصاً اسلامی تعلیم کے منہ سے عدم واقفیت ہے۔ اور اس غلط مغربی تصور کا مشرقی لوگوں میں پھیلنے کی علت یہ ہے کہ مشرق ابھی مغرب سے پیچھے ہے۔ ہر وہ شخص یا قوم جو اپنے مادی و معنوی خواہشات تک نہیں پہنچ پاتی وہ دل کو بہلانے کے لئے الخطا، مصیبت، مصروفہ، توفیق، قضا، قدر جیسے الفاظ کا سہارا لیتی ہے۔ رسول اکرم کا فرمان ہے، میری امت اور میرے ماننے والوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ وہ گناہ و تباہ کاری کے مرکب پر اور فساد کی توجیہ کے لئے کہیں گے قضا و قدر الہی کا تقاضا ہی یہی تھا۔ ہم کیا کریں ہماری کوئی غلطی نہیں ہے یہ سب مقدر کا کھیل ہے (مترجم)۔ اگر اس قسم کے لوگوں سے تمہاری ملاقات ہو جائے تو ان سے کہہ دو میں ان سے بیزار ہوں۔

زندگی میں ان کو حصول مقصد کے لئے قضا و قدر اس کے سنی بہم سے کبھی نہیں روکتی۔ بلکہ جو لوگ اس مسئلہ میں ضروری دینی فکر سے مطلع ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام نے لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ مدح و معنی کے ساتھ ساتھ حیات مادی کی تنظیم میں اپنی ضرورت سے زیادہ کوشش صرف کریں یہ ایک ایسی دعوت ہے جو ان کی کوششوں میں سرعت پیدا کرنے کے لئے موثر ہے۔

مغربی مفکرین میں سے جن لوگوں نے قضا و قدر کی ناقص تفسیر کی ہے۔ ان میں ایک جان پول سارتر (JEAN PAUL SARTRE) ہیں چنانچہ ان کا تصور یہ ہے: قضا و قدر الہی کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ انسان کا اپنے افعال و اعمال میں حریت و اختیار کا عقیدہ نہیں مانا جاسکتا۔ ان دونوں میں سے ایک ہی عقیدہ کو مانا جاسکتا ہے۔ یا تو خدا اور اسکی قضا و قدر اور یا پھر ان کی حریت و اختیار چنانچہ وہ کہتا ہے: میں چونکہ انسان کی حریت کا قائل ہوں اس لئے خدا پر عقیدہ نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ اگر میں خدا پر عقیدہ رکھوں تو اسکی قضا و قدر پر بھی عقیدہ رکھنا ہوگا اور اگر قضا و قدر کو مان لوں تو ان کی حریت سے ہم قہر اٹھانا پڑے گا۔ لیکن چونکہ میں حریت انسان کا عقیدہ رکھتا ہوں لہذا خدا پر ایمان نہیں رکھ سکتا:

حالانکہ خداوند عالم کی قضا و قدر عام سے ایک طرف سے اور انسان کی آزادی و حریت سے دوسری طرف سے کوئی منافات نہیں ہے۔ قرآن مجید جو مثبت الہی کو عام جانتا ہے اسی کے ساتھ ان کی آزادی کا قائل ہے اس کو خود سازی پر آمگاہ و تہنہ دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اچھے برے کی شناخت، نشت و زیبا کی پہچان اور ان میں سے ایک کو اختیار کرنا یہ خود انسان کا کام ہے:

إِنَّا خَلَقْنَاكَ عَلَىٰ خَيْرٍ مَّا كُنَّا لَكُمُوعَدًا (الدھر ۳۱)

ہم نے انسان کو راستہ میں دکھایا (اب وہ) خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکر دوسری جگہ ہے:-

وَمَنْ أَمَّا زِلْزَلَةُ الْأَخْصَرَةِ وَ سَعَىٰ لَهَا سَعْيُهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا (الاسراء ۱۹)

اور جو زلزلہ آختر کے متنی ہوں اور اس کے لئے جیسی چاہئے ویسی کوشش بھی کریں اور وہ ایمان دار بھی ہو تاویہی لوگ وہ ہیں جن کی کوشش

مقبول ہوگی۔

اور جو لوگ قیامت میں یہ کہیں گے ان کی ملامت کرتا ہے :-

لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَنَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا
خَوَلَانَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ (رائض ۳۷)

اگر خدا چاہتا تو نہ ہم ہی اس کے سوا کسی اور چیز کی عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ
دادا اور نہ ہم بغیر اس کی مرضی کے کسی چیز کو حرام کر بیٹھتے۔

قرآن کی کسی بھی آیت میں فساد و ضلال کی نسبت یا اصلاح کے ممانعت کی نسبت قطعی
الہی کی طرف نہیں ہے۔ کوئی ایسی آیت آپ کو نہیں ملے گی جس میں ارادہ ان کی جگہ اللہ کے
ارادہ کو دخل دیا گیا ہو۔ اور نہ کہیں یہ ملے گا کہ قرآن کعبہ پر ہو کسی فرد یا افراد کو اس لئے متنا
کیا گیا ہے کہ فضا کے الہی کا تقاضا ہی تھا۔ البتہ قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ فلاں کو غضب خدا
گھیر لیا گیا یا سرکشوں کو خدا عذاب الیم دے گا۔

اور چونکہ خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ لاتعد ولا تحصى نعموں کا انعام کیا ہے لہذا
اگر ان میں سے کوئی طریق اصلاح و طہارت کی طرف پڑے تو وہ تو بہ قبول کرے والا ہے۔ واپسی
کا راستہ کھول دیتا ہے اور تو بہ قبول کر لیتا ہے اور یہ بہت بڑی رحمت ہے۔

انسان کے ارادہ و اختیار کا دائرہ اگرچہ جملہ حیوانات سے وسیع ہے مگر پھر بھی اسی دائرہ
کے اندر ہے جو خدا نے اس کے لئے محدود و معین کر دیا ہے۔ اس لئے اپنی پوری زندگی میں
ہر خواہش کو پورا نہیں کر پاتا۔ اسی لئے ایسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کام کے انجام دینے
کا ارادہ کرتا ہے لیکن چاہے جس بھی کوشش کرے نتیجہ تک نہیں پہنچ پاتا، اس کی علت
یہ نہیں ہے کہ خدا کا ارادہ اس کے ارادہ کے مقابلہ میں حائل ہو گیا اور اس کے انجام کار سے مانع
ہو گیا۔ بلکہ ایسے مواقع پر کچھ مہجول خارجی عوامل ہوتے ہیں جو ان کی دانائی اور توانائی
کے دائرہ سے باہر ہوتے ہیں وہ ان کے مقاصد کے راستہ میں حذرہ بن جاتے ہیں۔

اور اسکی خواہش کو پورا نہیں ہونے دیتے۔

جب ہم یہ جانتے ہیں کہ کوئی علت بغیر معلول کے اور کوئی معلول بغیر علت کے نہیں ہو سکتا اور ہمارے وسائل اور امکانات ہی محدود و قاصر ہیں تو ہم کو یہ بھی جان لینا چاہئے کہ ہم انہی تمام خواہشات کو پورا بھی نہیں کر سکتے۔

خداوند عالم نے اس نظام وجود میں مبادیات و عوامل پیدا کئے ہیں۔ بعض تو انسان کیلئے مفہوم ہیں مگر کثرت ان عوامل کی ہے جو غیر معلوم ہیں بلکہ ان کا حساب ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس معنی کے بنیاد پر قضا و قدر نہ صرف یہ کہ انسان کے اختیار کو سلب نہیں کرتے اور نہ ہی اسکی فعالیت اور معلول بخشش زندگی تک پہنچنے سے مانع ہوتے ہیں۔ بلکہ فکر و عمل کیلئے راہنما ہیں اور اپنی کوشش بھرانسان کو حرکت میں لاتے ہیں تاکہ افزائش و انش کی راہ میں اور جتنے بھی دقیق تر عوامل جو زندگی کی کامیابیوں کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں ان کو پہچانیں۔ بس ان تمام کے قضا و قدر پر عقیدہ رکھنا خود ان فی مقام حد کی تکمیل و ترقی کے لئے ایک موثر ہے اس بحث اور گزشتہ بحث کے ضمن میں ان کی تفاوت و سعادت کا مسئلہ بھی

حل ہو جاتا ہے کیونکہ تفاوت و سعادت انسان کے افعال اختیار یہ اور حرکات اختیار یہ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ تفاوت و سعادت نہ تو ان کے اختیار ہی اعمال کی صفت بنتی ہیں اور نہ ان عوامل طبیعت کی صفت بنتی ہیں جو وجود انسان میں موثر رول ادا کرتے ہیں۔

یاد رکھئے ماحول اور وراثت اور تمام وہ چیزیں جو انسان میں طبعی طور سے نمودار ہیں ان میں سے کوئی بھی شئی انسان کی تفاوت و سعادت میں الزامی اثر نہیں رکھتی۔ یہ چیزیں انسان کے انجام کو معین نہیں کرتیں۔ بلکہ جو چیز ان کا مستقبل بناتی ہے اور اس کو

ترقی یا تنزلی تک پہنچاتی ہے وہ خود انسان کا ذاتی اختیار ہے اور یہ بات ہے کہ وہ اپنی طبیعت اور عقلی قدرت سے اور اپنی صلاحیتوں کے کس قدر فائدہ اٹھا سکتا ہے؟

سعادت و خوشحالی کا اس بات سے کوئی علاقہ نہیں ہے کہ انسان مواہب طبعیت کے کس کیت یا کیفیت میں متبع ہے۔ بلکہ جس کے ہاتھوں میں فراوان سرمایہ ہے اس کی مشورت بھی محاسن تر ہے بقول شخصے 'ہر کہ ہاشن بیش رفشن بیشتر' اور اس کا انحراف ایک گمراہی و کم مایہ کے انحراف کے برابر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا حساب انھیں امکانات و استعدادات کے مطابق ہوگا جن سے وہ متبع ہے۔

یہ بات بہت ممکن ہے کہ جس شخص کی ذات میں پوشیدہ توانائی اور ذخیرہ کم ہے اور ظواہر طبعیت کے معارف سے قاصر توجہ سرمایہ کا مالک بھی نہیں ہے۔ لیکن اپنی وضع و محنت کو اپنی عائد شدہ تکالیف و مسوئیات سے مکمل طور پر تطبیق دیتا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ اس سعادت تک پہنچ جائے جو انسانی مرتبہ و مقام کے لائق و مناسب ہے۔

کیونکہ ان میں سعادت و کامیابی تک پہنچا ہے وہ اپنے اندر ذخیرہ شدہ صلاحیتوں کے صحیح استعمال کی وجہ سے ہے۔ ویسے اس کے برعکس بھی ممکن ہے۔ ہاں معنی کہ والد ار اور ثروت مند سعادت تک نہ پہنچ سکے بلکہ ہو سکتا کہ مورد استفادہ کر کے گمراہ و ضلّی ہو جائے اور کبھی بھی فلاح یافتہ نہ ہو سکے :-

سَلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةً (الدھر - ۳۸)

ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گرو ہے۔

قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص کی شرافت یا سعادت اس کے اختیاری امور و وابستہ ہے۔ ترکیب طبعی و نفسی سے نہیں؛ اور یہ خداوند عالم کی آیات عدل میں سے ایک آیت ہے۔

بداد بھی شیعوں کے مخصوص عقائد میں سے ہے۔ باین معنی کہ عوامل و اسباب کے

بدلتے سے میسر بھی بدل جاتا ہے اور جو چیز بحسب ظاہر دائم و قطعی معلوم ہوتی ہے وہ انسان کے اعمال و افعال و سیرت کے بدلتے سے تغیر پذیر ہو جاتی ہے۔ جس طرح مادی عوامل کبھی انسان کے میسر کو بدل دیتے ہیں اسی طرح وہ مادی عوامل معنوی بھی کبھی کبھی موثر ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو چیزیں پس پردہ ہیں اور مجرے ظاہری کے خلاف ہیں یہ معنوی عوامل ان کو ہمارے لئے ظاہر کر دیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تغیر اسباب و شروط کی وجہ سے ہمارے لئے امر جدید کا انکشاف ہوتا ہے۔ اور امر اول کی مصلحت ختم ہوتے ہی امر ثانی کی مصلحت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ نسخہ میں ہوتا ہے۔ اور جس طرح بعد والے قوانین پہلے والے قوانین کو نسخہ کر دیتے ہیں اور اس سے خداوند عالم کی جہالت یا مذمت کو نہیں ثابت کیا جاسکتا بلکہ نسخہ حکم تشریعی سابق کے ختم ہو جانے کا کاشف ہے بس یہی صورت حکم تکوینی میں بدلی جاتی ہے۔

بدار کا یہ مطلب لینا کہ ”ایک چیز کی حقیقت خدا پر مخفی تھی اس کے بعد ظاہر ہوئی لہذا خدا نے پہلا حکم بدل دیا“ بالکل غلط اور استنباط ہے۔ اب عقیدہ خدا کے علم کے احاطہ کامل کے منافی ہے کوئی بھی مسلمان اس قسم کا عقیدہ نہیں رکھ سکتا۔

دعا بھی ان معنوی عوامل میں ہے جس کی اہمیت میں کمی نہیں کرنی چاہئے۔ خداوند عالم ہر شخص کے اندرونی اسرار سے واقف ہے۔ مگر بندے کا عالم روح و معنی میں اپنے رب سے دعا کرنا اور بندہ کا اپنے خدا سے رابطہ بمنزلہ اس نظام عمل کے ہے جو انسان کے طبیعت سے رابطہ و علاقہ میں ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے دعا خود مستقل ایک عمل کر نیوالی چیز ہے۔

لہذا انسان کا فریضہ ہے کہ اگر کبھی مشکلات کے محاصرے میں آجائے تو دامن یاس و غم کو نہ پکڑے۔ کیونکہ رحمت الہی کے دروازے کبھی کسی کے لئے بند نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے آئندہ الاکمل ایب امر جدید کے کر آئے جس کا انسان تصور بھی کر سکتا

ہو۔ اور خداوند ہے :-

كَلَّ يَوْمَ هَوِيْ شَانِ (الرحمن / ۳۸)

وہ ہر روز (ہر وقت) مخلوق کے ایک نہ ایک کام میں ہے ۔

اسی لئے کسی بھی صورت میں دعا سے دست بردار نہیں ہونا چاہئے اور دعا کے ساتھ کوشش بھی بہت ضروری ہے کیونکہ بغیر کوشش کے دعا کے بارے میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ الداعی بلا عمل کا لڑھی بلا دستر ۔ بلکہ ان کا فریضہ ہے کہ اپنی کوششوں کے ساتھ ساتھ نہایت خلوص و رجاء سے اپنا معاملہ خدا کے حوالہ کر دے اور تقادیر مطلق سے امید و اعانت طلب کرتا رہے ۔ اور یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ خدا اپنے مومن بندہ کی مدد کرتا ہے ۔ ارشاد ہے :-

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ
إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِلَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (ہود / ۹۵)

وہ رسولؐ، جب میرے بندے میرا حال تم سے پوچھیں تو رکنہ و کم میں ان کے پاس

ہی ہوں اور جب مجھ سے کوئی دعا مانگتا ہے تو میں ہر دعا کو قبول کرے گا اسے کی دعا رسن

لیتا ہوں اور جو مناسب ہو تو قبول کرتا ہوں ۔ پس انھیں چاہئے کہ میرا بھی کب

نہیں ، اور مجھ پر ایمان لائیں ۔ تاکہ وہ سیدھا راہ پر آجائیں ۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ روح اسی صورت میں اوج کمال تک پہنچتی ہے اور ان

کو بحیر سعادت میں غرق کرتی ہے جب انسان اضطراب و دماندگی کے گڈھے میں گرے

بغیر اپنے کو ملل و اسباب سے منقطع کر کے خدا سے وابستہ ہو جائے ۔ تو یہاں پر اپنے کو

اپنے خدا کے ساتھ دیکھے گا اور خدا کے لطف و عنایت خاص و بے پایاں کو محسوس کرے گا ۔

اہم حقائق دعا کے بارے میں فرماتے ہیں : خدا یا ! مطالب کے راستے تیری طرف کھلے

پاتا ہوں اور تیری طرف امیدوں کے گھاٹ بھرتے دیکھتا ہوں ۔ تیرے فضل و کرم سے

استغاثت ان لوگوں کے لئے ، جو نہ مجھ سے لگتا ہے جس مبارک دیکھتا ہوں ۔ دعا کے دوران

صالحین و مظلومین کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ میں جانتا ہوں تو امید کریں والوں کی دعا کو قبول کرتا ہے اور مظلومین کی مدد کرتا ہے۔

روایت میں ہے : اپنے گناہوں کی وجہ سے مرنے والوں کی تعداد اپنی موت سے مرئیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح روایت میں یہ بھی ہے : احسان کی وجہ سے زندہ رہنے والوں کی تعداد اپنی عمر طبعی کے مطابق زندہ رہنے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہے : انسان کی موت گناہوں سے زیادہ ہے بہ نسبت طبعی موت کے اور انسان کی زندگی احسان کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت حیات طبعی کے (سفینۃ البحار ج ۱ ص ۴۸۹)

دعا اور اسکی برکت سے خدا نے جناب ذکر یا کو کبھی عطا کیا اور توبہ و انابت کی وجہ سے جناب یونس بن مثنیٰ اور ان کی قوم کو عذاب و ہلاکت سے نجات دی۔

خداوند عالم نے کائنات میں جن قوانین کا اجراء فرمایا ہے وہ قوانین خدا کی لامحدود توانائی کو محدود نہیں کر سکتے اور اسکی قدرت عمومی کو اس سے بچھین نہیں سکتے جس طرح خدا ایجاد و خلق پر قادر تھا۔ ان کے تغیر و تبدیل، محو و اثبات پر بھی قادر ہے اور اسکی استمرار پر بھی قادر ہے قوانین و مظاہر قدرت کے سامنے اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔

لیکن بعض ظواہر طبیعت کے ہر وقت تبدیل پر قادر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا نے نظام عالم میں جو مقررات معین کر دیے ہیں ان کو توڑنا ہی رہے۔ اور قوانین کو سنن و اصول میں الٹ پلٹ کرنا ہی رہے۔ بلکہ خود یہ تغیر و تبدیل بھی کچھ اصول و قوانین کے تابع ہے جس کو ہم کبھی محسوس ہی نہیں کر سکتے۔



